اردو ڈائجسٹ
ہما
نئی دہلی
ہما پبلیکیشنز
کی مطبوعات
میں سے
ایک
مدیر
عبدالوحید صدیقی
جلد ۵
شمارہ ۳۳
مارچ ۱۹۶۹
فون نمبر
۷۸۸۶۴
قیمت
سالانہ: ۲۲ روپے، اس میں سے ۷ روپے
۲۰ پیسے فیس رجسٹری اور سالانہ قیمت بھی شامل ہے
ہما اردو ڈائجسٹ جے ۱/۷، جنگپورہ، نئی دہلی

ہُما کے بالُ و پر

غالب نامہ

اداریہ	۲۳ ویں منزل	عبدالوحید صدیقی	۱۰
غالب اکیڈیمی	الحاج حکیم عبدالحمید سے ملاقات	عبدالوحید صدیقی	۱۳
نذر غالب	نظم	ابراہیم خلیل	۱۲
غالب کی تضمین	قدسیؒ کی نعتیہ غزل پر	غالب	۳۹
نظم	تیری آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں	نیاز حیدر	۲۲۹
پیغامات	نائب صدر جمہوریہ ہند وی۔ وی گری ۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی		۷
	سفیر سعودی عرب انس یوسف یاسین ۔ بلراج مدھوک ایم پی ۔ منسٹر ٹرانسپورٹ		۱۲۴
	وی کے آر وی راؤ ۔ سفیر متحدہ عرب جمہوریہ امین حلمی ثانی ۔ مولانا عبدالغنی ڈار		
	صحافتی برادری کی طرف سے غالب کو ہدیۂ عقیدت ، ایم ایل بھارد واج پرنسپل انفارمیشن سروس		۱۲۸
مقالات	ہمارا محبوب شاعر	شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ	۱۲۲
	پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے	مولانا عبدالغنی ڈار ایم پی	۱۲۳
	غالب اور رشک	نفیس احمد صدیقی (ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی)	۲۳۲
	غالب اور آم	سراج انور	۱۳۴
داستان غالب	تبھی سنو داستان غالب کی (غالب کی کہانی غالب کی زبانی)	فاروق ارگلی	۲۱
غالب گھر میں	غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک	حمید احمد خاں	۴۰
غالب دانشوروں کی نظر میں	ذہن غالب کا فانوس خیال	پروفیسر تنویر احمد علوی	۱۳۶
	ایک عظیم شاعر جسے دنیا شاعر سمجھتی ہے	محمد عبدالقادر	۱۴۴
	غالب ایک عظیم شاعر ـــــ ایک نابغہ ـــــ	پروفیسر سید ضمیر حسن دہلوی	۱۳۳
ترک مے نوشی	ترک مئے نوشی کا قطعہ تاریخ	سید وزیر حسن	۲۲
غالب بارگاہ رسالت میں	دلی کا ایک نعتیہ مشاعرہ	״	۳۷
مزاحیہ	انکل غالب کے نام ایک خط	فکر تونسوی	۵۱
تذکرہ اردو ادیبوں کا	غالب سے پہلے اور غالب کے بعد		۵۳
	اردو شاعروں اور ادیبوں کا فوٹو البم مع مختصر حالات زندگی امیر خسرو ۔ ولی دکنی ۔ میر تقی میر ۔ مرزا سودا ۔ میر درد ۔ میر حسن ۔ سید انشا دہلوی ۔ مصحفی امروہوی ۔ ناسخ لکھنوی ۔ آتش لکھنوی ۔	احمد مصطفیٰ صدیقی	

حصہ	عنوان	مصنف	صفحہ
عہد غالب کے شاعر	نظیر اکبرآبادی۔ میر انیس لکھنوی۔ ذوق دہلوی۔ مومن دہلوی۔ امیر مینائی۔ میر امن دہلوی۔ رجب علی بیگ سرور۔ سر سید دہلوی۔ داغ۔ ڈپٹی نذیر احمد۔ سجاد حسین۔ عنایت اللہ دہلوی۔ محمد حسین آزاد۔ حالی۔ فرحت اللہ بیگ۔ سید علی بلگرامی۔ شبلی نعمانی۔ سید احمد دہلوی۔ اکبر الہ آبادی۔ علامہ اقبال۔ سجاد حیدر یلدرم۔ حسرت موہانی۔ پریم چند۔ حسن نظامی۔ آغا حشر۔ رتن لال سرشار۔ امتیاز علی تاج۔ برج نرائن چکبست۔ شاد عظیم آبادی۔ فانی بدایونی۔ اصغر گونڈوی۔ جگر مراد آبادی۔ جوش ملیح آبادی۔ صفی لکھنوی۔ سیماب اکبرآبادی۔ سائل دہلوی۔ ابوالکلام آزاد۔ سید سلیمان ندوی۔ مولوی عبدالحق۔ دتاتریہ کیفی۔ تلوک چند محروم۔ فراق گورکھپوری	احمد مصطفیٰ صدیقی	۱۰۰
	دلی کی آخری شمع	فرحت اللہ بیگ	۵۷
انتخاب لاجواب	انتخاب دیوان غالب ـــــ مصور	عبدالرحمٰن چغتائی	۱۰۱
کارٹون	چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے	صدیقی آرٹسٹ	۲۳۰
لطائف غالب	غالب کے لطیفے	شاہد صدیقی	۱۳۹

حصہ ڈائجسٹ

حصہ	عنوان	مصنف	صفحہ
ملاقاتیں	متحدہ عرب جمہوریہ کے سفیر محمد امین حلمی ثانی سے ملاقات	خالد ہندی	۱۴۹
نسلی منافرت	سیاہ فام نومسلم امریکی کی کہانی	سلیم احمد ایم اے	۱۵۴
کچھ یادیں کچھ ملاقاتیں	ایران کے شہنشاہ اور شاہ بانو	محمود فاروقی	۱۶۶
محاربات	میں نے جنرل رومیل کو کس طرح شکست دی	فیلڈ مارشل منٹگمری	۱۷۸
شخصیات	اندھوں کی اندھی اور بہری دیوی	ایم این خاں	۱۸۴
جرم و سزا	عظیم انسانوں کے بدترین قاتل	ضیاء مجاہد	۱۹۴
نفسیات	نیند میں چلنے والے	شاکر پرشار تھی	۱۹۹
خلائیات	خلائی کولمبس	ناوک حمزہ پوری	۲۰۲
جنگ آزادی	کاروان آزادی منزل بہ منزل	پینڈرل مون	۲۰۷
سلسلہ ناول	شرط ـــــ چوتھی قسط	اے۔ جبار	۲۵۰

مترجم اعزازی:- سلیم احمد ایم اے ـــــ ترتیب:- احمد مصطفیٰ صدیقی ـــــ تزئین کار:- بہزاد راہی ـــــ ناظم اعلیٰ:- خالد صدیقی
ناظم طباعت:- طارق صدیقی ـــــ پرنٹر پبلشر:- طارق صدیقی ـــــ مطبوعہ:- انڈین فائن آرٹ پریس، گلی قاسم جان، دہلی
ـــــ مالکان:- ھُما پبلیکیشنز نئی دہلی ۱۴ ـــــ مقام اشاعت:- جے ۱۷ ، جنگپورہ ایکسٹنشن، نئی دہلی ۱۴ ـــــ

میں کہاں رُکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حدِ پرواز سے

۳۳ویں منزل

غالب کی صد سالہ برسی کے اس تاریخی اور یادگار موقع پر اپنی امتیازی روایات کے مطابق ہُما اس خاص نمبر کی صورت میں اپنے عظیم قومی شاعر اور اردو کے اس بے مثال مجدد کی جناب میں اردو کے کروڑوں شیدائیوں کی طرف سے نذرانہ عقیدت و خراج تحسین پیش کر رہا ہے۔

غالب پر گذشتہ ایک سو سال میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب اس پر نہ کسی مزید اضافہ کی گنجائش ہے اور نہ غالب کے کمال فن اور زندگی کے کسی گوشہ کا کوئی نادر پہلو پیش کر سکنا ممکن ہے اس لئے ہم یہ دعویٰ تو نہ کریں گے کہ اس خصوصی شمارہ میں غالب کے متعلق کوئی اچھوتا مواد پیش کیا جا رہا ہے، کیونکہ ایسا دعویٰ کوئی بزعم خود غلط ہی کر سکتا ہے. تاہم ع " کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور "

اور آپ اس " غالب نمبر " کے ہر صفحہ پر " انداز بیاں " کی اس جدت و انفرادیت کا مشاہدہ ضرور کریں گے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے سرورق پر غالب کی تصویر ملاحظہ فرمایئے۔ اس تصویر کے متعلق ہماری یہ گذارش یقیناً غلط نہ ہوگی کہ اسے پہلی مرتبہ شائع کرنے کا فخر ھما کو حاصل ہو رہا ہے۔ اور اس اعتبار سے آپ اسے منفرد کہہ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اس شمارہ میں آپ متعدد نایاب و نادر تصاویر اور خود غالب کے قلم سے لکھے ہوئے مخطوطات ملاحظہ کریں گے. جن میں سے شاید ہی کوئی اس سے پہلے کسی اردو رسالہ میں شائع ہوا ہو۔

غالب کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ اس عظیم فلسفی اور نکتہ رس شاعر کا دیوان اس کی زندگی سے لیکر اب تک نہ جانے کتنے پبلشروں اور اداروں نے شائع کیا یہ سلسلہ بدستور جاری ہے اور یقیناً آئندہ بھی جاری رہیگا لیکن زمانہ کی ترقی پسندی کا تقاضا ہے کہ غالب کے منتخب اشعار کو مصور شکل میں پیش کیا جائے۔ ادارہ ہما نے اس سلسلہ میں بھی پیشقدمی کی ہے۔ اور آئندہ غالب پر کام کرنے والوں کو ایک روشنی دکھائی ہے. ضرورت ہے کہ غالب کے منتخب اشعار کو انشائیوں میں اس سلیقہ سے استعمال کیا جائے کہ اردو نثر کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو. بلاشبہہ اردو کے بعض ادیب اس گوشہ کی طرف متوجہ ہوئے ہیں لیکن ابھی اس انداز کو عام بنانا باقی ہے، اس شمارہ میں آپ دیکھیں گے کہ ہُما کے ارباب قلم نے حسین پیرایہ میں اسے مقبول بنانے کی کوشش کی ہے۔

قدسی کی مشہور نعت پر غالب کی معرکۃ الآرا تضمین غالباً اس وجہ سے کہ یہ فارسی میں ہے اردو رسالہ میں ہماری نگاہ سے اب تک نہیں گذری ممکن ہے یہ ہماری کم نظری ہو۔ لیکن ہم بخیال خود اسے پہلی بار ایک اردو رسالہ میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ تاکہ قارئین غالبؔ کے مذہبی تصورات کا بھی اندازہ ہو سکے۔

ایک اہم خصوصیت :۔ غالب اور اردو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بن چکے ہیں۔ غالب کے ذکر کے ساتھ ہی اردو کے تصور کا ذہن میں ابھر آنا ایک ناگزیر حقیقت ہے۔ اسی اعتبار سے اس پیغامبر اردو کو خراج عقیدت پیش کرتے وقت اگر **غالبؔ سے پہلے** اور **غالبؔ کے بعد** کے اردو ادیبوں اور شاعروں کا ذکر بھی کر دیا جائے تو یقیناً یہ بے محل نہ ہوگا، بلکہ ایک اہم ضرورت کی تکمیل ہوگی چنانچہ اس خصوصی شمارہ میں اس دلچسپ اور نئے پہلو کی بطور خاص رعایت رکھی گئی ہے اور اردو کے پہلے شاعر امیر خسروؔ سے فراقؔ گورکھپوری تک بیشتر باکمال شاعروں اور نثاروں کا اجمالی تذکرہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اردو کے جن شعراء اور ادیبوں کی تصویریں مہیا ہو سکی ہیں وہ بھی ان کے ذکر کیساتھ شائع کی جا رہی ہیں۔ اس اعتبار سے آپ اسے اردو شاعروں اور ادیبوں کا باتصویر تذکرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ تذکار غالب کی محفل میں آپ اردو کے ان کامل فنکاروں کے ذکر کو یقیناً پسند کریں گے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ غالب نمبر کی تنگیٔ داماں کے سبب اس ذیل میں ہم کئی اہم شخصیتوں کا ذکر کرنے سے قاصر رہے ہیں لیکن ہمیں امید ہے کہ آئندہ کوئی صاحب ذوق اس کمی کو ضرور پورا کر دیگا۔ اس خاص شمارہ میں ہم نے مرزا فرحت اللہ بیگ کی "آخری شمع" کو بھی مناسب اختصار کیساتھ شامل کر لیا ہے تاکہ قارئین ہما غالبؔ کے دور کے شاعروں کی ترتیب و پرداز اور اساتذۂ سخن کی باہمی چشمک کے انداز سے لطف اندوز ہو سکیں۔ ان خصوصیات کے علاوہ غالب نمبر میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی سید ضمیر حسن دہلوی اور دوسرے ارباب قلم کی بہترین کاوشیں بھی آپ سے داد طلب ہوں گی۔

ایک بات اور :۔ غالب نمبر میں آپ کو ایک نئی بات یہ بھی ملیگی کہ ہندوستان کی ممتاز شخصیتوں جیسے وزیر اعظم اندرا گاندھی، نائب صدر جمہوریہ ڈی۔ ڈی۔ گری، شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ۔ وزیر ٹرانسپورٹ و جہازرانی وی۔ کے۔ آر۔ وی راؤ۔ پروفیسر مدھوک ایم۔ پی۔ (جن سنگھ) مولوی عبدالغنی ڈار ممبر پارلیمنٹ۔ وغیرہ کے علاوہ غیر ملکی سفراء ہز ایکسیلنسی امین حلمی ثانی سفیر متحدہ عرب جمہوریہ۔ ہز ایکسیلنسی انس یوسف یاسین، سفیر سعودی عربیہ۔ وغیرہ نے بھی ہمارے قومی شاعر کے بارے میں بطور خاص **ھُما** کو اپنے خیالات اور پیغامات سے نوازا ہے۔

ان سب منفردات کے علاوہ آپ غالب نمبر کو غالبؔ کی معروف و مشہور خصوصیات سے بھی عاری نہ پائینگے اور سچ تو یہ ہے کہ ع ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں ——— ہم چاہتے ہیں کہ ہما کا غالب نمبر اردو پسندوں کی جیب پر بار نہ بنے۔ اس لئے ہم نے ہما کے غالب نمبر اور اس کے مستقل موضوعات کو یکجائی شائع کر دینا مناسب خیال کیا۔ اس طرح قارئین کے تبدیلیٔ ذائقہ کا سامان بھی فراہم ہو گیا ہے۔

خادم ہُما ——— عبدالرحیم صدیقی

VICE PRESIDENT
INDIA

NEW DELHI
January 21, 1969.

Dear Shri Abdul Waheed Siddiqui,

Thank you for your letter of 19th inst.

I am glad to know that you are bringing out a Special Number on the eve of 100th Anniversary Celebrations of Mirza Ghalib. I send my best wishes for the success of the publication.

Yours sincerely,

(V.V.GIRI)

وی، وی، گری ـــــ نائب صدر جمہوریۂ ہند

۲۱ر جنوری سنہ ۱۹۶۹ء

ڈیر شری عبدالوحید صدیقی ـ آپکے مکتوب مورخہ ۱۹ر جنوری ۶۹ء کا شکریہ

" مجھے یہ جان کر خوشی ہے کہ آپ مرزا غالب کے صد سالہ سالگرہ کے جشن پر ہما کا خصوصی نمبر شائع کر رہے ہیں ـ میں اس اشاعت کی کامیابی کے لئے اپنی نیک خواہشات ارسال کرتا ہوں"

مسز اندرا گاندھی ـــــ وزیر اعظم ہند

۲۱ر جنوری سنہ ۶۹ء

شری عبدالوحید صدیقی ـ ایڈیٹر ہما اردو ڈائجسٹ

" مرزا غالب ہمارے ادب کی لافانی شخصیتوں میں سے ہیں ـ وہ ایک بڑے پُر آشوب دَور کی یادگار ہیں ـ ان کے کلام میں زندگی سے محبت اور زندگی کے بہت سے پہلوؤں کی عکاسی ملتی ہے ـ ان کے وجدان اور ذہنی کرب نے ایک ایسی شاعری کی تخلیق کی ہے جو وسیع ترین گنگا کے میدانوں میں رہنے والے لوگوں کی زندگی کا حصّہ بن گئی ہے ـ ان کے حسین اشعار بار بار دہرائے جاتے ہیں ایک شاعر کی عظمت کو اس سے بڑھ کر کیا خراج عقیدت ہو سکتا ہے کہ اس کے کلام نے ایک دَور کے کلچر کو ڈھالنے کا کام کیا ہے ـ

(انگریزی سے ترجمہ) دستخط (اندرا گاندھی)

انسان بھی ایک محشرِ خیال ہے کہ اس کے ذہن کی جولانی۔ اس کے تخیل کی پرواز۔ اس کے حوصلوں اور ارادوں کی بلندی و ندرت نے اس زمین پر کیسے کیسے چمن زاروں کو سجایا ہے۔ یہ محشرِ خیال اپنی اختراع و تدبیر سے ویرانوں کو گلستانوں میں بدل دیتا ہے۔ چٹانوں کے سینے چیر کر آبِ رواں کی خوبصورت نہریں نکال لاتا ہے۔ آسمان کی بلندیوں پر پہونچکر چاند ستاروں سے ہمکلام ہوتا ہے۔ اس گیتی پر ساری رونق۔ ساری بہار اور روز کے ہنگامے اسی محشرِ خیال کی وجہ سے تو ہیں۔

محشرِ خیال کی ان تمام جلوہ آرائیوں کی ایک جھلک میں نے الحاج حکیم عبدالحمید کی شخصیت میں بھی دیکھی ہے۔ یوں تو ہمدرد دواخانہ کی نسبت سے حکیم صاحب کا نام ساری دنیا جانتی ہے۔ جب عہدِ حاضر کے طب یونانی کی تاریخ مرتب کی جائے گی تو ان کا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ انہوں نے اس فن کو نیا موڑ دیا ہے۔ اس کے دامن کو وسیع کیا ہے۔ اس کے خاکے کو نئے نئے رنگوں سے سجایا ہے۔ اور ان کے فکر کی محشر سامانیوں نے اس کو ہندوستان کی سرزمین پر نئی زندگی اور توانائی بخشی ہے۔ ہمدرد دواخانہ ایشیا میں یونانی ادویات کا نہ صرف سب سے بڑا مرکز ہے بلکہ طبی تحقیق و مطالعہ کی ایک بہترین تجربہ گاہ بھی ہے۔ لیکن ہمدرد دواخانہ کے علاوہ حکیم صاحب نے تاریخ ادویات و طبی تحقیق کا ایک ادارہ (INSTITUTE OF MEDECINES & MEDICAL RESEARCH) بھی قائم کیا ہے۔ بدرپور میں جس کی شاندار عمارت نو ایکڑ زمین کے ایک پلاٹ پر بننے جا رہی ہے۔ آصف علی روڈ پر ہمدرد ریسرچ کلینک

اور نر سنگ موم کی خوشنما عمارت ان کے خیالات کی ندرت اور بلند ارادوں کی ایک حسین تصویر کے روپ میں کھڑی مسکرا رہی ہے۔ حکیم صاحب کو اسلامی تحقیق و مطالعہ سے بھی دلچسپی ہے۔ انکی سرپرستی میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کام کر رہا ہے جہاں سے انگریزی زبان میں ایک اسلامی جریدہ بھی شائع ہوتا ہے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حکیم صاحب کی سرپرستی میں کام کرنے والے ادارے کسی ذاتی جلب منفعت کے مقصد سے قائم نہیں کئے گئے ہیں۔ ان کے پیچھے انسانی فلاح و بہبود۔ خدمت خلق۔ غریبوں اور بیکسوں کی ہمدردی کا عظیم اور شریفانہ جذبہ کارفرما ہے۔ طبی اداروں کی آمدنی کا بیشتر حصہ خیراتی کاموں کے لئے وقف ہے۔ نہ جانے کتنے غریب طلبار۔ کتنی بیوائیں۔ کتنے یتیم خانے۔ طبیہ کالج تعلیمی ادارے اور نہ جانے کتنے دوسرے بیشمار افراد و ادارے حکیم صاحب کے فکر کی "ان گلکاریوں" سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔

حکیم عبدالحمید ۱۴ر ستمبر ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم عبدالمجید کا انتقال عین جوانی میں ہو گیا تھا۔ اس لیے نو عمری میں ہی ہمدرد دواخانہ کی پوری ذمہ داری ہونہار بیٹے کے کاندھوں پر آن پڑی۔ اس وقت سے انہوں نے اپنے وقت اور اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو دواخانہ کی ترقی کے لئے وقف کیا ہوا ہے۔ حکیم صاحب نے اپنی عمر کے ابتدائی چالیس سال طب قدیم و جدید کے مطالعہ میں صرف کئے ہیں۔ وہ اب تک تیس لاکھ مریضوں کا علاج کر چکے ہیں۔ ان کی طبی خدمات کے صلہ میں حکومت ہند نے انہیں ۱۹۶۵ء میں "پدم شری" کے خطاب سے نوازا تھا۔ وہ جامعہ طبیہ کالج کے صدر ہیں۔ اس ادارہ کے پورے مصارف ہمدرد دواخانہ اٹھاتا ہے۔ اسکے علاوہ حکیم صاحب آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے صدر بھی ہیں۔

حکیم صاحب۔ ایک حاذق طبیب، ایک اعلیٰ منتظم اور مدبر ہونیکے ساتھ ایک پر خلوص اور سچے انسان بھی ہیں۔ ان کے سینہ میں ایک درد مند دل ہے۔ وہ دل و دماغ کی بہترین صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ان کی زندگی ایک صوفی کی طرح سادہ اور بے لوث ہے۔ ہمدرد دواخانہ کی آمدنی و شہرت کی وجہ سے معاً ایک لکھ پتی یا کروڑ پتی حکیم عبدالحمید کی تصویر ذہن میں ابھرتی ہے، اور یہ خیال ہوتا ہے کہ دولت اپنی لازمی عشوہ طرازیوں اور کرشمہ سازیوں کے ساتھ ان کی زندگی میں جلوہ گر ہوگی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ انکی زندگی کو قریب سے دیکھنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ دولت کا کوئی نشہ، کوئی غرور ان کے یہاں نہیں ہے۔ بیشک وہ ان اداروں کے بانی ہیں جن کی آمدنی کا حساب کروڑوں نہیں تو لاکھوں تک ضرور پہونچتا ہوگا۔ مگر انکی ذاتی ملکیت اب صرف ایک مکان رہ گیا ہے جس کا کرایہ پچاس روپیہ ماہوار ہے۔ وہ ایک ایسے درویش صفت انسان ہیں جس نے اپنی ذاتی محنت و صلاحیت سے کمائی ہوئی دولت دوسروں کی خدمت اور بھلائی کے لئے وقف کر دی ہے۔

حکیم عبدالحمید صاحب کی زندگی کا ایک تازہ اور شاندار کارنامہ غالب اکیڈیمی کا قیام ہے جس طرح حکیم صاحب نے ہمدرد کی وجہ سے طب کے میدان میں شہرت و مقبولیت حاصل کی ہے۔ شاید اسی طرح شعر و ادب کی دنیا میں کبھی غالب اکیڈیمی ان کی شہرت و مقبولیت کا باعث بن جائے۔ غالب اکیڈیمی کا تصور اور منصوبہ حکیم صاحب کے ہی فکر کی تابانی کا نتیجہ ہے۔ اور اسی منصوبہ نے مجھے حکیم صاحب سے ملاقات کرنے پر اکسایا۔ حکیم صاحب شاعر ہیں نہ ادیب لیکن ان کا یہ کارنامہ کسی بھی عظیم شاعر یا ادیب کے شاہکار سے کم نہیں ہے۔ اس منصوبہ کا ایک حصہ بستی حضرت نظام الدین میں مزار غالب کے قریب تقریباً بنکر تیار ہو چکا ہے۔ سنگ سرخ کی یہ چھوٹی سی خوشنما سہ منزلہ عمارت ہے جس میں ایک لائبریری۔ ایک آڈیٹوریم اور ایک عجائب گھر ہوگا۔ ۲۱ر فروری ۶۹ء کو صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین اسی عمارت کا افتتاح کریں گے۔ بلاشبہ اس کے افتتاح کے ساتھ ہی غالب کی زندگی اور فن کے ایک نئے باب کا آغاز ہو جائے گا۔ غالب اکیڈیمی

مزار غالبؔ سے ملحق غالب اکیڈیمی کی عظیم الشان عمارت

کی اس خوبصورت عمارت کا ڈیزائن دلّی کے مشہور آرکیٹیکٹ فصیح الدین نے تیار کیا ہے۔

ایک شام کو میں نے حکیم صاحب سے ہمدرد منزل میں ملاقات کی۔ رعشہ کی معذوری کی وجہ سے گفتگو کے ضروری نوٹ لینے کے لئے میں اپنے ساتھ اپنے ایک رفیق کو بھی لے گیا تھا۔ حکیم صاحب کو معلوم تھا کہ "ھما" غالبؔ کے سوسالہ جشن پر غالب نمبر شائع کر رہا ہے اور میں ان سے انٹرویو لینے آیا ہوں۔ انہوں نے غالب نمبر کی تیاریوں کے سلسلہ میں چند سوالات کئے۔ انہوں نے فرمایا: "ہما تو بہت مقبول و معروف جریدہ ہے۔ بیشک آپ غالب نمبر نکال کر شعر و ادب کی بڑی خدمت انجام دیں گے۔" اس کے بعد انہوں نے غالب اکیڈمی کے سلسلہ میں اپنے انٹرویو کا آغاز کیا۔ اس سلسلہ میں میرے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے فرمایا: "عالمگیر پیمانہ پر مرزا غالب کا سوسالہ جشن منایا جا رہا ہے۔ قومی اور بین الاقوامی ادارے اس معاملہ میں بڑی دلچسپی اور جوش دکھا رہے ہیں۔ اس موقع پر یونیسکو انگریزی زبان میں غالب کی مکمل سوانح اور منتخب اشعار دو جلدوں میں شائع کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے قومی اور بین الاقوامی ادارے غالب پر مختلف زبانوں میں کتابیں اور مضامین وغیرہ لکھ کر اس قومی شاعر کو خراج تحسین پیش کر رہے ہیں۔ نئی دلی

ہیں غالب پر ایک سیمینار ہوگا جس میں مختلف ملکوں کے ادیب اسکالر شریک ہوں گے۔ غالب اکیڈمی اسی صد سالہ جشن کے پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ اس کا پروگرام اور اسکیم بھی وہی ہوگا جو صد سالہ جشن کا ہے۔ مجوزہ تحقیقی لائبریری عجائب گھر اور ہال 'غالب پر تحقیق' کا ایک عالمگیر مرکز ہوں گے۔ مقامی طور پر اکیڈمی کے یہ اجزا لوگوں میں علمی، تعلیمی اور سماجی بیداری پیدا کرنے کے لئے زمین ہموار کرنے کا کام انجام دیں گے۔"

حکیم صاحب نے اس منصوبہ پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔ غالب اکیڈمی کی اسکیم میں تحقیق و مطالعہ پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ فی الحال ڈیڑھ ہزار کتب غالب اور اس کے دور پر حاصل کر لی گئی ہیں۔ ان کتابوں کی تعداد دس ہزار تک جائے گی۔

میں نے خود اپنی ذاتی کتابوں، مضامین، مقالوں اور اخبارات کے تراشوں کا ذخیرہ اکیڈمی کو دیا ہے۔ غالب پر اخبارات کی پانچسو فائلوں کو ترتیب دیا جا رہا ہے۔ ریسرچ لائبریری میں اسکالرس کے لئے چار پر سکون مطالعہ کے کمرے تعمیر کئے گئے ہیں۔ اس لائبریری میں تمام دنیا سے اس موضوع پر مواد جمع کیا جائے گا۔ اسکا عجائب گھر ماضی کی یادوں کو زندہ کر دے گا۔ غالب پر تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے اور کچھ دلچسپ اور نئی دریافتیں بھی ہوئی ہیں میوزیم میں غالب کی دستیاب ذاتی اشیاء — قلمی نسخے، قلمی تصویریں، اصل خطوط وغیرہ کا ذخیرہ ہوگا اکیڈمی غالب کی صرف یادگار ہی نہیں ہوگی۔ وہ غالب کی زندگی اور اس کے کام پر تحقیق و مطالعہ کرنے والوں کی سرگرمیوں کا عظیم مرکز بھی ہوگی۔"

میں نے حکیم صاحب سے پوچھا: "آپ نے اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے وسائل کیسے فراہم کئے ہیں؟" اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا: "اتنا بڑا پروجیکٹ ہمدرد دواخانہ کے سہارے تو پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ اصولاً دواخانہ غیر طبی مدوں پر اپنی آمدنی کا ۱/۴ حصہ ہی خرچ کر سکتا ہے۔ یہ حصہ وظائف اور دوسرے خیراتی کاموں پر خرچ ہو رہا ہے۔ اکیڈمی کے لئے اس میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ نظام الدین میں زمین تو عرصے سے خریدی ہوئی تھی۔ اکیڈمی کو میں نے بیس ہزار روپیہ دیا ہے۔ ڈیڑھ لاکھ روپیہ قرض لیا گیا ہے، کچھ لائف ممبری کا چندہ آیا ہے۔ بس خدا کی مہربانی سے اسی طرح کام چل رہا ہے۔"

حکیم صاحب نے حکومت ہند کی امداد کے سلسلہ میں کہا۔ حکومت سے ابھی تک کوئی امداد نہیں ملی ہے۔ لیکن امید ہے آئندہ ضرور حکومت کچھ نہ کچھ دے گی۔ دراصل اکیڈمی ایک خود کفیل ادارہ ہوگی۔ اکیڈمی کے ملحقہ مجوزہ رہائشی مکانات، دکانوں اور گوداموں سے اس کو ڈھائی ہزار روپیہ ماہانہ کی آمدنی ہونے لگے گی۔ جس سے اس کے اسٹاف کی تنخواہوں وغیرہ کے مصارف پورے ہوں گے۔

اکیڈمی کے فوری پروگراموں پر روشنی ڈالتے ہوئے حکیم صاحب نے فرمایا: "اکیڈمی نے ابھی سے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ ۲۲ فروری کو جب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اس کا افتتاح کریں گے اسی دن غالب پر تین کتابوں کا اجرا عمل میں آئے گا۔ انگریزی میں غالب پر تمام تصنیفات کی ببلوگرافی جس کو دلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے اشتراک سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اردو میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی تصنیف "غالب اور آہنگ غالب" اور ہندی میں غالب کی منتخب غزلیں! اسکے علاوہ ایک مشہور و معروف مصور فیروز دہلوی کی بنائی ہوئی غالب کی تصویروں کا مجموعہ بھی اسی دن جاری کیا جائے گا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اکیڈمی کو دنیا کے مشہور و معروف ادیبوں اور قلم کاروں کا تعاون حاصل ہو گیا ہے۔ ان میں چند ممتاز شخصیتوں کے نام یہ ہیں۔ امریکہ کے نارمن براؤن۔ انگلینڈ کے سی ایچ فلپس، یونیسکو کے ڈاکٹر طٰہٰ حسین، امریکہ کے ایف آر الاشین پروفیسر ڈنلپ اور کے۔ ڈبلیو سی اسمتھ، انگلینڈ کے ڈاکٹر اسپیر، چیکوسلواکیہ کے ڈاکٹر جان مارک۔"

حکیم صاحب نہایت انکساری سے اپنے منصوبہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال رہے تھے مگر میں ان کی نگاہوں میں فخر و مسرت کی رقص کرتی ہوئی لہروں کو بھی محسوس کر رہا تھا۔ انکے چہرہ پر میں نے لازوال خوشی کی وہ جھلک دیکھی ہے جو صرف خدا کے نیکوکار بندوں کے حصہ میں ہی آتی ہے۔ وہ خوشی جس میں خود غرضی کی آلائش نہ تھی۔ ملکیت و ملوکیت کی ہوس نہ تھی۔ وہ خوشی جو روح کی پاکیزگی۔

غالب اکیڈمی کیلئے غالب کی تصویر، مشہور مصور فیروز دہلوی "آخری عمل" کرتے ہوئے
اس تاریخی تصویر کو سب سے پہلے ہما شائع کرنے کا فخر حاصل کر رہا ہے۔

مقصد کی عظمت اور جذبہ کی صداقت کا ہی صلہ ہو سکتی ہے۔ اسکے بعد حکیم صاحب اکیڈمی کی لاگت کے بارے میں فرمانے لگے۔ "غالب کی مرکزی صد سالہ جشن کمیٹی کا منصوبہ تو بہت وسیع ہے۔ اس کے پروگرام میں چالیس لاکھ روپیہ کی لاگت کی سکیم شامل ہے۔ اس کی تکمیل میں ابھی وقت لگے گا مگر غالب اکیڈمی کے منصوبہ کی لاگت چھ لاکھ روپیہ ہے۔ اکیڈمی کا سالانہ خرچ ۳۸ ہزار روپیہ ہوگا۔ اس خرچ کا بڑا حصہ یعنی تقریباً ۲۴ ہزار روپیہ اکیڈمی سے متعلقہ عمارتوں کے کرایہ سے وصول ہوگا۔ ——— باقیماندہ چودہ ہزار روپیہ کتابوں اور رسالوں کی اشاعت اور چندہ سے پورا ہوگا۔"

جب حکیم صاحب غالب اکیڈمی پر ہونے والے ان مصارف کی تفصیل مجھے بتا رہے تھے تو میرا ذہن آج سے سو سال پہلے کی تاریخ کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ میں اس غالب کے بارے میں سوچ رہا تھا، جس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ عسرت و تنگدستی میں گذارا تھا۔ میں سوچ رہا تھا جب غالب نے پیش گوئی کی تھی کہ میری قدر میرے مرنے کے بعد ہوگی۔ اور مجھے وہ غالب یاد آ رہا تھا جس نے اپنی کتاب مہر نیمروز میں بہادر شاہ ظفر کو خطاب کرتے ہوئے لکھا تھا۔ "شاہجہاں بادشاہ کے عہد میں کلیم شاعر سیم و زر میں تولا گیا تھا۔ مگر میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی ایک دفعہ کلیم کے کلام کیساتھ تول لیا جائے۔" غالب کے وہ جملے بھی میرے ذہن میں رقص کر رہے تھے جو اپنے ظریفانہ رنگ میں بھی اپنے اندر چھپے ہوئے درد و کرب کو ظاہر کر رہے تھے۔ وہ ایک خط کے جواب میں میر مہدی کو لکھتے ہیں "میاں بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آگیا ہے۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا۔ آگے خدا رزاق ہے کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔" آج اسی مفلس و نادار غالب کی یاد کو زندہ رکھنے کے لئے لاکھوں روپیہ خرچ کیا جا رہا تھا۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے زمانہ نے ہر بڑے فنکار کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے۔

میں نے حکیم صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ مسکراہٹ جو سادگی و خلوص کی مٹھاس میں لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ "حکیم صاحب! آپ کے اکیڈمی قائم کرنے کا محرک کیا تھا؟" میرا سوال سنکر ایک بار پھر ان کے ہونٹوں پر ننھی شیریں اور دلنواز مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ کچھ دیر سوچ کر بولے "۱۹۲۶ء میں غالب سوسائٹی کے نام سے ایک مجلس وجود میں آئی تھی جس کے کاغذات ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں تلف ہوگئے۔ اس سوسائٹی میں خواجہ حسن نظامی، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، میر محمد حسین شامل تھے۔ میں اس سوسائٹی کا خزانچی تھا۔ سو ڈیڑھ سو روپیہ چندہ بھی جمع ہوا تھا۔ اسوقت صرف غالب ہال بنانے کا ارادہ تھا۔ اسی وقت نظام الدین میں یہ زمین بھی خرید لی گئی تھی جس پر آج غالب اکیڈمی تعمیر ہو رہی ہے۔ اس وقت سے یہ زمین پڑی ہوئی تھی۔ ۱۹۵۰ء میں میرے دل میں پھر شوشہ اٹھا کچھ لوگو

نے توجہ دلائی۔ انگریزی کے روزنامہ اسٹیٹس مین کے ایک نامہ نگار نے غالب صدی کے نام سے مضمونوں کا سلسلہ شروع کیا میرا عزم پختہ ہوتا گیا۔ اب اس قومی شاعر کے سو سالہ جشن پر میں نے سوچا اس منصوبہ کو عملی شکل دینے کا یہی مناسب وقت ہے۔ اور میں نے کام شروع کر دیا۔"

اب میں مرزا غالب کی شاعری کے بارے میں چند سوالات حکیم صاحب سے کرنا چاہتا تھا۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کیا انہوں نے غالب کی شاعری) کا مطالعہ کیا ہے انھیں غالب کی زندگی اور فن کے کس پہلو نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ میرے ان سوالوں کے جواب میں حکیم صاحب نے کہا "میں نے غالب کا باقاعدہ مطالعہ تو نہیں کیا ہے۔ پچھلے کچھ دنوں سے زیادہ پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ غالب کا درجہ ان کی شاعری کی طرح نثر میں بھی کم نہیں ہے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ نثر میں زیادہ بلند پایہ ہیں یا نظم میں۔ فارسی کی نظم و نثر کے بارے میں تو انہوں نے خود ہی کہا ہے کہ ان کے اصل کمالات اسی فارسی زبان میں نمایاں ہوئے ہیں۔"

میں نے ان سے مزید پوچھا "غالب کا وہ شعر سنایئے جو آپ کو سب سے زیادہ پسند ہے"؟ وہ میرے اس سوال پر کافی دیر تک زیر لب مسکراتے رہے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر بولے:

"یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا"

یہ پوری غزل ہی مجھے بہت پسند ہے اور اس غزل میں یہ شعر سب سے زیادہ۔

میرا اگلا سوال تھا: "آپ کی رائے میں غالب اکیڈمی سے اردو زبان کو کیا فائدہ پہونچنے کی توقع ہے؟"

حکیم صاحب بولے "غالب اکیڈمی اردو میں تحقیق و مطالعہ کا مرکز ہو گی۔ یہ ایک مثال بنے گی اس کا جائے وقوع ایسے علاقہ میں ہے جہاں تعلیمیافتہ اور خوشحال لوگوں کی آبادی ہے قریب ہی کئی بڑے بڑے ہوٹل ہیں ہم غالب اکیڈمی کے ہال کو کرایہ پر دیں گے اس میں مختلف تقریبات ہوا کریں گی۔ اور اس طرح لوگوں کو ہم اس طرف متوجہ کر پائیں گے۔ اس سے اردو کے مسائل سے بھی لوگوں میں دلچسپی پیدا ہو گی۔ بلاشبہ اکیڈمی اردو زبان و ادب کی مقبولیت و شہرت کا باعث بنے گی۔

اس کے بعد مرزا غالب کی ہیئت اور وضع قطع کا ذکر چل پڑا۔ حکیم صاحب ان تصویروں کا ذکر کرنے لگے جو انہوں نے فیروز صاحب آرٹسٹ سے بنوائی ہیں اس سلسلہ میں حکیم صاحب نے فرمایا "اس مجموعہ میں ایک تصویر وہ ہے جو مرزا غالب نے شاہ ظفر کو پیش کی تھی ایک وہ بھی تصویر ہے جو ان کی موت سے چھ ماہ پہلے کیمرہ سے کھینچی گئی تھی اس وقت فوٹو گرافی ہندوستان میں آگئی تھی۔ اس میں غالب بیمار ہیں اور ان کو پکڑ کر کرسی پر بٹھایا جا رہا ہے۔ غالب ہر معاملہ میں امتیازی حیثیت رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا لباس بھی دوسروں سے منفرد اور انوکھا ہوتا تھا وہ ایک خاص قسم کی ٹوپی جسے "کلاہ پاپاخ" کہتے تھے پہنتے تھے۔ یہ ٹوپی ترکی اور روس کے کچھ حصوں میں آج بھی پہنی جاتی ہے۔"

(کلاہ پاپاخ کیلئے "ھما" کا ٹائیٹل دیکھئے۔)

کلاہ پاپاخ کا ذکر چھڑا تو مجھے مرزا غالب کی زندگی کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ مرزا غالب کی زندگی اور فن میں ظرافت و شوخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ مصیبت اور ابتلا میں بھی مسکرانا جانتے تھے شگفتگی زندہ دلی اور ظرافت کے جو سدا بہار پھول ان کی زندگی میں مسکراتے رہتے تھے وہ آج بھی افسردہ، مایوس اور دل شکستہ لوگوں کے لئے پیغام زندگی ہیں۔ حیات نو کا سبق ہیں۔ غدر کے ہنگامہ میں کچھ انگریز ان کے گھر میں گھس آئے۔ مرزا صاحب اور ان کے پڑوسیوں کو پکڑ کر کرنل براؤن کے پاس لے گئے۔ جب مرزا کرنل براؤن کے روبرو گئے تو اس وقت کلاہ پاپاخ ان کے سر پر تھی۔ کرنل براؤن نے مرزا کے لباس اور ٹوپی پر ایک نظر ڈالی اور بولا: "ول! تم مسلمان؟" مرزا نے فوراً جواب دیا "آدھا" اس جواب پر کرنل حیران ہو کر بولا: اس کا مطلب کیا ہے؟" مرزا نے کہا "شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا

غالب کا مجسمہ ا جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے معلم آرٹ جناب ایم این تیاگی نے اپنے ساتھیوں مس سطوت قدوائی اور دوسروں کی مدد سے تیار کیا ہے۔ یہ مجسمہ تیاری کے بعد بارہ فٹ اونچا ہے۔ ہما پہلی بار اس کی تصویر پیش کر رہا ہے۔

کرنل یہ سن کر ہنسنے لگا۔ اور مرزا کو نہایت اخلاق و عزت کے ساتھ رخصت کیا۔ اور اس کے بعد ہی مجھے خیال آیا غالب اکیڈیمی اس عظیم شاعر کی زندگی اور اس کے کمالات کی یادوں کو تازہ کر کے قوم و ملک کی کتنی بڑی خدمت انجام دے رہی ہے اور میری توجہ حکیم صاحب کی طرف مبذول ہو گئی جو میرے اگلے سوال کے منتظر تھے:

میں نے سوال کیا: "حکومت غالب کے صد سالہ جشن میں کافی دلچسپی لے رہی ہے لیکن غالب کی زبان اردو کے سلسلے میں جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے اس سے آپ بھی واقف ہیں کیا اس کے پیچھے سیاسی مصالح تو نہیں۔؟"

حکیم صاحب بولے: "حکومت کے سامنے تو ہمیشہ سیاسی مصالح ہی رہتے ہیں۔ حکومت کے پاس اردو کے لئے کوئی ٹھوس پروگرام نہیں۔ اس زبان کی بقا کے لئے تو اردو کے قدر دانوں کو ہی جدوجہد کرنی پڑے گی۔"

اس کے بعد میں نے حکیم صاحب سے ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں چند سوالات کئے میں نے پوچھا "کیا آپ نے اپنے لئے کوئی ذاتی مکان تعمیر کرایا ہے؟" اس پر انہوں نے بے ساختہ غالب کا یہ شعر پڑھا:

نہ لٹتا دن کو، تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

میں نے اگلا سوال کیا: "زندگی میں آپ کی ترقی کا راز کیا ہے۔؟"

حکیم صاحب نے اس سوال کا جواب نہایت انکساری سے دیا۔ بولے: "میں اس ترقی کو ترقی کے انداز میں سوچتا ہی نہیں میں تو یہ سمجھتا ہوں میں نے اب تک کچھ کیا ہی نہیں۔"

ایک ثانیہ خاموش رہ کر مزید فرمایا "کسی بھی ترقی کیلئے میں یکسوئی، محنت اور لگن کو ضروری خیال کرتا ہوں۔" اپنی زندگی کے روزانہ معمولات کے بارے میں حکیم صاحب نے فرمایا "میں صبح کے چار بجے بیدار ہو جاتا ہوں۔ چہل قدمی کے لئے چلا جاتا ہوں۔ آٹھ بجے تک مطالعہ میں وقت لگاتا ہوں۔ ناشتہ کے بعد ایک دو بجے دوپہر تک مریضوں کے دیکھنے میں صرف کرتا ہوں دو بجے سے چار بجے تک میں طبی اور دوسری کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں۔ میں دوپہر کا کھانا نہیں کھاتا۔ صرف ایک وقت ہی کھاتا ہوں۔ میں سگریٹ پان اور چائے کچھ بھی استعمال نہیں کرتا۔"

وقت کافی گذر چکا تھا میرے سوالات بھی پورے ہو گئے تھے۔ میں نے حکیم صاحب سے رخصت چاہی اور اس طرح یہ خوبصورت اور دلچسپ ملاقات ختم ہو گئی۔ ● ●

ابراہیم خلیل

نذرِ غالب

اے عظیم المرتبت شاعر! ترے دربار میں
پھول لایا ہوں عقیدت کے میں چند اشعار میں

آسمانِ شعر کا تو ہے درخشاں آفتاب
شاعری تیری، عروسِ شعر کا بندِ نقاب

شعر میں پنہاں ہیں تیرے فکر کی گہرائیاں
فکر سے تیری نمایاں، حسن کی پہنائیاں

شاعری میں منفرد سب سے تری آواز ہے
شعر کا سب سے جداگانہ ترے انداز ہے

زندگی کے معنیِ پنہاں کی اک تفسیر ہے
شعر تیرا زندگی کے راز کی تعبیر ہے

وسعتِ افکار کو ظرفِ غزل بھی تنگ ہے
تیری غزلوں کا کچھ ایسا بے نظیر آہنگ ہے

فکرِ اعلیٰ، حسنِ معنیٰ، شاعری کی جان ہے
شعر تیرا، انبساطِ روح کا سامان ہے

تیرے اک اک شعر میں ہے اک اچھوتا سا خیال
مل نہیں سکتی ترے افکارِ شعری کی مثال

نغمہائے شعر کا تیرے نہیں کوئی بدل
ہے بہت ہی خوبصورت، آج بھی تیری غزل

وجد آور آج بھی ہے تیرا اندازِ سخن
اب بھی ہے شعروں میں تیرے تابشِ دُرِّ عدن

شعر کے فن میں ہے تیری شاعری نقشِ دوام
فکرِ اعلیٰ نے تری بخشا تجھے اعلیٰ مقام

تیری ہستی سے ہے قائم، شاعری کا اعتبار
تیرا دیوانِ سخن ہے گلستانِ نغمہ زار

شعر سے تیرے بنی اردو زباں سرمایہ دار
شاعری تیری بنے پھر کیوں نہ وجہِ افتخار

شاعری تیری ہے اک تعبیرِ اسرارِ حیات
قیمتی ہے لعل و گوہر سے تری ایک ایک بات

بے بہا مفہوم میں ہیں، تیرے افکارِ عمیق
جن کے آگے بے حقیقت کیا زمرد کیا عقیق

حسنِ معنیٰ کا، غزل کو میں تری دفتر کہوں
شعر کو تیرے عروسِ فکر کا زیور کہوں

اک نمونہ فکرِ اعلیٰ کا ہے تیری شاعری
سوچتا ہوں میں کبھی، یہ شعر ہے یا ساحری

ہے ترے اشعار سے اردو زباں کا بانکپن
شاعری تیری نظر آتی ہے اب بھی اک دلہن

تجھ سے قائم ہے زبان و شعر کا عز و وقار
تو زبانِ شعر کی اقلیم کا ہے تاجدار

شعر سے تیرے نمایاں، نظم کا حسن و جمال
اور تیری نثر ہے آئینۂ سحرِ حلال

تا قیامت ختم ہو سکتی نہیں اردو زباں
شعر نے تیرے اسے بخشی حیاتِ جاوداں

شعر سے تیرے ملی اردو زباں کو زندگی
شعر سے تیرے نمایاں، فکر کی تابندگی

گفتۂ غالب، رہے گا بے نظیر و بے بدل
زندہ ہے دنیا میں جب تک نامِ اردوئے خلیل

لو تم بھی سنو داستانِ غالب کی

غالب کی کہانی غالب کی زبانی (فاروق ارگلی)

لو بھئی اب ہم سے بھی ہماری کہانی سنانے کی فرمائش ہونے لگی۔ میاں سنو! کلا ہے کہ ہمیں پریشان کرتے ہو بڑھاپے میں تنگ کرتے ہو۔ کیا کروگے ہماری کہانی سن کر، نہیں مانوگے، سن کے ہی رہوگے، اچھا سنو! پر یہ خیال رہے کہ میں نرا شاعر نہیں ہوں، سو پشت سے پیشۂ آبا سپہ گری رہا ہے چہار دانگ عالم میں میرے بزرگوں کی شمشیر کا شہرہ رہا ہے۔ میاں میرے آبا و اجداد کی پوچھتے ہو میرے پردادا کا نام تھا سردار ترسم خاں جو ایران سے چل کر سمرقند میں جا رہے تھے کیونکہ کیانی سردار کو سلجوقیوں کی ادا نہیں بھائی تھی میرے دادا مرزا قوقان بیگ سمرقند میں ہی پیدا ہوئے، شمشیر زنی اور جنگ جوئی میں یکتائے زمانہ تھے، غصہ ایسا پایا کہ ناک پر ہی دھرا رہتا تھا اپنے والد تک کو اللہ بخشے خاطر میں نہ لائے۔ شاہ عالم کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ زبان ترکی ورثے میں پائی تھی اس لئے دربار عام لاہور میں ملازمت پائی۔ بعدہ خلعت اور جاگیر عطا ہوئی اور دہلی آباد کی۔ میرے دادا قوقان بیگ کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں، میرے والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ تھا اور چھوٹے چچا جو والد کے بعد حیات رہے ان کا نام مرزا نصراللہ بیگ تھا۔ میرے والد محترم مرزا عبداللہ بیگ کی شادی خانہ آبادی اکبرآباد میں مرزا غلام حسین صاحب کی صاحبزادی عشرت النسا بیگم سے ہوئی تھی یہ میری والدہ کا نام ہے، میرے والد لکھنؤ کے نواب آصف الدولہ کی فوج میں سردار رہے بعد میں والیٔ حیدرآباد میر نظام علی خان کی افواج میں داد شجاعت دی آخر میں مہاراجہ الور کی طرف سے باغیوں کے ساتھ جنگ میں شہادت پائی ان کا مزار راج گڑھ میں ہے۔

اب سنو داستان غالب کی۔ انگریزی کے دسمبر کی ستائیسویں تاریخ ۱۷۹۷ء یعنی آٹھویں رجب المرجب ۱۲۱۲ھ کو اکبرآباد میں پیدا ہوا۔ ہنوز پانچ سال کا ہوا تھا کہ سایہ پدری سے محروم اور چچا کے دامن عاطفت میں آیا۔ چچا جان یعنی مرزا نصراللہ بیگ دولت اولاد سے محروم تھے سو بڑے ناز و نعم سے پرورش پانے لگا، لیکن وائے قسمت کہ تین سال بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ ایک لڑائی میں چچا بھی شہید ہوئے اب اسداللہ عرف میاں نوشہ کے نانا جان مرزا غلام حسین نے دست شفقت پھیلا اور یوں زندگی آگے بڑھی اکبرآباد میں ان دنوں ایک ایرانی سیاح وارد ہوئے یہ پہلے آتش پرست تھے بعد میں اسلام لے آئے تھے عربی اور فارسی کے جید عالم تھے میرے استاد مقرر ہوئے اللہ بخشے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کہ فارسی زبان میں بھی اس خاکسار ہیچمداں کی عظمت و توقیر زبان زد ہے میرے استاد محترم کا نام نامی پہلے ہرمزد تھا مگر اسلام لانے کے بعد وہ ملا عبدالصمد ایرانی ہو گئے تھے۔

تیرہ سال کی صغر سنی میں نواب الٰہی بخش کی دختر نیک اختر امراؤ بیگم سے شادی ہوئی بیگم کی عمر اس وقت گیارہ سال کی تھی شعر و شاعری کا بچپن سے ہی شوق تھا، پہلا شعر شاید دس سال کی عمر میں لکھا تھا۔ میرے بچپن میں ریختہ کے استاد مجھ جیسے استادوں کے استاد حضرت میر تقی میر حیات تھے۔ میری شعر گوئی کی نسبت انھوں نے فرمایا تھا ”اگر کوئی کامل استاد اسے مل گیا تو یہ لڑکا بڑا شاعر بنے گا ورنہ مہمل بکے گا“۔ ناخدائے سخن کے الفاظ تاحیات نہیں بھول سکا مگر استاد نہ کوئی ملنا تھا نہ ملا۔ مشکل پسندی فطرت میں تھی سو میرا کلام بھی اس کا مظہر ہوا، بیدل اور اسیر کی پیروی کرتا رہا۔ فارسی اور ریختہ میں طبع آزمائی کرتا رہا۔ بارے دلی پہونچا۔ اپنے خاندان والوں سے الگ بلی ماروں کی ایک حویلی میں بود و باش اختیار کی دلی ان دنوں کاملین فن اور شعرا سخن فہم حضرات کا مرکز تھی سو بہت جلد یہاں شہرت و توقیر پائی، مگر یہاں کے ادبی حلقے میں میری مشکل پسندی کسی کو پسند نہ آئی اور سہل و آسان کی فرمائش ہونے لگی لو بھئی ہم بھی ع دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے۔ کی تان اڑانے لگے۔

ہاں بھئی! کلکتہ بھی گیا تھا۔ ہائے، کلکتہ کا جو تو نے کیا ذکر مجھ سے ہم نشیں، اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے۔ قصہ یہ تھا کہ میرے چچا مرحوم کی خدمات کے عوض کچھ پنشن مجھے ملا کرتی تھی یہ پنشن

آگرہ میں غالب کا ننھیالی مکان جس میں وہ پیدا ہوئے ــــ جس کے بارے میں غالب خود کہتے ہیں "ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب سیٹھ لکھی چند نے مول لی ہے اس کے دروازے کی سنگین بارہ دری میں میری نشست تھی" ــــ اور اب جبکہ ہم غالب کی سو سالہ برسی منارہے ہیں تو ــــ اسی حویلی میں اندربھان گرلس ہائی اسکول ہے (ادارہ)

فیروزپور جھرکہ کی ریاست سے منظور ہوئی تھی بعد میں جب نواب شمس الدین احمد خاں کا تصرف ہوا تو پنشن موقوف ہو گئی احباب نے کوشش کی تو اس قدر قلیل کہ گذر اوقات بھی مشکل۔ ناچار کلکتے جا کر عذرداری کرنے کا خیال آیا کیونکہ گورنر جنرل صاحب کا دربار وہیں تھا رخت سفر باندھا اور عازم سفر ہوا، کانپور ہوتا ہوا لکھنؤ پہونچا۔ میاں لکھنؤ دیکھ کر جی خوش ہوا۔ اہل لکھنؤ زبان و کلام میں یکتائے روزگار تھے نواب نصیر الدین حیدر کا دور حکومت خوشحالی اور اطمینان سب کو میسر تھا۔ نائب سرکار نواب روشن الدولہ نے اس ہیچمداں کا شہرہ سنا مجلس میں آنے کی دعوت بھیجی۔ میاں ہم بھی تنگ مزاجی پر ادھار کھائے بیٹھے تھے جانے کیا جی میں آئی کہ

کہہ بیٹھے آؤں گا تو اس شرط پر کہ نائب سرکار روشن الدولہ میرے استقبال کو کھڑے ہوں دوئم میں نذر نہیں گذرانوں گا، میری باتیں نواب کو ناگوار لگیں اور میں جھنجھٹ سے چھوٹا، اب بعد کی بات سناؤں کچھ دن کے بعد جب میرا قصیدہ انھیں نواب روشن الدولہ کی کوشش سے دربار میں پڑھا گیا تو کہتے ہیں پانچ ہزار کا انعام حضور سرکار سے عطا ہوا، لیکن اس میں سے تین ہزار تو روشن الدولہ کے تصرف میں آئے اور باقی کسی میر منشی محمد حسن نے نکل لئے واللہ اعلم بالصواب۔

پٹنہ ہوتے ہوئے کلکتہ گیا فرنگیوں نے اس شہر کو رشک فردوس بریں بنا رکھا تھا سو مجھے بہت پسند آیا، انواع و اقسام کی کلیں دخانی

غالب کی یہ قلمی تصویر جو آپ دیکھ رہے ہیں دہلی سے شائع ہونے والے ایک ادبی پندرہ روزہ رسالہ آجکل کے ۱۵ فروری کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ آخری دنوں کی یہ یادگار ۱۹۴۸ء تک عارف جان کی بہو معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم کے پاس محفوظ تھی۔

کس روسیاہ کو، گاہے گاہے مجلس رنداں میں چلا جاتا تھا۔ میاں ایک بار تو پھنس ہی گئے، چوسر کی پھڑ جمی تھی، ناگاہ سرکاری پیادے آدھمکے اور ہم رنگے ہاتھوں دھر لئے گئے کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا میری قید کا فیصلہ صادر کر دیا چھ ماہ کی سزا ہوئی، صدر میں اپیل کیا کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا آدھی مدت قید میں گذری بارے حکام کو رحم آیا اور گلو خلاصی ہوئی میاں کیا برادری تھا وہ بھی اپنے بیگانے ہوئے تھے صرف نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اعانت کی اللہ انہیں اس غالب نوازی کا اجر دے گا۔

اللہ اجر دے گا میاں کالے خان کو جن کا احاطہ بلیماروں سے قریب ہی تھا، مجھے بکمال محبت قلعے میں لے گئے نظل سبحانی

شبیہ حضرت غالب دہلوی

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے
(غالبؔ)

کی مگر استاد کے دل میں میری طرف سے میل آگیا آج تک اس گھڑی کو کوستا ہوں۔ کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے۔

خدا بخشے مومنؔ کو ظالم غضب کا شاعر تھا میں ایک بار اس سے کہہ بیٹھا تھا۔ مومنؔ اپنا صرف ایک شعر دیدو اور میرا دیوان لے لو۔ ۱۸۵۲ء میں مومن خان راہیِ ملکِ عدم ہوئے اور ۱۸۵۴ء میں استاد ذوقؔ چل بسے، زندگی بھر عداوت رہی ایک دوسرے کی ذات میں کیڑے ڈالے مگر اب ایسا لگتا جیسے اس بھری پُری دنیا میں تنہا رہ گیا۔ اب کون تھا جس سے مقابلے کی چوٹ رہتی۔ ظلِ سبحانی اپنا کلام نظرثانی کے لئے عطا فرماتے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ میں حضور کا استاد ہوں، لیکن یہ تو دل ہی جانتا ہے کہ استاد کون تھا—؟

اور— میاں اب اس داستان کا آخری حصہ بھی سن لو۔ ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا دل تو جانتا تھا کہ یہ آزادی کی جنگ ہے۔ جس کا فرنگیوں نے غدر نام رکھا ہے دلی پر ایک قیامت آئی، آن کی آن میں شہر اجڑ گیا۔ قلعہ لٹ گیا دلی انگریزوں کے تصرف میں آئی تو کیا راجہ کیا پرجا سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ظلِ سبحانی کے جگر گوشوں کا خون بہا اور انھیں قید فرنگ—، فرنگیوں نے مجھے بھی قابل عتاب ٹھہرایا۔ بہتیرا یقین دلایا کہ اسد اللہ پنشن دار عرصہ سے حکیم پٹیالے والے کی حویلی میں رہتا ہے نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نہ نکالا گیا بڑی مشکل سے خود کو ان ظالموں سے چھڑایا

ہائے دلی جو ایک گلشن تھا اس طرح خزاں رسیدہ ہوا کہ مسجد جامع سے راج گھاٹ تک بلا مبالغہ ایک صحرائے لق و دق تھا اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے تھے اگر وہ نہ ہوتے تو ہو کا عالم تھا مرزا گوہر کے باغیچے کے دوسری طرف جو نشیب تھا وہ باغیچہ کے برابر ہوگیا یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہوگیا، پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رامجی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل بی بی کی حویلی صاحب رام کا باغ اور حویلی کسی کا پتہ نہیں چلتا تھا قصہ مختصر کہ شہر صحرا ہوگیا، کوئیں جاتے رہے تھے اور پانی گوہر نایاب ہوگیا۔ اللہ دلی والے آج تک یہاں کی زبان کو اچھا سمجھتے تھے، واہ رے حسنِ اعتقاد اردو بازار نہ رہا اردو کہاں، دلی کہاں...؟

غدر کیا آیا میری زندگی میں بھی انقلاب عظیم آیا پنشن بند ہوئی، قلعہ معلی کی عنایات موقوف ہوئیں اور اس پر بڑھاپا سب طرف سے مصیبتوں نے ہلا بول دیا نواب یوسف علی خاں والی رام پور میرے آشنائے قدیم تھے وہ میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم تخلص کرتے تھے گاہے گاہے وہاں سے کچھ روپیہ آجاتا تھا ناظم میاں چاہتے تھے کہ میں دہلی چھوڑ رامپور جا بسوں، دو سو روپیہ ماہوار وظیفہ بھی مقرر کیا، میں وہاں چلا گیا، دل نہیں لگا واپس آیا اور تا حیات دلی میں رہا۔ اور بعد مردن بھی دلی میں نظام الدین اولیاؒ کے قدموں میں قیام پذیر ہوں۔ زندگانی میں اس امر کا شاکی ضرور

نظام الدین دہلی میں مرزا غالب مرحوم کا مزار

رہا کہ میرے قدرداں نہیں، مگر اب اس ایک صدی کے عرصے میں دیکھتا ہوں کہ جدھر دیکھئے میرے ہی چرچے ہیں میری شاعری کی دھوم ہے، میاں وہ وہ بال کی کھال نکالی ہے لوگوں نے کہ میں نے خواب میں بھی نہ سوچی تھی میرے کلام میں معانی کے گنج گرانمایہ کی کانیں ڈھونڈھ نکالی ہیں ان بچوں نے جو میرے سامنے پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اللہ خوش رکھے عالم بالا میں رہتا ہوں اور اپنی قدر و منزلت پر مسرور ہوتا ہوں، ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے۔

●●

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی، تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا

تنگیٔ دل کا گلا کیا یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا، تو پریشاں ہوتا

بعد یک عمر ورع، بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

وہ فراق اور وہ وصال کہاں

وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں (غالب)

جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے (نقش عبدالرحمٰن چغتائی)

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اک گُونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

غالبؔ نے ترک شراب کی کئی دفعہ کوشش کی مگر یہ توبہ ٹوٹتی رہی، کبھی 'روزِ ابر' میں کبھی 'شبِ ماہتاب' میں، کبھی 'ہوسِ طبیعی' کے ہاتھوں، کبھی ہیجان قوت غضبی کی تسکین کی خاطر، کبھی 'اک گونہ بیخودی' کی غرض سے، کبھی دوریٔ احباب کا غم غلط کرنے کے لئے، کبھی 'غمِ گیتی' کو گوارا بنانے کے لئے۔ چنانچہ اس فسخ عزائم کو اس کے حساس ضمیر نے خود بیان کیا ہے۔

یک روز بہ ترک بادہ گوئی غالبؔ ؛ رخ روزِ دگر بہ بادہ شوئی غالبؔ
زین توبہ بے بعقاچہ جوئی غالبؔ ؛ توبہ تب توبہ است گوئی غالبؔ

(یہ رباعی غالبؔ کے کلیات فارسی قلمی ۱۸۶۱ء سے نقل کی گئی ہے جو کتاب خانہ ریاست عالیہ رامپور میں محفوظ ہے۔ اس کے لئے میں ناظم کتاب خانہ مولانا عرشی صاحب کا ممنون ہوں۔ موصوف نے یہ بھی بتایا کہ یہ رُباعی غالبؔ کے اپنے قلم کی لکھی ہوئی ہے)

مگر سہ شنبہ، ۱۷ نومبر ۱۸۶۸ء کی توبہ جس کو اس نے خود اتنی اہمیت دی کہ ایک ہفتے کے کامیاب پرہیز پر اس توبہ کی تاریخ کہی یقیناً تا دمِ مرگ قائم رہی ہوگی۔ یہ اس کی آخری علالت کا زمانہ تھا اور "اکثر یہ شعر وردِ زبان رہتا تھا"۔

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے ؛ عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

حکیم محمود خاں مرحوم اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم — یہ دونوں بزرگ جن کی شخصیتیں طبابت اور ثقاہت کے کمالات کی جامع تھیں اس توبہ کے محرک تھے اور اعزا ان کی سخت نگرانی جس کی طرف قطعۂ تاریخ میں اشارہ ہے۔ اس توبہ کی محافظ تھی۔ غالبؔ کی رندانہ شوخی اس 'انابت نامے' میں بھی قائم ہے جس نے پرہیز کو بے بسی اور بے زری کا عطیہ ظاہر کیا ہے اور توبہ کو امتناع کا رنگ دیا ہے۔ بہرحال اس توبہ یا امتناع کے امتحانی دور کو بھی

کچھ کم تین مہینے گزرے تھے کہ غمِ گیتی جاں گسل ثابت ہوا۔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو یہ آزاد مرد، قیدِ حیات و بندِ غم سے رہا ہو گیا۔ خواجہ حالی مرحوم کا بیان ہے "مرنے سے چند روز پہلے بیہوشی طاری ہو گئی تھی۔ پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لئے افاقہ ہو جاتا تھا، پھر بیہوش ہو جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ حالت مسلسل ہونے تین مہینے کے ترکِ شراب سے ہو گئی ہو گی۔ اب غالب کے سوانح نگار کا یہ مسئلہ شاید حل ہو سکے۔ کہ "غالب اگرچہ ہمہ تن مجموعۂ امراض بن چکے تھے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ موت کا فوری سبب کونسا مرض بنا۔"

اب ہم وہ قطعۂ تاریخ درج کرتے ہیں جو غالب نے سہ شنبہ یکم شعبان ۱۲۸۵ھ (مطابق ۷ ار نومبر ۱۸۶۸ء) سے شراب ترک کرنے کی تقریب میں شبِ ہفتم شعبان ۱۲۸۵ھ (مطابق شب بست و سوم نومبر ۱۸۶۸ء) کو نظم کیا تھا۔ یہ منظومہ نہ صرف اس لئے اہم ہے کہ غالب کی زندگی کے ایک انقلابی نقطے کا پتہ دیتا ہے بلکہ اس لئے بھی اہم ہے کہ نظم میں اس شاعرِ اعظم کی یہ آخری نگارش ہے۔ اس کے بعد کی کوئی نگارش ہمارے علم میں نہیں۔ اس قطعے کا ماخذ "سبدِ باغِ دو در" ہے جو غالب کی فارسی نظم و نثر کے نایاب ذخیرے پر مشتمل ہے۔ میرے پاس اس مجموعے کا اصل نسخہ ہے جس کی کتابت طباعت کی غرض سے مصنف کی زندگی میں ۱۲۸۳ھ (مطابق ۱۸۶۶ء) میں شروع ہوئی تھی اور مصنف کی وفات کے ایک سال چار مہینے بائیس دن بعد، ۷ ربیع الآخر ۱۲۸۷ھ (مطابق ۷ جولائی ۱۸۷۰ء) کو ختم ہوئی۔ مگر اس مجموعے کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ سبد باغِ دو در غالب کا رکھا ہوا تاریخی نام ہے جس سے آغاز کتابت کا سال ۱۲۸۳ھ حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ خاتمے کی عبارت میں درج ہے۔ کاتب نے یہ نسخہ غالب کے شاگرد منشی ہیرا سنگھ کھتری کی فرمائش پر لکھا تھا۔ یہ منشی ہیرا سنگھ حوض قاضی کے قریب گندی گلی میں رہتے تھے۔ اس نسخے میں بعض اشارات سے قیاس ہوتا ہے کہ اس کا بیشتر حصہ غالب کی نظر سے گزرا تھا۔ ●●

قطعہ

ہر شب بقدح ریختمے بادۂ گلفام
آرے ز دو سی سال مرا قاعدہ این بود
شش روز شد اینک کہ بمے دسترسم نیست
شد غمزدہ تر دل کہ ازین پیش حزین بود
امشب چہ سرایم کہ شبِ اولِ گور است
شش روز بہ بیتابی و تلواسہ چنین بود
ناگاہ دراں وقت کہ در قطعِ رہِ عمر
از من رو قدم تا بدمِ باز پسین بود
یکرہ دو تن از شربِ میم منع نوشتند
واں منع نہ از بغض بل از غیرتِ دین بود
ہر چند بداں منع من از مے نگزشتم
امادمِ گیرائی عزیزاں بکمین بود
دانی کہ چہ شد چوں زدِ سوداگر صہبا
کش داد و ستد با من دیرانہ نشین بود
بگزشت ز اندازۂ بالست، بمن گفت
دیگر ندہم بادہ کہ معمول نہ این بود
با کاسۂ خالی چہ کند کیسۂ خالی
تا خواستہ در خواستہ دل صبر گزین بود
گر زر بدے از جائے دگر مے طلبیدم
کہ نقد در آن دست کہ نشستش بزمین بود
در غرۂ شعبان چو زمین بادہ گرفتند
خود غالبِ پژمردہ نشانے ز سنین بود
رو شمس بدر آر از مہِ شعبان کہ دریجا
۱۲۹۱ھ
۶
مقصودِ من از تخرجہ البتہ ہمین بود
۱۲۹۱-۶ھ
۱۲۸۵ھ

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان آگہی (عمل چغتائی)

سعدی کے نعتیہ قطعہ کی طرح شاہجہانی دربار کے ملک الشعرا قدسی کی نعتیہ غزل کو جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اس کا کچھ اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس غزل کی اب تک سیکڑوں تضمینیں ہو چکی ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں ان تضمینوں کے ضمن میں ایک مجموعے کا ذکر کرنا ہے جسے قاضی محمد عمر ساکن دہلی نے ۱۲۵۶ھ کے اواخر میں حدیث قدسی کے نام سے مرتب کیا تھا۔ مگر اس کی طباعت ایک مدت بعد ہوئی۔ یہ مجموعہ دلی کے ایک نعتیہ مشاعرے کا گلدستہ ہے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے کا غالباً آخری نعتیہ مشاعرہ تھا۔

اس مجموعہ کی اہمیت اس سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ غالب کی بھی تضمین اس میں شامل ہے جو ان کے مطبوعہ کلام میں موجود نہیں نہ ان کے کلیات نظم کے معلومہ قلمی نسخوں میں ہے البتہ 'سبد باغ دو در' اور 'بیاض فرحت' میں موجود ہے۔ اس طرح اس تضمین کے استناد کے بارے میں یہ دونوں قلمی نسخے 'حدیث قدسی' کی تصدیق کرتے ہیں اور 'حدیث قدسی' سے ان دونوں قلمی نسخوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ ان تینوں ماخذوں میں تضمین کا متن درست

دو تین جگہ مختلف ہے مگر یہ اختلاف سہو کاتب تک محدود ہے۔

حدیث قدسی کے تضمین نگاروں میں بہادر شاہ ظفر، غالب، مومن، مجروح، صہبائی، غلام امام شہید اکبر آبادی، اور حکیم آغا جان عیش کے علاوہ مرزا محمد سلطان فتح الملک رمز (ولیعہد بہادر شاہ ظفر) صاحب عالم مرزا رحیم الدین حیا، صاحب عالم مرزا فخر الدین حشمت ابن مرزا اعظم بخت بہادر، مرزا محمد ظہیر الدین مغل، مرزا قادر بخش صابر، مرزا قادر شکوہ شکوہ، نواب مرزا والا جاہ بہادر لکھنوی المتخلص بہ عاشق، مرزا عالیجاہ بہادر لکھنوی المتخلص بہ شیدا۔ محمد عبداللہ علوی، احمد حسن وحشت، سید امیر مرزا خورشید، مرزا رحیم بیگ رحیم میرٹھی (مولف ساطع برہان) حزیں شاگرد عارف، مولا بخش قلق میرٹھی، منشی عزت سنگھ عیش، سندر لال شگفتہ لکھنوی اور بدر الدین مہر کن نقشی تخلص قابل ذکر ہیں۔ یہ وہی بدر الدین ہیں جن سے غالب مہریں بنوایا کرتے تھے، مہر کنی کی مناسبت سے یہ نقشی تخلص کرتے تھے اور اپنی مہر کنی کا التزام انہیں اس درجہ ملحوظ تھا کہ انہوں نے اپنی تضمین اس مصرعے سے شروع کی ہے۔

اے نگینِ ختم اللہ تو ہے خستم نبی

"حدیث قدسی" کے مرتب قاضی محمد عمر نے ایک غزل میں جو اس مجموعے کے آخری صفحات میں درج ہے تضمین نگاروں کے تخلص نظم کئے ہیں۔ شروع کے چار شعر یہ ہیں۔

آج پھر بزم سعادت کی ہے ترتیب نئی
جمع ہوتے ہیں سبھی مدح سرایانِ نبیؐ

گوہر مملکت و سایۂ حق مہر عطا
شاہِ ذیجاہ ظفر مظہر نور قدسی

خازنِ جوہرِ عرفانِ خدا حضرت رمز
جس کی پیشانی سے ظاہر تھے فیوضِ ابدی

مجموعے کی طباعت سے بہت پہلے ان کی وفات ہو چکی تھی

منبع فضل و کرم معدنِ فیاضِ ازل
ساقی میکدۂ علم و ہنر صہبائی

پانچویں شعر میں غالب کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

شیر میدان سخن غالب یکتائے زمن
فخر خوش فہمی و خوش گوئی و شیریں سخنی

مومن کا ذکر دسویں شعر میں یوں آتا ہے۔

مومن و مضطر و مدہوش و حیات و جید
بسمل و طالب و آشفتہ و اسحق و غنی

ظفر، مومن، مجروح، شہید اور صہبائی کی تضمین انکے اپنے اپنے مجموعوں میں موجود ہے اس لئے ہم صرف غالب کی تضمین پیش کر رہے ہیں۔

تضمین غالب کے ادبی آثار میں ایک نادر چیز ہے۔ ان کے بعض ممتاز معاصرین نے ان کے کلام پر تضمین کی مگر ان کی فنی غیرت نے کبھی گوارا نہیں کیا کہ وہ بھی کسی کے کلام پر تضمین کریں۔ معاصرین تو کجا انہوں نے متقدمین کے کلام پر بھی تضمین نہیں کی۔ بات یہ ہے کہ تضمین نگار ایک ادبی طفیلیہ ہوتا ہے اور ادبی طفیلیہ ہونا ان کی اجتہادی شان کے خلاف تھا اور تو اور ان کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف نے ان کی دو غزلوں کی تضمین کی مگر انہوں نے اخلاقاً بھی کبھی ایسا نہیں کیا کہ ان کی ایک آدھ غزل پر تضمین کر دیں۔ اور صرف فنی خودداری ہی کا سوال نہیں، حقیقت یہ ہے کہ تضمین اور تخلیق میں بیر ہے۔ تضمین مستقل نظم کی حیثیت سے غالب کے فن سخن میں گویا صنفِ ممنوعہ ہے۔ انھوں نے صرف نعت گوئی کے لئے اپنا یہ اصول توڑا ہے۔ قدسی کے کلام پر تضمین کرنا غالب کے لئے ایک تنگ میدان میں شہسواری کا کمال دکھانے کے مترادف تھا۔ مگر اس باکمال شاعر نے تضمین لکھی ہے تو اسے بھی ایک ادبی تخلیق کی عظمت بخش دی ہے اور تضمین کی بندشوں کے باوجود اپنے فنی معیار کو قائم رکھا ہے۔ ◄►

غالبؔ کی نعتیہ غزل پر تضمین

کیستم تا بخروش آورَدَم بے ادبی — قدسیاں بیشِ تو در موقفِ حاجت طلبی
رفتہ از خویش بدیں زمزمۂ زیرلبی — مرحبا سیّدِ مکی مدنی العربی
دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

اے کہ روئے تو دہد روشنیٔ ایمانم — کافرم کافر اگر مہرِ منیرش خوانم
صورتِ خویش کشیداست مصورِ دانم — من بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی

اے گلِ تازہ کہ زیبِ چمنی آدم را — باعثِ رابطۂ جان و تنی آدم را
کردہ دریوزۂ فیضِ تو غنی آدم را — نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را
برتر از عالم و آدم تو چہ عالی نسبی

اے لبت رابسوئے خلق زخالق پیغام — روح را لطفِ کلامِ تو کند شیریں کام
ابر فیضی کہ بود از اثرِ رحمتِ عام — نخلِ بستانِ مدینہ تو سرسبز مدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بشیریں رطبی

خواست چوں ایزدِ دانا کہ بساطے از نور — گسترد در ہمہ آفاق چہ نزدیک چہ دور
حکمِ اِصدار تو در ارض وسما یافت صدور — ذاتِ پاکِ تو دریں ملکِ عرب کرد ظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بزبانِ عربی

وصفِ رخشِ تو اگر در دلِ ادراک گزشت — نہ ہمیں است کہ از دائرۂ خاک گزشت
ہمچو آں شعلہ کہ گرم از خس وخاشاک گزشت — شبِ معراج عروجِ تو از افلاک گزشت
بمقامے کہ رسیدی نہ رسد، ہیچ نبی

چہ کنم چارہ کہ پیوندِ خجالت گسلم — من کہ جز چشمۂ حیواں نبود آبِ درگلم
من کہ چوں مہرِ درخشاں بدمد نورِ دلم — نسبتِ خود بسگت کردم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بسگِ کوئے تو شد بے ادبی

دل زغم مردہ وغم بردہ زما صبر وثبات — ساری کن و بنمائی بما راہِ نجات
داد سوزِ جگرِ ما کہ دہد نیل وفرات؟ — ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آبِ حیات
رحم فرما کہ زحد می گزرد تشنہ لبی

غالبِ غمزدہ رانیست دریں غمزدگی — جز بامیدِ ولائے تو تمنائے ہی
از تب وتابِ دلِ سوختہ غافل نشوی — سیّدی انتَ حبیبی وطبیبُ قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پے درماں طلبی

غالب
کی
خانگی زندگی
کی
ایک جھلک
حمید احمد خان

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا (غالبؔ)

رہ گزر پر عقیدت کی آنکھوں کا فرش بچھانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ پرانے شرفا کی اولاد یہاں آباد ہے یا بجائے خود اس گلی کی پرانی داستان سے ہمیں غیر معمولی دلچسپی ہے۔ ایک اور کشش ایسی ہے جو لوگوں کو دور دور سے کھینچ کر یہاں لاتی رہیگی۔ اس کشش کو چار حرفوں کا ایک لفظ بیان کر دیتا ہے، اور وہ لفظ ہے: "غالبؔ"

گلی قاسم جان کے چپے چپے کے ساتھ غالبؔ کی زندگی کو کسی نہ کسی پہلو سے، کسی نہ کسی منزل میں تعلق رہا ہے۔ غالبؔ کا اصل وطن آگرہ تھا۔ لیکن ابتدائے شباب ہی میں وہ آگرے کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے دلی میں آ رہے تھے۔ اس تبدیلیٔ وطن کے بعد وہ پچاس پچپن برس تک دلّی میں رہے لیکن ذاتی مکان کبھی نصیب نہ ہوا۔ ہمیشہ کرائے کے مکانوں میں اور کبھی کبھی کسی مفت ملے ہوئے مکان میں رہے۔ اس تمام مدت کا بیشتر حصّہ انہوں نے گلی قاسم جان ہی کے کسی نہ کسی مکان میں گزارا اور اگر کبھی تھوڑے عرصے کے لئے باہر نکلنا بھی پڑا تو اسی کے گرد چکر کھاتے رہے لیکن غالبؔ کی ذات سے قطع نظر، اس تعلق کا سلسلہ خود غالبؔ کے خاندان تک پہنچتا ہے۔ اسی گلی میں، شاید غالبؔ کی پیدائش سے بھی پہلے، غالبؔ کے چچا کا عقد عارف جان کی بیٹی سے ہوا تھا۔ دس پندرہ برس بعد جب غالبؔ خود بالک، دولھا بنے ہوئے عارف جان کی پوتی امراؤ بیگم کو بیاہنے آئے تو اپنی برات یہیں قاسم جان کی گلی میں لائے تھے اور پھر تقریباً ساٹھ سال بعد جب بوڑھے شاعر کا جنازہ اٹھا تو اسی گلی کی ایک ڈیوڑھی سے دوست اور شاگرد، عزیز میت کو کندھا دیتے ہوئے، جامع مسجد اور دلّی دروازے کی راہ سے، درگاہ حضرت نظام الدین کو روانہ ہوئے۔ اس دن اسی گلی کے ایک مکان میں ستر برس کی ایک بڑھیا ماتم میں جھکے ہوئے سر پر ایک سفید دوپٹہ اوڑھے اپنی اس بیوگی کے غم میں آنسو بہا رہی تھی جس کی میعاد کو سال بھر بعد مرحوم شوہر کی پہلی برسی کے دن موت کے ہاتھوں ختم ہونا تھا۔

سامنے کے سرے پر، جہاں گلی ختم ہونے سے پہلے بائیں ہاتھ کو گھومتی ہے۔ ایک بڑی محراب نظر آ رہی ہے اگر اس محراب سے گزر کر اندر چلے جائیں تو چند پرانی عمارتیں ملتی ہیں جن میں سے ایک عارف جان کے بیٹے نواب احمد بخش خاں والیٔ لوہارو کی حویلی ہے۔ روایت کہتی ہے کہ یہی حویلی غالبؔ کے خسر مرزا الٰہی بخش خاں معروفؔ کا بھی مسکن تھی۔ اگر اس روایت کو درست مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غالبؔ اٹھارہ بیس برس کی عمر میں جب ہمیشہ کے لئے دلّی چلے

آئے تو پہلے پہل چند سال تک اسی مکان میں رہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ غالب کی زندگی کے آخری چند سال ایک ایسے مکان میں بسر ہوئے جو گلی کے اس دوسرے سرے پر ہے۔ جدھر ہم مسجد اور دواخانے کے درمیان کھڑے ہیں۔ دلّی میں ان کے پہلے مکان اور آخری مکان کی یہ باہمی نسبت معنی خیز ہے۔ گلی کے پرلے سرے سے چل کر اس سرے تک آئیے تو گویا آپ نے غالب کے شباب سے لے کر وفات تک کی تمام منزلیں طے کر لیں۔ دلّی میں ان کی زندگی لوہارو والوں کی عظیم الشان حویلی سے شروع ہوئی اور اس کھنڈر میں ختم ہوئی جس کی زیارت کے لئے ہم آپ گلی کے اس سرے پر کھڑے ہیں۔

گلی میں چند قدم چلئے تو مسجد کے پیچھے (اور اس سے ملی ہوئی) ایک دواخانے کی نئی عمارت کو چھوڑ کر ہمیں، ایک بڑی ڈیوڑھی نظر آتی ہے۔ اندر جا کر دیکھئے تو مختصر سا صحن گرتی ہوئی عمارت کے ملبے سے بھر بھر کر کچھ اور مختصر ہو گیا ہے صحن کے مشرق کی طرف دو بوسیدہ سے کمرے جو غالباً پشت مسجد کا سہارا لئے ہوئے ہیں ابھی تک اپنی سخت جانی کے اظہار کے لئے کھڑے ہیں۔ یہ ڈیوڑھی، یہ صحن اور یہی دو کمرے غالب کی آخری فرودگاہ کی یادگاریں ہیں۔ وہ بالاخانہ جو، خود ان کے بقول، ان کے "بیٹھنے اٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل" تھا اب باقی نہیں رہا۔ بلکہ حیرت ہوتی ہے کہ اینٹوں کا یہ ڈھیر اب تک کھڑا کس طرح رہا۔ گلی کے دوسری طرف، غالب کے دیوان خانے کے تقریباً سامنے، ہندوستانی دواخانے سے متصل غالب کا زنان خانہ تھا۔ یہاں اب ہندوستانی دواخانے کا کارخانۂ دواسازی ہے۔ لیکن اس کا حلیہ اب اتنا بدل چکا ہے کہ اگر بیگم غالب پھر کسی طرح یہاں پہنچ سکیں تو انہیں اپنے گھر کو پہچاننے میں خاصی دقت محسوس ہو۔

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے (غالب)

غالب دن کا بیشتر حصہ دیوان خانے میں گزارتے تھے۔ جب تک بڑھاپے کے ضعف اور امراض نے غلبہ نہ پالیا ان کا معمول یہ تھا کہ صبح ناشتے کے بعد اپنے بالاخانے کے دالان میں دوستوں کو خط لکھنے بیٹھ جاتے خط لکھ کر اوپر لفافہ رکھ دیتے اور داروغہ کلو بند کر کے ٹکٹ لگا دیتے تھے۔ دوپہر کو قصے کہانی کی کوئی کتاب لے لیتے یا چوسر اور شطرنج سے جی بہلاتے کبھی عارف جان یا قاسم جان والوں میں سے کوئی لڑکا گلی میں سے آتا ہوا دکھائی دیتا تو اسے آواز دے کر اوپر بلا لیتے تھوڑی دیر اسی سے ہنسی مذاق کی باتیں کر کے کچھ اپنا مگر زیادہ اس کا دل خوش کرتے۔ گرمیوں میں دوپہر کو بالعموم سو جاتے تھے۔

ہوئی جن سے توقعِ خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے
(غالبؔ)

سہ پہر کو اکٹھے تو ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوتا۔ یہ ملاقاتیں زیادہ تر اسی ڈیوڑھی میں ہوتیں جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے اسی ڈیوڑھی میں مونڈھے پڑے رہتے تھے۔ غالب بالاخانے سے نیچے اترتے۔ دوست اور شاگرد اپنے اپنے وقت اور سہولت کے لحاظ سے جمع ہوتے اور یہیں بیٹھتے۔ غالب ایک بڑے چوڑے مونڈھے پر جو لال کھاروے سے منڈھا ہوا تھا ٹانگیں سمیٹے ہوئے بیٹھا کرتے جیلیں آگے پڑی رہتیں۔ ذرا دائیں ہاتھ کی طرف حقہ ہوتا۔ غالب اس عمر میں اونچا سننے لگے تھے۔ جب کوئی شخص بات کرتا تو سننے کے لئے کان اس طرف کو جھکا دیا کرتے تھے۔ ملنے والے اگر کہیں قریب سے آتے تو پیدل چلے آتے تھے۔ فاصلے سے آنے والوں میں پابندِ وضع بزرگ پالکی میں تشریف لاتے۔ پالکی دروازے کے سامنے رکی۔ وہ بزرگ نیچے اترے۔ غالب نے ذرا دیکھا اور پھر اپنے خاص لہجے میں (لفظوں کو خوب پھیلاتے ہوئے) کہا! "آیئے آیئے! آپ کا مزاج اچھا ہے؟"

یہ دیوان خانے کی زندگی کی تصویر ہے لیکن سوال یہ ہے کہ حرم سرا میں زندگی کا کیا نقشہ تھا جہاں غالب کی نصف صدی سے زائد کی رفیقۂ حیات کے دن گزرتے تھے؟ غالب کا ہر روز کا معمول تھا کہ ایک موٹی سی لکڑی ٹیکتے ٹیکتے کم از کم ایک مرتبہ زنان خانے کو ضرور جاتے۔ یہاں وقت کس طرح گزرتا، کیا باتیں ہوتیں، کیا قصے قضیے طے ہوتے، ان تفصیلات پر بظاہر ایک پردہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن کچھ ہی عرصہ پہلے اسی گلی قاسم جان کے اندر، لوہارو والوں کی اس حویلی میں جس کا ذکر ابھی آچکا ہے ایک سن رسیدہ بی بی موجود تھیں جنھوں نے غالب کی زندگی کے آخری دور کا یہ پہلو اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔ یہ بی بی عارف جان کی پڑپوتی، غالب کے دوست نواب ضیاء الدین خاں نیّر رخشاں کی بیٹی اور مرزا زین العابدین خاں عارف کی بہو نواب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم تھیں۔ مجھے جولائی ۱۹۳۸ء میں اپنے کرم فرما اور محترم دوست حکیم محمد کامل خاں صاحب دہلوی کی معرفت بگا بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تھا۔ بگا بیگم صاحبہ اپنی حویلی کے ایک دالان میں پردے کے پیچھے تشریف لے آئیں۔ پردے کے دوسری طرف ایک تخت پر حکیم صاحب اور میں بیٹھ گئے۔ میں نے مرزا غالب اور ان کی بیگم صاحبہ کے متعلق کئی سوالات کئے جن کا جواب بگا بیگم صاحبہ مجھے تفصیل سے دیتی رہیں۔ انکی عمر اسوقت نوے برس کے لگ بھگ تھی۔ مگر آواز میں بڑھاپے کی کمزوری کا کوئی خفیف سا اثر بھی میں نے محسوس نہیں کیا۔ برجستہ اور بے تکان بات کرتی تھیں۔

گفتگو کی ہر منزل پر مجھے ان کے ذہن کی بیداری اور احساس ظرافت کی موجودگی کے ثبوت ملے۔ مَیں ان کے ہر جواب کی یادداشتیں قلم بند کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن بار بار مَیں نے محسوس کیا کہ میرا قلم ان کی شستہ تقریر کی روانی کا ساتھ نہیں دے سکتا جو کچھ مَیں نے ان سے سنا، اس کی کیفیت یہاں لکھنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ غالبؔ کی خانگی زندگی سے متعلق بگا بیگم صاحبہ کو کیا خصوصیت حاصل تھی جس کی بنا پر ان کی دی ہوئی معلومات ہمارے لئے قابلِ قدر ہیں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ غالبؔ کی اولاد میں سے کسی بچے نے کبھی برس سوا برس سے زیادہ کی عمر نہ پائی۔ ان کی بیگم صاحبہ نے اولاد سے مایوس ہو کر آخر اپنے بھانجے (اور قاسم جان کے پڑپوتے) زین العابدین خاں عارفؔ کو منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ مرزا غالبؔ بھی عارفؔ سے حقیقی اولاد کی سی محبت کرتے تھے جس کا اظہار مرزا صاحب کے اردو اور فارسی کلام دونوں میں موجود ہے۔ جب ۱۸۵۲ء میں عارفؔ کا انتقال ہو گیا تو غالبؔ ان کے دونوں بیٹوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں، کو اپنے پاس لے آئے اور انہیں اسی لاڈ پیار سے رکھا جیسے اپنی اولاد کو رکھتے۔

(غالبؔ کے اردو خطوں میں اس کی طرف جابجا اشارے ملتے ہیں۔ اپریل ۱۸۵۹ء کے ایک خط (بنام میر مہدی مجروح) میں لکھتے ہیں "لو بھئی اب تم چاہو بیٹھے رہو، چاہو اپنے گھر جاؤ۔ مَیں تو روٹی کھانے جاتا ہوں۔ اندر باہر سب روزہ دار ہیں۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی۔ صرف ایک مَیں اور ایک میرا پیارا بیٹا حسین علی خاں یہ ہم دو روزہ خور ہیں وہی حسین علی خاں جس کا روزمرہ ہے: کھلونے منگا دو۔ میں بھی بجا رہی ہوں تانگا"

بگا بیگم صاحبہ کے پھوپھی زاد بھائی خضر مرزا مرحوم فرماتے تھے:

مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ حسین علی خاں مرزا غالبؔ سے شوخیاں کرتے اور کبھی ان کی چھاتی پر چڑھ بیٹھتے تھے۔ پڑھائی کے معاملے میں بھی ان کی بہت ناز برداری ہوتی۔ مرزا صاحب نے کہا "ارے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
(غالبؔ)

حسین علی، آکر پڑھ لے" انہوں نے جواب دیا "دادا جان، آتا ہوں" اور دوسری طرف نکل گئے۔ کھیل تماشے کا تو انہیں بیکا تھا۔ کٹھ پتلیوں کے تماشے پر ایک دفعہ بیس روپے خرچ کر دیئے اور پھر مرزا صاحب کے پاس منہ بسورتے ہوئے آئے کہ دادا جان، بیس روپے دلوا دیجئے۔ مرزا صاحب نے کلّو کو بلا کر کہا "بھئی، انہوں نے ایک پتھر اور مارا۔ دیدے بیس روپے"

خضر مرزا مرحوم اپنے بچپن کے دنوں کا ایک واقعہ اس طرح سناتے تھے کہ ایک دن میں چلا جا رہا تھا۔ بھائی حسین علی خاں بھی گلی میں جا رہے تھے۔ مرزا صاحب نے ہمیں دیکھا اور آواز دی "آ بے لمڈو! یہاں آؤ" ہم پہنچے تو مرزا صاحب نے ہمارے لئے مٹھی بھر بادام

ہے۔کہیں کہیں جہاں انہوں نے قیافے سے بات کی، ان کا بیان درست نہیں ہے (مثلاً غالب کی عمر کے متعلق) مگر جو باتیں ان کی دیکھی ہوئی تھیں، ان کی صحت میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی مثلاً جب میں نے پوچھا کہ مرزا صاحب کے چلنے کا انداز کیا تھا تو فوراً بولیں: "سہج سہج چلتے تھے، بڈھے تھے۔ اسی برس کی عمر تھی"۔ ظاہر ہے کہ اس قول کا صرف پہلا حصہ بالکل درست اور دوسرا تخمیناً درست ہے۔ لیکن ہم کتنے ہی صحت پسند ہوں ہمارا یہ تقاضہ ضرورت سے زیادہ سخت ہوگا کہ بگا بیگم صاحبہ کے کسی تخمینے میں بھی کوئی فرق نہ نکلے۔

اتنا سب جانتے ہیں کہ جس قدر مرزا غالب طبیعت کے لحاظ سے آزاد رو تھے، اسی قدر ان کی بیگم صاحبہ اپنے باپ مرزا الٰہی بخش خاں کی طرح پرہیزگار اور نماز روزے کی پابند تھیں اس وجہ سے میاں بیوی کے درمیان اکثر نوک جھونک ہوتی تھی۔ چنانچہ غالب بیوی کو "حضرت موسیٰ کی بہن" کہتے تھے اور اگر زیادہ بگڑتے تو یہاں تک کہہ جاتے تھے کہ "میرا ناک میں دم کر رکھا ہے!" مگر یہ جھگڑا محض رندی و زہد کے اختلاف تک محدود نہ تھا۔ جو کچھ میں نے سنا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اختلافِ مزاج کو بھی گھر کی چپقلش میں خاصہ دخل تھا۔ چنانچہ خود بگا بیگم صاحبہ کی موجودگی میں میاں بیوی کی لڑائی ہوتی تھی۔ امراؤ بیگم خفا ہوتیں۔ مگر خاموش ہو جاتیں۔ ان سے کہتی تھیں: "بیٹی تو تو بچہ ہے۔ بڈھے کی باتوں کا خیال نہ کیا کر، بڈھا تو دیوانہ ہو گیا ہے!"

اسی قسم کا ایک واقعہ بگا بیگم صاحبہ نے مجھے یوں سنایا کہ (مرزا صاحب) پچھلے پہر ہوا خوری کو جایا کرتے تھے۔ ایک روز عصر کے بعد واپس آئے۔ میں اور میری ساس عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ دونوں بھی اسی تخت پر لنگڑ پر ہو بیٹھے جب ہم نے

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا (غالب)

طشتری میں ڈال دیئے۔ میں نے ہاتھ بڑھایا تو مرزا صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ "اے یہ کیا! منہ سے کھا۔ میری مرغی کے بچے یوں ہی چگا کرتے ہیں!"

بڑے لڑکے باقر علی خاں کی شادی غالب نے خود اپنی زندگی میں کی۔ اس طریقے سے جو بہو غالب کے گھر میں آئی، وہ یہی بگا بیگم صاحبہ تھیں۔

اس میں شک نہیں کہ بگا بیگم صاحبہ نے غالب کا صرف آخری زمانہ دیکھا لیکن چونکہ وہ رات دن گھر میں رہتی تھیں اس لئے ان کے بیان کو ایک خاص اہمیت حاصل

سلام پھیرا تو کہنے لگے، واہ وا! خوب! بہو کو بھی اپنا سا کر لیا۔ کمہاری بونٹ کا کیڑا اپنے گھر لے جاتی ہے تو چالیس دن میں اسے بھی اپنا سا کر کے نکال دیتی ہے!"

ایک اور لطیفہ بگا بیگم صاحبہ نے مجھے یوں سنایا کہ برسات کے دن تھے۔ مینہ بہت برسنے لگا۔ پوتوں (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) نے کھانا کھایا اور چلے گئے۔ نیاز علی (ملازم) بھی چلا گیا۔ (مرزا صاحب) بیٹھے بیوی سے باتیں کرتے تھے، میں یوں بیٹھی تھی، گاؤ تکئے کے کونے سے لگی ہوئی۔ کہنے لگے: "ایک بیوی، دو تیں، تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا! بہو، میں اور میری بیوی بیٹھے ہیں، تم کیوں بیٹھی ہو؟" اس پر میری ساس بولیں "اے توبہ! بڈھا تو دیوانہ ہے۔ اسے تو ٹھٹھے کے لئے کوئی چاہئے اب بہو ہی مل گئی۔" میں اتنے میں اٹھ کر ایک کونے میں جا چھپی اب انہیں یہ فکر کہ برسات کا موسم ہے اور کیڑے پتنگے کا عالم مجھے ڈھونڈتے پھریں اور کہتے جاتیں: "مجھے کیا خبر تھی بہو اس بات کو اتنا برا مانے گی!"

میں نے نوکروں اور بچوں کے متعلق پوچھا کہ غالب ان سے کس طرح پیش آتے تھے۔ حسین علی خاں کے متعلق بتایا کہ "چھوٹے پوتے کو دھمکایا کرتے تھے"، نوکروں میں کلّو کا خاص طور پر ذکر کیا اور کہا: "کلّو داروغہ کو مرے ہوئے پندرہ برس ہو گئے۔ لوگ ان کی زیارت کو بہت آتے تھے۔ یہ چودہ برس کی عمر میں مرزا صاحب کے پاس آ کر رہے۔ کلّو داروغہ کا یہ حال تھا کہ پاؤں کی آہٹ سے پہچان لیتے تھے کہ لڑکیاں ہیں، بہوئیں ہیں یا بوڑھیاں۔ ایک اور نوکر مدار خاں تھا۔ ان دونوں کا بیاہ انہوں نے خود کیا۔ یہ مجھ سے پہلے کا ذکر ہے میں نے سنا ہے۔ مدار خاں کے لڑکے کا نام نیاز علی تھا۔ یہ مرزا صاحب نے لے لیا۔ مدار خاں کی بیٹی آبادی کو کلّو نے اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔ کھانا ایک وقت کھاتے تھے۔ دوسرے وقت کباب

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی
(غالب)

تلے ہوئے دال، مربّہ، پسے ہوئے بادام اور حلوا سوہن۔ جب کھانا خراب ہوتا تو پکانے والے کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ پکانے والا کون تھا؟ دد اکھتیں۔ مرزا صاحب پان نہیں کھاتے تھے میں نے انہیں کبھی کھاتے نہیں دیکھا۔ چنے کی دال، بیسن کڑھی کی پھلکیاں بہت کھاتے تھے۔ چنے کی دال ہر سالن میں ایک ایک چمچہ ضرور پڑتی تھی۔ میرے بیاہ کے بعد کی بات ہے کہ چنے کی دال سالن میں پڑی ہوئی میرے سامنے بھی آئی۔ مجھے پسند نہیں تھی۔ مغلانی نے میری ساس سے شکایت کی کہ بہو نہیں کھاتیں چنے کی دال۔ مرزا صاحب یہ بات سن رہے تھے۔

کہنے لگے: "ددا، یہاں تو آ" ددا گئیں تو ان سے کہا: "پیسے نہیں تھے تیرے پاس؟ بہو کی پسند کی چیز پکالی ہوتی۔" ددا نے جواب دیا "نہیں، بہو چنے نہیں کھاتی ہیں۔" بولے: "آدہو، خدا سے بھی بڑھ گئیں بہو؟ توبہ توبہ!" پھر میری ساس سے کہنے لگے: "بیوی سنو" وہ بولیں: "میں نہیں سنتی!" اس پر مجھ سے کہا: "بیٹی، برا نہ مانیو

ایک بات سناتا ہوں۔ خدا کے آگے چنا گیا اور فریاد کی کہ باری تعالیٰ یہ کیا بات ہے مجھ کو لوگ طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں بھونتے ہیں، تلتے ہیں، ابالتے ہیں، پیستے ہیں۔ آخر میرا گناہ کیا ہے؟ خدا نے چنے کی طرف دیکھا اور کہا، دور ہو۔ نہیں میں بھی تجھے کھا جاؤں گا۔

یہ بات سناتے ہوئے خود بھی ہنستی رہیں۔

میں نے پوچھا "مرزا صاحب کی یادگار کی کوئی چیز آپ کے پاس ہے؟" کہنے لگیں: "مجھے کیا خبر تھی کہ لوگ ان کی چیزوں کو اس طرح ڈھونڈیں گے؟ میرے پاس تو کوئی چیز نہیں ہے۔ ہاں معظم میاں (نواب معظم علی خاں) کے پاس ان کا پیالہ اب تک ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ بھوپال لے گئے تھے۔" جب میں نے غالب کے مذہب کے متعلق سوال کیا تو بولیں: "ان کے مذہب کا کیا ٹھکانا؟ جہاں بیٹھے اسی مذہب میں ہو گئے۔" میں نے یہ بھی پوچھا کہ مرزا صاحب کس زمانے میں اونچا سننے لگے تھے؟ جواب دیا: "میں نے تو انھیں بہرا ہی دیکھا جب میرا بیاہ ہوا تو بہرے ہی تھے۔" غالب کے بھائی مرزا یوسف کی وفات کے متعلق دریافت کیا تو کہا: "سرس کی گلی میں مارے گئے تھے۔ مسجد

> احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
> زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا
>
> (غالب)

تہور خاں میں دفن ہوئے۔" میں نے غالب کے متعلق یہ بھی پوچھا کہ کس جگہ انتقال کیا تو جواب دیا: "دیوان خانے میں، جہاں مجید خاں نے اصطبل بنوایا ہے۔ اس وقت حکیم محمود خاں، حکیم غلام مرتضیٰ اور حکیم احسن اللہ خاں وغیرہ سب وہیں تھے۔"

اس سوال کے جواب میں کہ مرزا صاحب نے کس مرض میں انتقال کیا، بگا بیگم صاحبہ نے کہا: "وہ کچھ بیمار تو ہوئے نہیں۔ بس مر ہی گئے۔ ہوا یہ کہ کھانا کھانے آئے۔ میری بڑی بیٹی جند و بیگم کو جو اپنی عمر کے چوتھے سال پر تھی بہت چاہتے تھے۔ مرزا صاحب اسے محبت سے جیون بیگ کہا کرتے تھے۔ پوچھا "جیون بیگ کہاں ہیں؟ بلاؤ، احمد بیگ ان کے خادم

تھے، انہیں بھیجا۔ مرزا صاحب کہنے لگے "اچھا جب وہ آئیں گی تو کھانا کھاؤں گا۔" یہ کہہ کر لیٹ گئے۔ کروٹ لے کر لیٹے ہی تھے کر بے ہوش ہو گئے۔ اسی حالت میں ان کا دم نکلا۔"

امراؤ بیگم کے متعلق بگا بیگم صاحبہ نے مجھ سے کہا جب میں بیاہی گئی تو وہ اچھور کی پھانک تھیں۔ جانماز پر بیٹھ کر کہا کرتیں: "اے اللہ! تو کب بلائے گا۔" ایک روز میں نے پوچھا: "پھپھی جان، آپ کو قبر سے ڈر نہیں لگتا؟" کہنے لگیں: "بیٹی، تھکا بیل سرا کو دیکھتا ہے۔"

یہ ہے ان معلومات کا بڑا حصہ جو مجھے بگا بیگم صاحبہ سے حاصل ہوئیں۔ یہیں اس تحریر کو ختم ہو جانا چاہئے تھا لیکن آخر میں مجھے ذاتی حیثیت کی ایک چھوٹی سی بات کا ذکر بھی کرنا ہے

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

(غالب)

جس دن مجھے بگا بیگم صاحبہ سے باتیں سننے کا موقع ملا، اسی شام میں نے اپنی والدہ مرحومہ کو (جو اس وقت زندہ تھیں) معمول کے مطابق ایک خط لکھا۔ یہ خط محفوظ ہے اور اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس میں مجھے یہ عبارت نظر آتی ہے:

"آج صبح ہوٹل سے نکل کر میں پھر حکیم صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ مجھے بگا بیگم صاحبہ (معظم زمانی بیگم) دختر نواب ضیا الدین نیر رخشاں کے پاس لے گئے۔ یہ عارف کی بہو ہیں نوے برس کی عمر ہے۔ گھر کی باتیں بتاتی رہیں۔ بہت مہربانی سے پیش آئیں۔ بار بار اصرار سے پان دینا چاہتی تھیں مگر حکیم صاحب (جنہیں علم تھا کہ میں پان نہیں کھاتا) روک دیتے تھے انہیں بار بار یہی خیال ہوتا تھا کہ اتنی دور سے آئے ہیں تو انکی تواضع ضرور ہونی چاہئے......"

میں اب بھی پان نہیں کھاتا ہوں۔ لیکن جب اس عبارت کو پڑھتا ہوں تو یہ افسوس ضرور ہوتا ہے کہ میں اس دن ایک تبرک سے محروم رہا۔

• مرزا حاتم علی مہر کو وکالت کا عہدہ ملا تو مرزا غالب نے لکھا۔
"صاحب میرے عہدۂ وکالت مبارک ہو۔ موکلوں سے کام لیا کیجئے۔ پریوں کو تسخیر کیا کیجئے۔"

بلیماران - دہلی
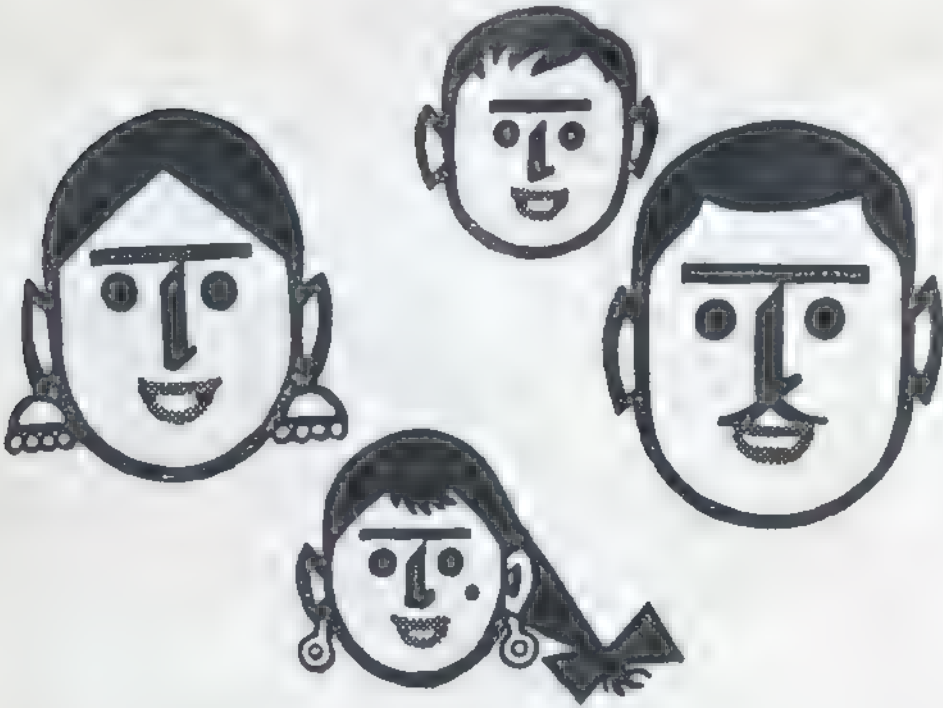
ڈیر انکل!

یہ خط میں بلیماران کے ایک چائے خانے سے تحریر کر رہا ہوں۔ سوچا، انکل غالب بھی بلیماران میں بیٹھ کر احباب اور مریدوں کے نام خطوط قلمبند کیا کرتا تھا۔ جس سے ان خطوط میں حسن، کشش اور جادو پیدا ہو جاتا تھا۔ چار دانگ ہندوستان میں ان خطوط نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ لہٰذا میری ناقص سمجھ میں یہ آیا کہ میں بھی بلیماران میں بیٹھ کر ہی خط لکھوں۔ کیونکہ خوبی نہ غالب میں تھی نہ خطوط میں۔ بلکہ بلیماران میں تھی۔ شاید بلیماران میں خط لکھنے سے انسان عظیم ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے میں بھی عظیم ہو جاؤں ــــ انکل! انسان کو عظیم بننے کے لئے کتنے فریب کھانا پڑتے ہیں۔

جیسا کہ صد سالہ جشنِ غالب کمیٹی کی طرف سے تمہیں مطلع کر دیا گیا ہوگا کہ ہم ہندوستانیوں کو ایک دم تمہاری عظمت کا احساس ہو گیا ہے اور ہم نے تمہاری عظمت کا سکہ بٹھانے کے لئے لاکھوں روپے خرچ کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ تمہارے انتقال کے ایک سو سال بعد ہم تمہاری قدر و منزلت کے قائل ہوئے ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ہر آدمی کی عزت اس کے مرنے کے بعد کیا کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم زندہ انسانوں کے نہیں، مردہ انسانوں کے پجاری ہیں۔ ہم انسانوں کے نہیں خانقاہوں کے پجاری ہیں جس شخص کو ہم زندگی میں ایک پیالہ گوشت کا شوربہ اور آدھ پاؤ شراب مہیا نہ کر سکے، اس کے مرنے کے بعد ہم اس کی قبر کی چادر پر شراب کے گھڑے انڈیل دیتے ہیں۔ اور گوشت کی دیگیں پکا پکا کر غریبوں کو کھلاتے ہیں ــــ انکل غالب! تمہیں یاد ہوگا، تم نے ایک بار حسرت کیساتھ لکھا تھا کہ ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

چنانچہ انکل! تمہاری پیش گوئی صحیح نکلی، آخر وہ دن آ گیا ہے، جب تمہاری ۱۸۶۹ء کی فاقہ مستی ۱۹۶۹ء میں رنگ لائی ہے اور ہم تمہارا قرض لاکھوں روپے خرچ کر کے چکا رہے ہیں۔ تمہارے نام کے ڈاک ٹکٹ جاری کر رہے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تمہارے قصے دہرا رہے ہیں۔ تمہارے نام کی لائبریری، تھیٹر ہال، تمہارا بت، تمہاری یادگار ایک عظیم الشان بلڈنگ ــــ جس کا ہزاروں روپے کا بنیادی پتھر چوری بھی ہو گیا ہے لیکن ہم اس چوری سے بھی ہرگز نہیں ڈرے، ایک پتھر ٹوٹ گیا تو ہزاروں روپے خرچ کر کے دوسرا پتھر لے آئیں گے۔ کیونکہ ایک سو سال پہلے تم نے ہی تو کہا تھا ؎

اور لے آئیں گے بازار سے گر ٹوٹ گیا

جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

تمہاری یادگار کا بنیادی پتھر شاید جامِ سفال تھا، جسے کوئی سفلہ صفت آدمی چرا کر لے گیا۔ کچھ حاکم لوگ جو رسوا نہیں ہونا چاہتے، کہتے ہیں، یہ پتھر چرایا نہیں گیا۔ ایک حادثہ میں زخمی ہو گیا۔ اور ٹکڑے ہو گیا اور بچے یہ ٹکڑے کھیلنے کے لئے اٹھا لے گئے۔ انکل! یہ دنیا سچ مچ بچوں کا کھیل ہے۔ تم واقعی تلمیذ الرحمٰن تھے۔ جب تم نے یہ شعر کہا تھا کہ ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ؛ ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

بہرکیف انکل! اس وقت جبکہ ہم تمہارا حسین و جمیل یادگار جشن منا رہے ہیں۔ نجانے تمہارے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ شاید تمہارا بھی جی چاہتا ہوگا کہ دہلی آجاؤ اور اپنا جشن اپنی آنکھوں سے دیکھو مگر نہیں جانتا جشن غالب کمیٹی نے تمہیں دعوت نامہ بھیجا ہے یا تمہاری موجودگی کے تصور سے وہ خم کھاتے ہیں لیکن انکل! اگر تم سچ مچ آجاؤ تو اپنی دہلی میں حیرت انگیز تبدیلیاں پاؤ گے۔ بلکہ یک دہلی کی بجائے یہاں کئی دہلیاں پاؤ گے۔ پرانی دہلی، نئی دہلی، جنوبی دہلی، مغربی دہلی، جمنا پار کی دہلی، جھگی جھونپڑیوں والی دہلی، بینکوں اور ہوٹلوں کی عظیم الشان عمارتوں والی دہلی ـــــ تمہاری دہلی جو قلعۂ معلی سے بلیماران تک محدود تھی، اب پھیل کر ایک برِ اعظم بن گئی ہے۔ تم سے تو پہچانی بھی نہیں جائے گی انکل! لال قلعہ اگرچہ وہی ہے لیکن اس کی دیوار کے سائے میں فرنگی ہپّی چھوکرے اور چھوکریاں بیٹھ کر چرس کے دم لگاتے ہیں۔ اور تمہارا شعر پڑھتے ہیں کہ ؎

"دم سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو

اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

اور لال قلعے کے اندر جہاں کبھی مینا بازار لگتا تھا اور مغل شہزادیاں اپنے حسن و جمال کی چکا چوند کے ساتھ تفریح کے طور پر "سیلز گرل" بن کر بیٹھا کرتی تھیں۔ وہاں اب سموسے اور آلو کی ٹکیاں اور مونگ پھلیاں بکتی ہیں۔ قلعۂ معلّٰی کے اندر جہاں کبھی بہادر شاہ ظفر کی زیرِ صدارت میں ہنگامہ خیز مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ آج کل وہاں تمہاری روح کو خوبصورت فریب دینے کے لئے اردو مشاعرے منعقد ضرور ہوتے ہیں جن میں وارداتِ قلب و جگر کی بجائے پنسالہ پلان کے تذکرے کئے جاتے ہیں۔ اردو مشاعرے کے ساتھ ساتھ ہندی مشاعرے بھی گھس بیٹھ کر گئے ہیں۔ کیونکہ اردو جو کبھی قوم کی ستھری زبان سمجھی جاتی تھی، اب شیڈولڈ کاسٹ ہو کر رہ گئی ہے۔ ہندی اب قلعہ معلّٰی کی نیشنل بھاشا بن گئی ہے۔ اس نے ادب و علم کا تاج اس نے اردو کے سر سے چھین کر اپنے سر پر پہن لیا ہے اور اب تو سنا ہے انکل! وہاں پنجابی زبان کا ایک مشاعرہ بھی ہوا ہے۔ مغل سلطنت کا زوال تو سنا تھا، لیکن اردو مشاعرے کا زوال اس سے بھی زیادہ عبرتناک ہے۔

مگر اس زوال کے باوجود انکل! ہم تمہارا صد سالہ جشن منا رہے ہیں۔ اور غضب خدا کا کہ جن لوگوں نے اردو کو دیس نکالا دینے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا، وہی بڑھ چڑھ کر تمہارا جشن منا رہے ہیں۔ میں نہیں سمجھ پاتا کہ یہ جشن ہے یا ماتم۔ اور یہ ماتم غالب کا ہے یا اردو کا؟ حیرت ہے کہ اس ماتمی جشن میں دہلی کے جن سنگھی حکمران بھی شرکت فرما رہے ہیں۔ تم نے ایک بار رقیب کے متعلق تحریر کیا تھا کہ وہ محبوبہ کے ساتھ تمہارے گھر کی طرف آیا تھا تو تم جل بھن کر کباب ہو گئے تھے۔ لیکن اب پھر وہی تمہاری محبوبہ اردو کا رقیب تمہارا جشن منانے کے لئے لال قلعے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور تم ؎

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

انکل! یہ خط میں بلیماران کے ایک چائے خانے کی چوبی بنچ پر بیٹھ کر لکھ رہا ہوں۔ تمہارا گھر میرے سامنے ہے، جواب تمہارا گھر نہیں لگتا بلکہ ماتم کدہ لگتا ہے۔ اور میں سوچ رہا ہوں، آخر اس ماتم کدے میں غالب کا جشن منانے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی۔ کوئی نہ کوئی ڈپلومیٹک ضرورت ہوگی۔ ورنہ بقول تمہارے ؎

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں ★★

غالب سے پہلے اور غالب کے بعد

اردو شاعروں اور ادیبوں کا فوٹو البم

مع

(منتخب کلام اور مختصر حال)

زیرِ نظر صفحہ سے صفحہ... اتک ہر صفحہ کی زینت ہے

اردو کا سب سے پہلا شاعر حضرت امیر خسرو دہلوی

حضرت امیر خسرو دہلوی ۶۵۲ھ میں پیدا ہوئے اور متعدد شاہانِ دہلی شاہ غیاث الدین بلبن، معز الدین کیقباد وغیرہ کے درباروں میں معزز عہدوں پر سرفراز رہے مشہور بزرگ حضرت نظام الدین اولیاء دہلوی کے مرید و محبوب خاص تھے اور ان سے اتنی محبت اور عقیدت تھی کہ جب ان کے انتقال کا حال سنا تو تارک الدنیا ہوگئے چنانچہ اسی غم میں چند روز کے بعد ۷۲۵ھ میں بعہد شاہ بلبن انتقال فرمایا۔ شاہ بلبن آپکے کلام کا دلدادہ اور قدر داں تھا حضرت امیر خسرو دہلوی اردو کے سب سے پہلے شاعر اور ادیب ہونے کے علاوہ موجد اور مخترع بھی تھے وہ روزِ ازل سے علمی و ادبی ذوق لے کر آئے تھے فارسی عربی اور سنسکرت کے بہت بڑے عالم اور شاعر تھے ہندی میں بھی کہتے تھے اپنی ہر دل عزیز شاعری ہی کی مناسبت سے وہ "طوطیٔ ہند" کے لقب سے مشہورِ زمانہ ہوئے ان کے زمانے میں اردو میں پختگی نہیں آئی تھی لیکن روانی ضرور پیدا ہوگئی تھی ان کی شاعری میں جوش و اصلیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے سادگی و پرکاری بیخودی و ہوشیاری ان کے کلام کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ • •

بیا برادر آؤ رے بھائی بشیں مادر بیٹھ ری مائی (خالق باری)

(اردو کی پہلی غزل) سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

انار کیوں نہ چکھا وزیر کیوں نہ رکھا۔ دانہ نہ تھا
سر کاٹوں تو آمن نے۔ اور پاؤں کاٹوں تو پیالہ
امیر خسرو یوں کہے رنگ ہے اس کا کالا (جامن)

اردو کا پہلا صاحبِ دیوان ولی دکنی

ولی اورنگ آباد دکن میں ۱۶۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ آج تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ ولی کا صحیح نام کیا تھا ان کا خاندانی تعلق اورنگ آباد کے شیوخ خاندان سے معلوم ہوتا ہے بیس سال تک تحصیل علم کر کے احمد آباد گئے اور شاہ وجیہہ الدین کے خاندان کے مرید ہو گئے ——— انہی کے زمانہ میں اردو شاعری کا سنگِ بنیاد باقاعدہ طور پر رکھا گیا اس دور میں ولی تو مجلس کی شمع ہیں اور اہل مجلس ولی اور دکن کے شریف و نجیب فصیح زبان ہیں۔ ولی نے اسے ایسا زور بخشا کہ آج ہند کی شاعری نظم فارسی سے ایک قدم پیچھے نہیں۔ سیر و سیاحت کے سلسلے میں ولی دو مرتبہ دلی آئے پہلی مرتبہ اورنگ زیب عالمگیر کے آخری عہد ۱۷۰۰ء میں اور دوسری دفعہ محمد شاہ کے عہد سلطنت ۱۷۲۲ء میں دوسری مرتبہ ولی اپنا دیوان بھی ساتھ لائے دہلی میں ان کا کلام بہت مقبول ہوا اور ادبا کی صحبت سے کسب فیض کیا۔ چنانچہ دہلی آنے کے بعد ان کے کلام کا رنگ ہی بدل گیا تھا جو انکے اشعار سے بخوبی ظاہر ہے۔ ۱۷۴۴ء میں احمد آباد میں انتقال کیا۔ دیوان ولی پیرس سے ۱۸۳۳ء میں شائع ہوا اور پھر ۱۹۲۷ء میں ہندوستان میں چھپا۔

شہنشاہِ متغزلین میر تقی میر

میر تقی میر اکبر آباد (آگرہ) میں ۱۷۲۳ء میں پیدا ہوئے جس طرح فن منطق کا بانی مبانی ارسطو کو مانا جاتا ہے اسی طرح فن غزل گوئی کا پہلا استاد میر صاحب کو تسلیم کیا گیا ہے واردات قلب و محبت کی ترجمانی میر سے بہتر کسی نے نہیں کی اور عشق کی کیفیات کو ان سے بہتر کسی نے نہیں سمجھا۔ آج ڈیڑھ سو برس گزر جانے کے بعد بھی میر کے کلام میں تازگی اور کشش موجود ہے یہی شاعری کا اعجاز ہے۔ میر آگرہ کے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کے والد بزرگوار کا نام میر عبداللہ عرف علی متقی تھا گیارہ سال کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے کچھ عرصہ بعد دہلی آ گئے اس وقت دلی علوم و فنون کا عظیم الشان مرکز بنی ہوئی تھی ہندوستان میں یہ بات صرف میر ہی کو نصیب ہوئی کہ مسافر ان کی غزلیں بطور تحفہ دور دراز ممالک میں لے جاتے تھے دلی کی بربادی کے بعد نواب آصف الدولہ نے ان کو ۱۷۸۲ء میں لکھنؤ بلا لیا سودا پہلے ہی جا چکے تھے اس وقت لکھنؤ اہل کمال کا مرکز بنا ہوا تھا۔ نواب نے میر صاحب کی کافی قدر و منزلت کی لیکن میر صاحب بعد میں ناراض ہو گئے اور زندگی کے باقی ایام فقر و فاقہ میں بسر کر کے ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔

مرزا سودا دہلوی

مرزا محمد رفیع سودا [illegible]ء میں دہلی میں پیدا ہوئے آپ کے والد مرزا محمد شفیع بسلسلہ تجارت کابل سے ہندوستان آئے اور دہلی میں قیام کیا، سودا کے آباد اجداد کابل کے معزز خاندان سے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے مشہور وزیر نعمت خان عالی سودا کے نانا تھے آپنے دہلی میں تعلیم و تربیت پائی پہلے سلیمان قلی داؤد پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ پہلے فارسی میں شعر کہتے تھے لیکن بعد میں [illegible] کے مشورہ سے اردو میں کہنا شروع کیا۔ سودا کی شہرت کا آوازہ [illegible] ہو کہ شاہ عالم بادشاہ نے انھیں مشورۂ سخن کی عزت بخشی یہ منصب سودا کے لئے ایک زریں تاج تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میر و مرزا ہی دو شخصیتیں اہم سخن میں ایسی نظر آتی ہیں جن کا آوازۂ سخن ہندوستان کے ہر گوشے میں ہر دور میں گونجتا رہا ہے اور ارباب کمال اپنے اپنے عہد میں تحسین کمال کرتے رہے ہیں ان دونوں باکمالوں کو خود اپنے عہد میں اس قدر شہرت حاصل ہو گئی تھی کہ [illegible] خاں بقا کو بھی اقرار کرنا پڑا۔ مرزا سودا نے قدرتاً طبیعت نہایت شگفتہ پائی تھی مزاج میں شوخی و ظرافت تھی۔ میر کا کلام "آہ" اور مرزا کا "واہ" مشہور ہے۔ [illegible] میں انتقال کیا۔

میر درد دھلوی

خواجہ میر نام۔ درد تخلص۔ [illegible] میں بعہد فرخ سیر دہلی میں پیدا ہوئے آپ کے دادا بخارا سے عہد عالمگیری میں دہلی آئے تھے۔ والد کا نام خواجہ محمد ناصر عندلیب صوفی و شاعر تھے۔ درد کو ورثے تصوف اور شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ انہوں نے تصوف کی چاشنی دے کر غزل میں درد پیدا کیا۔ ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔ باپ کے انتقال کے بعد ان کے سجادہ نشین ہو کر عبادت و ریاضت میں مصروف ہو گئے۔ خواجہ صاحب کو فن موسیقی پر بھی کافی عبور حاصل تھا مہینے میں دو بار آپ کے مکان پر محفل سماع ہوتی تھی۔ جس میں کبھی کبھی بادشاہ وقت بھی تشریف لاتے تھے میر درد فطرۃً نہایت مستغنی مزاج اور قانع، جمال حقیقی سے آشنا، جام معرفت سے سرشار، تصوف کے مسلم الثبوت استاد اور قدیم تہذیب کی مجسم تصویر تھے۔ [illegible]ء میں دہلی میں انتقال کیا دہلی میں دلی دروازہ کے باہر میر درد روڈ آپ ہی کے نام سے منسوب ہے اور وہیں آپ کا مزار ہے۔

میر درد کا خاندان ابھی تک دھلی میں موجود ہے

سید انشاء دہلوی

سید انشاء اللہ خاں نام انشاؔ تخلص۔ ان کے بزرگ نجف اشرف سے دہلی آئے ان کے والد حکیم ماشاء اللہ خاں دہلی میں شاہی طبیب تھے۔ دہلی کے زوال پر مرشد آباد چلے گئے جہاں سید انشاء ۱۷۵۶ء اور ۱۷۵۷ء کے درمیان پیدا۔ انشاء کی تعلیم و تربیت بہت باقاعدہ ہوئی انشاء بعد میں دہلی آگئے انہوں نے زانوئے شاگردی پہلے سوز کے سامنے تہ کیا کچھ دنوں مصحفی سے بھی اصلاح لی۔ شاہ عالم بادشاہ نے اپنے درباریوں میں جگہ دی جہاں آپ نے لطائف و ظرائف سے گل افشانی کر کے محفل کو لٹا لٹا دیا۔ بعد میں دربار کی تباہی اور شعراء کی چشمکوں سے بددل ہو کر لکھنؤ چلے گئے اور نواب سعادت علی خاں کی مصاحبت اختیار کی لیکن بعد میں نواب کی طبیعت بدل گئی اور کسی بات پر ان بن ہو گئی تو آنا جانا بند ہو گیا ادھر انشاء کے جوان بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ تنخواہ بند ہونے کے سبب فقر و فاقہ کی نوبت آگئی۔ آخر اسی کسمپرسی کی حالت میں بمقام لکھنؤ ۱۸۱۷ء میں انتقال کیا۔

میر حسن دہلوی

میر غلام حسن نام حسنؔ تخلص۔ دلی کے رہنے والے۔ جد امجد میر امامی ایران سے دہلی آئے ۱۷۲۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر غلام حسین ضاحک تھا۔ میر حسن نے پہلے اپنے والد کو کلام دکھایا جو پایہ کے شاعر تھے پھر میر درد کے شاگرد ہو گئے۔ دہلی کی حالت جب دگرگوں ہوئی تو اپنے والد کے ساتھ جوانی ہی میں فیض آباد چلے گئے جو اس وقت اودھ کا دارالسلطنت تھا لیکن جب آصف الدولہ نے لکھنؤ آباد کیا اور لکھنؤ کو عروج ہوا تو وہاں چلے آئے دہلی سے جانے کے بعد میر اور سودا کی تتبع میں شعر کہنا شروع کیا میر حسن کے یہاں تصوف اور درد و نیت بھی قابل دید ہے شاعری بزرگوں کی میراث تھی۔ غزلوں میں بھی وہی عاشقانہ رنگ وہی سادگی اور وہی دلفریبی ہے۔ دراصل میر حسن کی سب سے بڑی خوبی ان کی منظر نگاری ہی ہے زبان اس دوراندیشی اور پاکیزگی کے ساتھ نظم کی گئی ہے تقریباً دو سو برس گذر جانے کے بعد بھی اسی شوق کے ساتھ پڑھی جاتی ہے اور حسن جذبات کی پوری ترجمانی کرتی ہے۔ میر حسن نے ۱۷۸۶ء میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔

۱۴ رجب ۱۲۶۱ھ کے مشاعرے شعرا کی نشست کا ایک نقشہ

مرزا فرحت اللہ بیگ کی یہ کتاب اردو ادب میں نہایت بلند مقام رکھتی ہے غدر سے قبل دلی کے مشاعرے ایک مخصوص اہمیت کے حامل ہوتے تھے۔ مرزا نے ایسے ہی ایک مشاعرے روداد مولوی کریم الدین بالئ مشاعرہ کی تصنیف سے اخذ کر کے خوب صورت تصوراتی اضافوں کے ساتھ ایسے دلنشین پیرائے میں پیش کی ہے کہ آپ خود کو اس عظیم ترین مجلس میں پائیں گے جس میں ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، داغؔ اور دوسرے کاملین فن رونق افروز ہیں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر مرزا فرحت اللہ بیگ کی اس یادگار تالیف کی تلخیص ہم "تبرکاً" ہدیہ ناظرین کر رہا ہے ——— (ادارہ)

مولوی کریم الدین بانی مشاعرہ کا بیان ہے کہ میں تلاشِ معاش میں اپنے وطن پانی پت سے دلی آیا۔ اور چند دوستوں کی شرکت میں قاضی کے حوض پر مبارک النساء بیگم کی حویلی کرایہ پر لے کر چھاپہ خانہ قائم کیا۔ اور مشہور عربی کتابوں کے ترجمے چھاپنے شروع کئے۔ لیکن مطبع جیسا چلنا چاہیئے تھا نہ چلا۔ یہ اردو شاعری کے شباب کا زمانہ تھا۔ اس لئے خیال ہوا کہ کیوں نہ ایک مشاعرہ منعقد کر کے شعراء کے حالات اور ان کا کلام طبع کروں، ممکن ہے اس طرح مطبع چل جائے۔ لیکن میں مشاعروں کے اہتمام و انصرام سے ناواقف محض تھا۔ اس لئے نواب زین العابدین خاں عارف کی خدمت میں اپنا مدعا بیان کیا۔ نواب صاحب بڑے خوش اخلاق اور بامروّت انسان ہیں۔ انہوں نے میری ہمت افزائی فرمائی اور اپنی علالت کے باوجود ہر قسم کی مدد کا وعدہ فرمایا۔ اور مجھے حکیم احسن اللہ خاں صاحب وزیرِ اعظم سے ملا کر انہیں آمادہ کیا کہ وہ مجھے بارگاہِ جہاں پناہی تک پہنچا دیں اگر حضرت ظل اللہ اپنا کلام بھیجنے پر راضی ہو گئے تو مشاعرہ کا جم جانا مشکل کام نہیں ہے۔ مشاعرہ کے انتظامات میں کر لوں گا۔ یہ بیچارے کریم الدین ان چیزوں کو کیا سمجھیں۔ چنانچہ حکیم صاحب کی ہدایت کے مطابق دوسرے روز ایک بجے کے قریب میں مولویانہ ٹھاٹھ سے پگڑی باندھ اور جبہ پہن قلعۂ معلیٰ پہنچا۔ لاہوری دروازے کے پاس خدا بخش کھڑے ہوئے تھے۔ وہ مجھ کو حکیم صاحب کی بیٹھک میں لے لئے۔ یہ بیٹھک جس کو پہلے زمانہ میں 'نشست' کہا جاتا تھا۔ دیوانِ عام سے ملی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے "اجی مولوی صاحب میں نے آپ کا کام کر دیا ہے۔ صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر سے صبح ہی کو ملنا ہو گیا۔ وہ اس تجویز سے بڑے خوش ہوئے، فرماتے تھے، "جہاں پناہ سے میں اجازت لے لیتا ہوں۔ مگر مشاعرے کا انتظام ایسا ہونا چاہیئے کہ ہم لوگ بھی آ سکیں۔ خیر بیٹھئے۔ شاید ابھی آپ کی یاد ہو۔" میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ بیٹھا ہی تھا کہ چوبدار نے آ کر کہا، "کریم الدین کون صاحب ہیں۔ ان کو حضورِ والا یاد فرماتے ہیں۔" یہ سننا تھا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں سمجھا تھا کہ حکیم صاحب ہی کے پاس جا کر معاملہ طے ہو جائے گا۔ یہ کیا خبر تھی کہ بارگاہِ جہاں پناہی میں یاد ہو گی۔ اور یاد بھی ایسے وقت کہ میرا سانس بھی پوری طرح پیٹ میں نہ سمایا ہو گا۔ حکم حاکم مرگِ مفاجات اٹھا اور چوبدار کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ تمام راستہ آیۃ الکرسی پڑھتا رہا۔ آنکھ اٹھا کر یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ بندۂ خدا کدھر لئے جا رہا ہے۔ اندر سے قلعہ دیکھنے کا مدت سے شوق تھا۔ اب جو موقع ملا تو کن انکھیوں سے بھی دیکھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ چلتے چلتے اندھ آ گئی۔ آخر خدا خدا کر کے چوبدار نے دیوان خاص کی سیڑھیوں کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا، اور آپ اندر اطلاع دینے چلا گیا۔ حضرت جہاں پناہ اس وقت حمام میں رونق افروز تھے۔ یہ حمام دراصل ایک عالی شان عمارت ہے جس کے دو درجے ہیں۔ ایک گرم دوسرا سرد۔ اس کا وہ حصہ جو موتی مسجد کی جانب ہے وہ گرم ہے اور جمنا کے رخ والا حصہ سرد ہے۔ ریتی کے رُخ خس کے پردے ڈال کر خس خانہ بنا لیا جاتا ہے۔ اندر نہر بہتی ہے۔ بیچ میں کئی بڑے بڑے حوض ہیں۔ ان میں فوارے چلتے ہیں۔ حمام کیا بہشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ چوبدار جو گیا تو آنے کا نام نہیں لیتا۔ دھوپ میں کھڑے کھڑے فشار ہو گیا۔ پسینہ میں تر بتر گردن نیچی کئے کھڑا ہوں۔ اور ناک سے پسینے کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ ارادہ ہوا کہ واپس چلا جاؤں۔ مگر اول تو طلبی کے بعد بھاگ جانا ہی نازیبا دوسرے راستہ کس کو معلوم۔ خدا خدا کر کے مشکل آسان ہوئی اور چوبدار نے آ کر کہا کہ چلئے۔ اس ایک لفظ نے خود بخود پاؤں میں لرزش اور دل میں کپکپی پیدا کر دی۔ خیر کسی نہ کسی طرح الٹے سیدھے پاؤں ڈالتا حمام مبارک میں داخل ہو گیا۔ چوبدار نے آواز دی، "ادب سے، نگاہ روبرو، حضرت جہاں پناہ سلامت۔ آداب بجا لاؤ۔" میں نواب زین العابدین خاں صاحب سے یہ سبق پورا اور اچھی طرح پڑھ کر آیا تھا۔ دہرا ہو کر سات تسلیمات بجا لایا۔ اور نذر گزرانی

نذر دیتے وقت ذرا آنکھ اونچی ہوئی تو وہاں کا رنگ دیکھا حضرت پیرو مرشد ایک چاندی کی پلنگڑی پر لیٹے تھے۔ پائنتی مرزا فخرو (ولیعہد) بیٹھے پاؤں دبا رہے تھے۔ مرزا فخرو عین مین باپ کی تصویر تھے۔ بتیس تینتیس برس کی عمر تھی۔ فرق تھا تو صرف یہی کہ وہ بڑھے تھے، یہ جوان ان کا رنگ بڑھاپے کی وجہ سے ذرا کلونس لے آیا تھا۔ ان کا کھلا گیہواں رنگ تھا۔ ان کی داڑھی سفید تھی، ان کی سیاہ، ورنہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ ایک بادشاہ لیٹے ہیں اور ایک بیٹھے ہیں۔ دونوں نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی۔ اور بادشاہ سلامت نے فرمایا۔ "اماں، تمہارا ہی نام کریم الدین ہے۔ تم کہیں باہر کے معلوم ہوتے ہو۔" میں نے کہا کہ خانہ زاد پانی پت کا رہنے والا ہے۔ بچپن ہی سے حضرت ظل اللہ کے سایۂ عاطفت میں آرہا ہے۔"

فرمایا "اماں، ابھی تمہارا ہی تذکرہ مرزا فخرو کر رہے تھے۔ میرا خود دل چاہتا ہے کہ پہلے کی طرح دیوان عام میں مشاعرہ کروں۔ مگر کیا کروں زمانہ کی ہوا ایسی بگڑ گئی ہے کہ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ 'لود ہم پیشہ یا ہم پیشہ دشمن' لیکن خدا محفوظ رکھے ایسی دشمنی بھی کس کام کی کہ دو گھڑی مل جل کر نہ بیٹھنے دے۔ دیوان عام میں مشاعرہ ہوتا تھا۔ وہ کچھ دنوں ٹھیک چلا، پھر میں نے دیکھا کہ بے لطفی بڑھ رہی ہے۔ اس لئے بند کر دیا۔ منشی فیض پارسا نے اجمیری دروازے کے باہر غازی الدین خاں کے مدرسے میں مشاعرہ شروع کیا۔ وہ تیلیوں کی طرح بکھر گیا۔ وہ تو کہو غنیمت ہوا کہ ردیف میں تیلیاں ہی تھیں۔ کہیں خدا نخواستہ اگر ردیف 'کڑیاں' ہوتی تو خدا معلوم کتنوں کے سر پھوٹ جاتے۔ تم مشاعرہ تو کر رہے ہو، مگر ان ہاتھیوں کی ٹکر کیسے سنبھالو گے۔ استاد ذوق تو بے چارے بے زبان آدمی ہیں، مگر خدا بچائے حافظ ویران' سے، وہ ضرور لڑ مریں گے۔ اور تم جانتے ہو" اندھے کی داد نہ فریاد، اندھا مار بیٹھے گا۔" کسی نے اگر مشاعرے میں استاد پر ذرا بھی چوٹ کر دی، تو ان نابینا صاحب کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ میاں، تم سے یہ کام سنبھلتا نظر نہیں آتا۔" میں نے عرض کی کہ قبلہ عالم! میری کیا ہمت ہے جو میں اتنے بڑے کام میں ہاتھ ڈالوں۔ مشاعرے کا سارا انتظام نواب زین العابدین عارف نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔" فرمایا، "تو مجھے اطمینان ہے، یہ لڑکا بڑا ذہین اور ہوشیار ہے۔ مرزا نوشہ اور مومن خاں کو وہ سنبھال لے گا۔ رہے استاد ذوق ان سے میں کہہ دوں گا۔ خدا نے چاہا تو مشاعرہ چل جائے گا۔ مگر میں یہ کہے دیتا ہوں کہ مشاعرے سے پہلے ان لوگوں سے مل لو۔ ایسا نہ ہو کہ وقت پر انکار کر دیں۔ میں اور مرزا شبو آ تو نہیں سکتے۔ ہاں، مرزا فخرو کو اپنی جگہ بھیج دوں گا۔ اور انشاء اللہ اپنی غزل بھی بھیجوں گا۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم نے 'طرح' کیا رکھی ہے؟ 'طرح' ہی تو بڑے جھگڑے کی چیز ہے۔ یہ ذرا سوچ سمجھ کر دینا۔" یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بازو سے آواز آئی، "اے ہے یہ اتنا بچے کو کیا بے 'طرح' سلا گئی ہے۔" یہ سنتے ہی بادشاہ سلامت نے فرمایا، "لو بھائی یہ خوب، بخود 'فالِ گوش' مل گئی۔ تم اس مشاعرے میں کوئی 'طرح' ہی نہ دو۔ جس شخص کا جس بحر، جس ردیف قافیہ میں غزل پڑھنے کو دل چاہے، پڑھے۔ نہ لینا ایک نہ دینا دو۔" میں نے عرض کیا "پیرو مرشد تاریخ؟" فرمایا "۱۴ رجب مقرر کر دو۔ دن بھی اچھا ہے۔ چاندنی رات بھی ہوگی۔ آج پانچ تاریخ ہے۔ نو دن باقی رہیں۔ اتنے دنوں میں بہت کچھ انتظام ہو سکتا ہے۔ ۲۰ جولائی پڑے گی۔ موسم بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اچھا، اب خدا حافظ۔" میں نے عمر و دولت و اقبال کو دعا دی اور خوش خوش الٹے قدموں واپس ہوا۔ مرزا فخرو بیچ میں کچھ نہ بولے، مگر میں سمجھتا تھا کہ یہ سب کیا دھرا انہیں کا ہے۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں بادشاہ سے تنہائی میں ملنا۔

ان کا نام شیخ غلام ہمدانی تھا مصحفی تخلص کرتے تھے ۱۷۵۰ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام ولی محمد تھا جوانی ہی میں وطن چھوڑ کر دہلی آ گئے اور تحصیل علم میں مشغول ہو گئے بزرگان دہلی کی صحبتوں سے مستفیض ہوئے ان دنوں دہلی میں افلاس کا دور دورہ تھا اور لکھنؤ میں سخاوت کی گنگا بہہ رہی تھی مصحفی بھی دلی کو خیرباد کہہ کر نواب آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ گئے مرزا سلیمان شکوہ نے اپنا درباری شاعر بنا لیا یہاں بھی ان کے فن کی کافی قدر ہوئی لیکن آخر میں انشا کے آجانے پران سے معرکہ آرائی شروع ہو گئی اور انشا کا لکھنؤ آنا وبال جان ہو گیا جب تک زندہ رہے لکھنؤ میں رہے لیکن دلی کی یاد مرتے دم تک رہی ۱۸۲۴ء میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا مصحفی زود گو تھے اصناف سخن میں کوئی صنف ایسی نہیں جس میں اس باکمال شاعر نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ واقعاتی تاریخیں جس قدر بھی لکھی ہیں خوب لکھی ہیں ویسے تو سارا لکھنؤ ان کا شاگرد ہے لیکن ناسخ اور آتش ایسے شاگرد ہوئے جو بعد میں استاد زماں کہلائے۔

میں وہاں سے سیدھا نواب صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ اور ان سے حالات بیان کئے۔ کہنے لگے کہ "چلو یہ مشکل تو آسان ہوئی۔ اب تم یہ کرو کہ کم از کم استاد ذوق، مرزا نوشہ، اور حکیم مومن خاں کے مکان کا گشت لگا ڈالو۔ مگر دیکھو ذرا پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ یہ تینوں بڑے دماغ دار آدمی ہیں اگر ذرا بھی تم سے بات چیت میں لغزش ہوئی تو یاد رکھو کہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ جب دیکھو کہ ان میں سے کوئی ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے تو عارف کا نام لے دینا۔ امید ہے کہ میرا نام سن کر راضی ہو جائیں گے۔ دوسری بات یہ کہ مبارک النساء بیگم کی حویلی جس میں تمہارا مطبع ہے۔ دو روز میں خالی کر کے میرے حوالے کر دو مجھے وہاں نشست کا انتظام کرنا ہوگا۔" میں نے کہا، "اور میں کہاں جاؤں؟" فرمانے لگے "میرے مکان میں آٹھ نو روز کے لئے آ جاؤ۔ تم کو تکلیف تو ہوگی مگر کیا کیا جائے۔ جب قلعہ کے لوگوں کو بلا رہے ہیں۔ تو ان رتبے کے موافق مکان کو بھی درست کرنا ہوگا۔

وہاں سے نکل کر میں اپنے گھر آیا۔ مطبع کو بند کرتے کرتے اور سامان کو سمیٹتے سمیٹتے شام ہو گئی۔ صبح کو اپنے پہننے اور اوڑھنے کا سامان لے کر حویلی سے اٹھ آیا۔ اور پھر حسب حوالہ ظلِ الٰہی اور میاں عارف اپنے وقت کے کاملین سے ملنے ملانے میں مصروف ہو گیا۔ خرچ میاں عارف نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ اور خدا خدا کر کے وہ محفل جم گئی جو دلی کی آخری محفل تھی۔ اور شاید آخری جھلک بھی، کون جانتا تھا کہ یہ مشاعرہ دلی مرحوم کا یادگار مشاعرہ ہوگا۔ دلی کے سبھی استاد جو ایک دوسرے سے چشمک رکھتے تھے، نواب زین الدین خاں اور ظلِ سبحانی کی وجہ سے راضی ہو گئے۔

میں تاریخ ابوالفداء کے ترجمے میں ایسا گتھ گیا کہ سات آٹھ روز تک گھر سے باہر ہی نہ نکلا۔ نواب زین العابدین خاں

کے شوق کی یہ حالت تھی کہ باوجود کمزوری و نقاہت کے روز صبح ہی سے باہر نکلتے تو کہیں رات کے آٹھ نو بجے جا کر ان کی صورت گھر میں دکھائی دیتی۔ اس لئے ان سے ملنا نہیں ہوا کہ کچھ حال پوچھتا۔ بہرحال یہ آٹھ دن آنکھ بند کرتے گزر گئے اور مشاعرے کی تاریخ آ ہی گئی۔ ۱۴ رجب کو شام کے ساڑھے سات بجے کے قریب میں بھی مشاعرے میں جانے کو تیار ہوا نواب صاحب کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صبح سے جو گئے ہیں تو اب تک واپس نہیں آئے۔ گھر سے نکلا تو بازار میں بہت چہل پہل پائی۔ ہر شخص کی زبان پر مشاعرے کا ذکر تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ میاں کریم الدین کون ہیں۔ کوئی کہتا کہ بھئی کوئی ہوں مگر انتظام ایسا کیا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ میں یہ باتیں سنتا اور دل میں خوش ہوتا ہوا قاضی کے حوض پر آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے دونوں جانب ٹٹیاں لگا کر اور ان میں روشنی کے گلاس جما کر رات کو دن کر دیا گیا ہے سڑک پر خوب چھڑکاؤ ہے کٹورا بج رہا ہے۔ مبارک النساء بیگم کی حویلی کے بڑے پھاٹک کو گلاسوں، قمقموں اور قندیلوں سے سجا کر گلزار آتشیں کر دیا ہے۔ صدر دروازے سے اندر کی دہلیز تک روشنی کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں میں چکا چوند آتی ہے۔ مکان کے اندر جو قدم رکھا تو ہوش جاتے رہے۔ یا اللہ یہ میرا ہی مکان ہے یا کسی شاہی محل میں آ گیا ہوں۔ گھڑی گھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتا اور کہتا "واہ میاں عارف واہ، تم نے تو کمال کر دیا! کہاں وہ بے چارے کریم الدین کا مکان اور کہاں یہ بادشاہی ٹھاٹھ۔ چونے میں ابرک ملا کر مکان میں قلعی کی گئی تھی جس کی وجہ سے در و دیوار جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ صحن کو بھروا کر تختوں کے چوکے اس طرح بچھائے گئے تھے کہ چبوترہ اور صحن برابر ہو گئے تھے۔ تختوں پر دری، چاندنی کا فرش اس پر قالینوں کا حاشیہ

ناسخ لکھنوی

امام بخش نام۔ ناسخ تخلص۔ لکھنؤ کے رہنے والے۔ مصحفی کے شاگرد۔ کہتے ہیں لاہور کے ایک مشہور و دولتمند خدا بخش نامی سوداگر کے متبنّیٰ تھے اسی سوداگر نے ان کی تعلیم و تربیت کی اور مثل اپنی اولاد کے پرورش کیا فیض آباد میں ۱۷۷۲ء میں پیدا ہوئے فارسی و عربی علمائے فرنگی محل سے حاصل کی جو لکھنؤ میں ایک بڑا تعلیمی مرکز ہے ورزش کا شوق تھا۔ قوی ہیکل اور خوش خوراک تھے۔ ناسخ شاعری میں لکھنؤ طرز کے موجد تھے اور اسی بنا پر لکھنؤ اسکول کے بانی کہلائے۔ ناسخ ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے سب سے پہلے ریختہ کے لفظ کو اردو استعمال کیا قدما کے فحش الفاظ و محاورات کو ترک کیا۔ میر اور سودا کے الفاظ کسو، کبھو، ٹک، وغیرہ سے اجتناب کیا تذکیر و تانیث کے سخت قواعد مقرر کئے غرض ناسخ نے غزل کا دائرہ وسیع کیا۔ اور الفاظ کا صحیح استعمال کرنا سکھایا وہ مقرر کردہ قواعد پر خود سختی سے عمل کرتے تھے ناسخ نے ان اصطلاحات پر اتنی توجہ دی کہ ان کے اشعار بے کیف ہو گئے لیکن انہوں نے وہ کام کیا جو کسی دوسرے اردو شاعر سے نہ ہو سکا تاریخ وفات ۱۸۳۸ء ہے

آتش لکھنوی

خواجہ حیدر علی نام آتش تخلص۔ لکھنؤ کے رہنے والے دلی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کے والد خواجہ علی بخش نواب شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد چلے گئے تھے وہیں آتش [illegible] میں پیدا ہوئے صغر سنی کی حالت میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا اسی وجہ سے مکمل تعلیم نہ ہو سکی۔ بری صحبت ملی اس لئے مزاج میں شوریدہ سری اور بانکپن آگیا نواب مرزا تقی خان ترقی کے ملازم ہو کر ان کے ہمراہ لکھنؤ گئے۔ وہاں انشا اور مصحفی کے درمیان بڑے معرکے ہو رہے تھے یہ دیکھ کر ان کو بھی شعر و سخن کا شوق ہوا اور مصحفی کی شاگردی اختیار کی اور پھر ایسے شاعر ہوئے کہ تغزل کا حق ادا کر کے استاد کا نام روشن کر دیا ضعیفی تک بانکپن اور سپاہیانہ وضع کے ساتھ رہے اسی روپیہ مہینہ بادشاہ لکھنؤ سے ملتا تھا۔ آتش بہت ہی خوددار تھے گو ان کی زندگی فقر و فاقہ میں بسر ہوئی مگر کسی امیر کی ثنا خوانی نہیں کی۔ [illegible] میں ایک دن بھلے چنگے تھے کہ یکایک موت کا جھونکا آیا اور شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے۔

پیچھے گاؤ تکیوں کی قطار، جھاڑوں، فانوسوں، ہانڈیوں، دیوار گیریوں، قمقموں، چینی قندیلوں اور گلاسوں کی اتنی بہتات تھی کہ تمام مکان بقعۂ نور بن گیا تھا۔ جو چیز تھی خوب صورت اور جو شے تھی قرینے سے۔ سامنے کی صف کے بیچوں بیچ چھوٹا سا سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ۔ گنگا جمنی چوبوں پر سبز ہی ریشمی طنابوں سے استادہ تھا۔ اس کے نیچے سبز مخمل کی کارچوبی مسند پیچھے سبز کارچوبی گاؤ تکیہ، چار چوبوں پر چھوٹے چھوٹے آٹھ چاندی کے فانوس نصب تھے۔ فانوسوں کے کنول بھی سبز، چوبوں کے سنہری کلسوں سے لگا کر نیچے تک موٹے موٹے موتیا کے گجرے سہرے کی طرح لٹکے ہوئے، بیچ کی کڑیوں کو سمیٹ کر کلابتو کی ڈوریوں سے جس کے کونوں پر منقش کے گچھے تھے۔ اس طرح چوبوں پر کس دیا گیا ہے کہ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں کے دروازے بن گئے تھے۔ دیواروں میں جہاں کھونٹیاں تھیں وہاں کھونٹیوں میں اور جہاں کھونٹیاں نہیں تھیں۔ وہاں کیلیں گاڑ کر پھولوں کے ہار لٹکا دئے تھے اس سرے سے لے کر اس سرے تک سفید چھت گیری، جس کے حاشیے سبز تھے، کھنچی ہوئی تھی۔ چھت گیری کے بیچوں بیچ موتیا کے ہار لٹکا کر لڑیوں کو چاروں طرف اس طرح کھینچ دیا گیا تھا کہ پھولوں کی چھتری بن گئی تھی۔ ایک صحنچی میں پانی کا انتظام تھا۔ کورے کورے گھڑے رکھے ہوئے تھے۔ اور شورے میں جست کی صراحیاں لگی ہوئی تھیں۔ دوسری صحنچی میں پان بن رہے تھے۔ باورچی خانے میں حقے کا تمام سامان سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ جا بجا نوکر صاف ستھرے لباس پہنے دست بستہ مؤدب کھڑے تھے۔ تمام مکان مشک و عنبر اور اگر کی خوشبو سے پڑا مہک رہا تھا۔ قالینوں کے سامنے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر حقوں کی قطار تھی۔ حقے ایسے صاف ستھرے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی دکان سے خرید ہو کر آئے ہیں۔ حقوں کے بیچ میں جو کچھ جگہ چھوٹ

گئی تھی وہاں چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھ کر ان پر خاصدان رکھ دئے تھے. خاصدانوں میں لال قند کی صافیوں میں لپٹے ہوئے پان، گلوریوں کو صافی میں اس طرح جمایا گیا تھا کہ بیچ میں ایک ایک تہہ پھولوں کی رکھی تھی. خاصدانوں کے برابر چھوٹی چھوٹی کشتیاں، ان میں الائچیاں، چکنی ڈلیاں اور بن دھنیا. مسند کے سامنے چاندی کے دو شمعدان، اندر کافوری بتیاں. اوپر ہلکے سبز رنگ کے چھوٹے کنول. شمعدانوں کے نیچے چاندی کے چھوٹے لگن. لگنوں میں عرق کیوڑہ. غرض کیا کہوں، ایک تماشا تھا. میں تو الف لیلیٰ کا ابوالحسن ہوگیا. جدھر نظر جاتی ادھر کی ہی ہو رہتی. میں اس تماشے میں محو تھا کہ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا.

سب سے پہلے مرزا کریم الدین رسا آئے. یہ سلاطین زادے ہیں. کوئی ستر برس کے پیٹے میں ہیں. استعداد علمی تو کم ہے. مگر شاعری میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتے. بہت رحمدل، خوش خلق اور سادہ مزاج ہیں. دغل فصل نام کو نہیں ہے. ملاح کہا کرتے ہیں کہ "کشتی میں چڑھے سب سے پہلے اور اترے سب سے پیچھے" انہوں نے اس مقولے کو مشاعرے سے متعلق کر دیا ہے. مشاعرے میں سب سے پہلے آتے ہیں. اور جب تک ایک ایک کر کے سب نہیں جاتے یہ اٹھنے کا نام نہیں لیتے.

نواب زین العابدین خاں صاحب نے بڑھ کر لب فرش ان کو لیا. اور جا کر ان کو بٹھا دیا. ابھی ان سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ شہزادوں کا ایک گروہ حافظ عبدالرحمٰن احسان کو جھرمٹ میں لئے آپہنچا. بھلا دلی شہر میں کون ہے جو حافظ جیو کو نہ جانتا ہو. جگت استاد ہیں. پہلے تو لال قلعہ کا قلعہ ان کا شاگرد تھا. مگر استاد ذوق کے قلعے میں قدم رکھتے ہی ان کا زور ذرا ٹوٹا. یہ بھی زمانے کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے. اور شاہ نصیر سے ٹکر لڑا چکے تھے. اس بڑھاپے میں بھی خم ٹھونک کر سامنے آگئے، اور مرتے دم تک

نظیر اکبرآبادی

ولی محمد نام. نظیر تخلص (اکبرآباد (آگرہ) کے رہنے والے والد کا نام محمد فاروق ۱۷۳۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے احمد شاہ ابدالی جب دہلی پر حملہ آور ہوا تو آگرہ چلے گئے اور تاج محل کی محبت میں وہیں کے ہو گئے عربی اور فارسی میں معمولی شُدبُد رکھتے تھے جوانی میں مزاج میں رنگینی غالب تھی. چنانچہ جس قدر فحش کلام ہے وہ اسی دور کی یادگار ہے آخر عمر میں تائب ہو کر صوفی ہو گئے اسی لئے اس زمانے کا کلام بے حد موثر ہے. ڈاکٹر فیلن کا قول ہے کہ نظیر ہی اردو کا وہ اکیلا شاعر ہے جس کی شاعری اہل فرنگ کے معیار کے مطابق بھی شاعری ہے اس نے اردو کے لئے وہ کام کیا جو چاسر اور شیکسپیئر نے انگریزی ادب کے لئے کیا نظیر کا رنگ تمام شعرا سے جدا ہے علاوہ ازیں سلیس اور سادہ. ہندوستان کی عام معاشرت اور رسم و رواج ان کی شاعری کے خاص عناصر ہیں اسی وجہ سے وہ ہر دلعزیز ہوئے عمر دراز پائی تھی. ۱۸۳۰ء میں فالج کا شکار ہوئے اور آگرہ میں انتقال کیا.
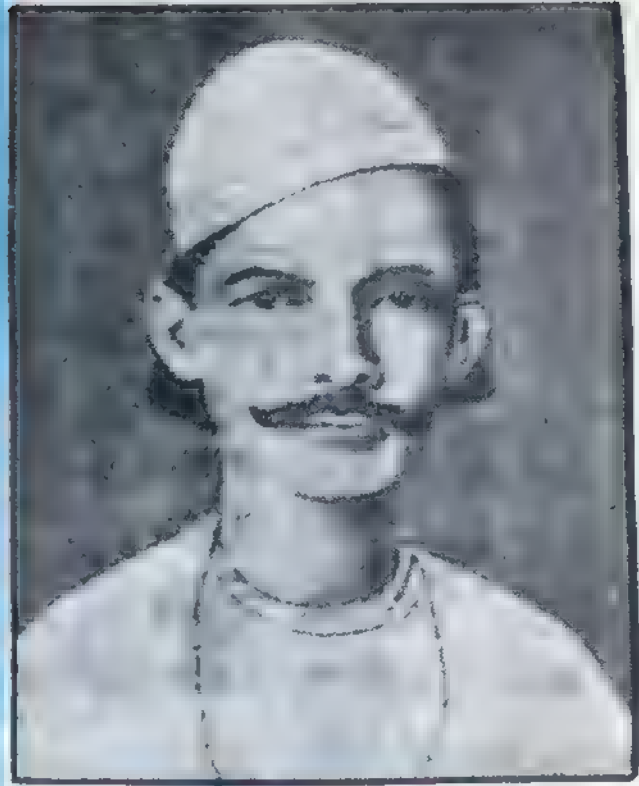
فردوسیِ ہند میر انیس لکھنوی

میر ببر علی نام۔ انیس تخلص۔ میر مستحسن خلیق کے صاحبزادے، میر حسن دہلوی کے پوتے۔ ان کے بزرگ ایران سے دہلی آئے لیکن دادا میر حسن دہلی سے فیض آباد جاکر آباد ہوئے۔ میر انیس ۱۸۰۲ء میں وہیں پیدا ہوئے لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی شاعری پشتوں سے میراث میں چلی آتی تھی۔ شبیر کی مداحی میں ابتدا میں غزل گوئی کا شوق تھا۔ مگر اپنے والد کے کہنے سے مرثیہ گوئی پر توجہ فرمائی اور اس کو چار چاند لگائے۔ امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے قیامت خیز واقعات کو مرثیے کی صورت میں نظم کرنے والے میر انیس کا مرتبہ اردو شعرا کی صف اول میں نہایت ارفع و اعلیٰ ہے۔ مرثیہ میں سلاست اور روانی جو میر انیس نے پیدا کی وہ ان سے پہلے کسی مرثیہ گو کو نصیب نہ ہوئی۔ میر انیس بیان کی سادگی، زبان کی شیرینی، روزمرہ کی صفائی بندش کی خوبی میں بے مثل، اور مصوری و واقعہ نگاری میں لاجواب اور حفظِ مراتب میں بے نظیر تھے۔ نازک خیالی ان کا حصہ تھا۔ ۷۲ سال کی عمر میں ۱۸۷۴ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ ♦ ♦ ♦

مقابلے سے ہٹنا تھا نہ ہٹے۔ کوئی نوّے برس کی عمر تھی۔ کمر دوہری ہونے سے قد کمان بن گیا تھا۔ اپنے زمانے کے علم باعمور تھے لیکن غزل اس کڑاکے سے پڑھتے تھے کہ تمام مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ ان کی استادی کا سکہ ایک زمانے سے تمام دلّی پر بیٹھا ہوا تھا۔ نواب صاحب نے ان سب کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور اپنی اپنی جگہ لاکر بٹھایا۔ ابھی ان کو بٹھانے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ منشی محمد علی تشنہ چم ننگے، نشے میں چور جھومتے جھامتے اندر آئے۔ نوجوان آدمی ہیں مگر عجب حال ہے۔ کبھی برہنہ پڑے پھرتے ہیں کبھی کپڑے پہنے خاصے بھلے آدمی بن جاتے ہیں۔ کسی کے شاگرد نہیں اور پھر سب کے شاگرد ہیں۔ کبھی حکیم آغا خاں عیش سے اصلاح لینے لگتے ہیں۔ کبھی استاد ذوق کے پاس اصلاح کے لئے غزل لے جاتے ہیں۔ ذہن بلا کا پایا ہے۔ لاکھوں شعر زبان کی نوک پر ہیں۔ شعر سنا اور یاد ہوا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی کی غزل سنی اور یاد کرلی۔ پھر مشاعرے میں خود اپنے نام سے وہ غزل پڑھ ڈالی۔ اور وہ بیچارہ منہ دیکھتا رہ گیا۔ نواب صاحب آگے بڑھے۔ پوچھا "منشی جی یہ کیا رنگ ہے؟" کہنے لگے۔ "اصلی رنگ۔ مشاعرہ کب شروع ہوتا ہے۔" نواب صاحب بولے "ابھی شروع ہوتا ہے۔ آپ بیٹھئے تو سہی" خیر ایک کونے میں جاکر بیٹھ گئے۔ میاں عارف نے ان پر ایک دوشالہ لاکر ڈال دیا انہوں نے اٹھا کر پھینک دیا۔ غرض جس طرح ننگے آئے تھے اسی طرح بلا تکلف بیٹھے رہے۔ اس کے بعد تو لوگوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا۔ جو آتا اس کا استقبال نواب صاحب کرتے، اور لالاکر بٹھاتے۔ حکیم مومن خاں آئے۔ ان کے ساتھ آزردہ، شیفتہ، صہبائی اور مولوی مملوک علی تھے۔ مولوی صاحب مدرسہ دہلی میں مدرس اول ہیں۔ عجیب باکمال آدمی ہیں۔ مدرسے میں ان کی ذات بابرکات سے وہ فیض ہوا ہے کہ شاید ہی کسی زمانے میں کسی استاد سے ہوا ہو۔ بہت پابند شرع ہیں۔ اس لئے خود شعر نہیں کہتے

مگر سمجھتے ایسا ہیں کہ ان کا کسی شعر کی تعریف کر دینا گویا اس کو دوام کی سند دینا ہے. کوئی ۶۰ سال کا سن ہے. رہنے والے تو ناگوتے کے ہیں. مگر مدتوں سے دہلی میں آ رہے ہیں. دن رات پڑھنے پڑھانے سے کام ہے. مشاعروں میں کم ہی جاتے ہیں. یہاں شاید مولانا صہبائی ان کو اپنے ساتھ گھسیٹ لائے.

مولوی صاحب میرے بھی استاد تھے. میں بھی آگے بڑھا. آداب کیا. فرمانے لگے، "میاں کریم الدین، میں تم کو ایسا نہیں سمجھتا تھا. تم نے تو دہلی والوں کو مات کر دیا. سبحان اللہ. سبحان اللہ! کیا انتظام ہے. دیکھ کر جی خوش ہو گیا. خدا تمہیں اس سے زیادہ حوصلہ دے." میں نے عرض کی۔ "مولوی صاحب میں بھلا کیا اور میری بساط کیا. یہ سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں کا ہے." فرمانے لگے، "بھئی یہ بھی اچھی ہوئی. وہ کہیں کہ سارا انتظام کریم الدین خاں کا ہے. تم کہو کر نواب صاحب کا ہے. چلو 'من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو'." ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مرزا نوشہ پالکی میں سے اترے. نیر، علائی، سالک اور حزیں ان کے ہمراہ تھے. مرزا غالب مومن خاں کی طرف بڑھے. مصافحہ کیا اور کہا، "بھئی حکیم صاحب آج محمد قادر خاں محزوں کا عظیم آباد سے خط آیا تھا. تم کو بہت بہت سلام لکھا ہے. معلوم نہیں کہ کیوں یکا یکی پٹنہ چلے گئے. خواجہ میر درد کے پوتے ہو کر ان کا دہلی کو چھوڑ کر جانا ہم کو تو پسند نہ آیا. اب یاروں کو روتے ہیں. دیکھنا کیا درد بھرا شعر لکھا ہے ؎

نہ تو نامہ ہے نہ پیغام زبانی آیا
آہ محزوں مجھے یارانِ وطن بھول گئے

"ارے بھئی رات تو کافی آ گئی ہے. ابھی تک میاں ابراہیم نہیں آئے. آخر یہ مشاعرہ شروع کب ہو گا؟" حکیم صاحب کچھ جواب دینے ہی والے تھے کہ دروازے کے پاس 'السلام علیکم' کی آواز آئی. مولانا صہبائی نے کہا، "لیجئے مرزا صاحب وہ استاد کے شان کے

ذوقؔ دہلوی

شیخ محمد ابراہیم نام۔ ذوقؔ تخلص۔ ۱۷۸۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ذوقؔ کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی ـــ تھے ابتدائی تعلیم معمولی ہوئی۔ لیکن اپنے کثرتِ مطالعہ سے سب کچھ حاصل کر لیا حافظ غلام رسول شوقؔ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا بعد میں شاہ نصیرؔ دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔ شاہ نصیرؔ شاعری میں بہادر شاہ ظفرؔ آخری تاجدارِ دہلی کے استاد تھے جب شاہ نصیرؔ دکن چلے گئے، تو بہادر شاہ نے ذوقؔ کو اپنا استاد بنا لیا بادشاہ کے استاد ہونے سے ذوقؔ کو اور بھی چار چاند لگ گئے۔ ذوقؔ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے زبان کو خوب صاف کیا اور اس پر جلا دی وہ الفاظ کی نشست اور ان کے مناسب استعمال سے کما حقہٗ واقف تھے محاورات اور امثال کے استعمال میں وہ اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ۱۸۵۴ء میں دہلی میں انتقال ہوا۔ مرنے سے چند گھنٹے پیشتر یہ شعر کہا ؎

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گذر گیا ٭ کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

مومن دہلوی

حکیم مومن خاں نام۔ مومن تخلص۔ دہلی کے رہنے والے ۱۸۰۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حکیم غلام نبی خان تھا دادا نامدار خاں کشمیر سے آئے تھے اور بحیثیت شاہی حکیم مقرر ہوئے۔ مومن کے والد کو شاہ ولی اللہ دہلوی کے خاندان سے بڑی ارادت تھی چنانچہ مومن کا نام شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے رکھا اور شاہ عبدالقادر صاحب سے درس ملا کامل طب ہونے کے علاوہ علم نجوم میں بھی ان کو ملکہ تھا تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل تھا۔ مومن نے غزل کا پورا حق ادا کیا ہے اور صحیح معنوں میں غزل کہی ہے نہ فلسفہ حکمت کی ثقالت ہے نہ عرفان و تصوف کی پرواز گویا ان کا کلام گذری ہوئی حکایت یا منظوم سرگزشت ہے جس میں اسلوب بیان نے چار چاند لگا دئے ہیں یہی ان کے کلام کی خصوصیت ہے انہوں نے اپنے انداز بیان میں عجیب ندرت اور نازک خیالی سے کام لیا ہے۔ مومن نے کبھی کسی کی مدح نہیں کی نہ کبھی رؤسا کے دربار میں حاضر ہوئے دہلی میں ۱۸۵۲ء میں انتقال کیا۔

۔۔ لیجئے حافظ ویران صاحب آگئے۔ اور وہ آپ کے دوست ہُدہُد صاحب بھی ساتھ ہیں۔ دیکھئے آج کس کے چونچ مارتے ہیں۔ میاں ہدہد کا نام عبدالرحمان ہے۔ پورب کے رہنے والے ہیں۔ دلی میں آکر حکیم آغا خاں عیش کے ہاں ٹھہر گئے ہیں۔ اُن کے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ حکیم صاحب ہی کے مشورے سے ہدہد تخلص اختیار کیا۔ ان ہی کی تجویز سے بگّی داڑھی رکھی۔ مُرنڈا کر عمامہ باندھا اور اس طرح خاصے کھٹ بڑھئی ہو گئے۔ ان ہی کے ذریعے سے دربار میں پہنچے۔ اور حضور پُر نور سے شہیر الملک ہدہد الشعرا منقار جنگ بہادر خطابات پائے۔ شروع شروع میں تو ان کے ظریفانہ کلام سے مشاعرہ چمک جاتا تھا۔ مگر بعد میں انہوں نے استادانِ فن پر حملے شروع کر دیئے۔ کہتے تو یہ ہیں کہ حکیم صاحب کے اشارے سے ایسا کیا۔ لیکن کچھ بھی ہو آخر سب کو ان سے کچھ نفرت سی ہو گئی، اور اب بجائے دوسروں کا مذاق اڑانے کے خود ان کا مذاق اڑ جاتا تھا۔ حکیم صاحب تو علانیہ اُن کی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ خود ان میں اتنی قابلیت نہیں تھی جو دلی والوں کی پھبتیوں کو سنبھال سکتے۔ اس لئے تھوڑی دیر میں ٹھنڈے ہو کر رہ جاتے۔ مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں پر ہمیشہ منہ آتے تھے۔ اسی لئے مرزا نوشہ مولانا صہبائی کے منہ سے 'آپ کے دوست' کا لفظ سن کر مسکرائے اور کہا، "بھئی، میں تو ان کے منہ کیوں لگنے لگا۔ مگر آج دیکھا جائے گا۔ 'ہر فرعونے راموسیٰ' سنتا ہوں کہ ہمارے میر صاحب مولوی ہدہد کی شان میں آج کچھ فرمانے والے ہیں۔ ان کے سامنے اگر یہ 'شہبازِ سخن' ٹک گئے تو میں سمجھوں گا کہ بڑا کام کیا۔" غرض یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ استاد ذوق بھی اندر آگئے۔ تمام قلعہ ان کے ساتھ آیا تھا۔ صاحب سلامت کر کے سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ قلعہ والوں اور ان لوگوں میں جن کا تعلق قلعہ سے ہے سلام کرنے کا عجیب طریقہ ہے۔ سیدھے

امیر مینائیؒ

منشی امیر احمد مینائی نام امیر تخلص ۔ مولوی کرم محمد لکھنوی کے صاحبزادے ۱۸۲۸ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے نسبتاً حضرت مخدوم شاہ مینا قدس سرہٗ سے تعلق ہے جن کا مزار لکھنؤ میں ہے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے اور بعد میں علمائے فرنگی محل سے حاصل کی طبیعت بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف مائل تھی چنانچہ اسیر کے شاگرد ہوئے اس وقت شاہ نصیرالدین کا زمانہ تھا اور لکھنؤ فضل و کمال کا مرکز بنا ہوا تھا ایک طرف آتش و ناسخ کے درمیان مناظرے ہو رہے تھے دوسری طرف انیس و دبیر کے معرکے ان تمام چیزوں نے امیر کی شاعری کو بہت جلد ترقی کے منازل طے کرا دیے اسی وقت سے امیر کی شہرت ہونی شروع ہوئی جب ۱۸۵۷ء کی قیامت آخریں شورش مٹ گئی اور اودھ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ تو آپ کو نواب یوسف علی خاں والئ رامپور نے طلب کیا پھر نواب کلب علی خاں کی حکومت ہوئی رامپور میں ۴۳ برس عزت آبرو سے بسر کئے۔ پھر حیدرآباد دکن چلے گئے اور ۱۹۰۰ء میں وہیں انتقال کیا۔

کھڑے ہو کر دایاں ہاتھ اس طرح کان تک لے جاتے ہیں جس طرح کوئی نماز کی نیت باندھتا ہے۔ اور پھر چھوڑ دیتے ہیں۔ چلو سلام ہو گیا۔ باقی سب لوگوں سے معمولی سلام کرتے ہیں۔

استاد ذوق سب سے مل کر شامیانے کے دائیں طرف بیٹھ گئے۔ مشاعرے میں شعرا کو سلیقے سے بٹھانا بھی ایک فن ہے خوب ذہن احادیں کی تعریف کروں گا کہ جس کو جہاں چاہا بٹھا دیا۔ اور پھر اس طرح کہ کسی کو نہ کوئی شکوہ نہ شکایت۔ اگر کوئی ایسی جگہ بیٹھ جاتا جہاں ان کے خیال میں اس کو نہ بیٹھنا چاہئے تھا تو بجائے اس کے کہ اس کو وہاں سے اٹھاتے خود ایسی جگہ جا بیٹھتے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہتے "ارے بھئی، ذرا اک بات سننا۔" وہ آکر ان کے پاس بیٹھ جاتا۔ اس سے باتیں کرتے رہتے۔ اتنے میں کوئی ایسا شخص آجاتا جس کو اس خالی جگہ کے لئے موزوں سمجھتے اس سے کہتے، تشریف رکھئے وہ خالی جگہ ہے" جب وہ جگہ بھر جاتی تو کسی بہانے سے اٹھ جاتے۔ اور اس طرح دو نشستوں کا انتظام ہو جاتا۔ شہزادوں کا سلسلہ سے بٹھانا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ ذرا سی بات پر بگڑ کر اٹھ جاتے ہیں کہ واہ، ہم اور یہاں بیٹھیں۔" پھر لاکھ منایئے، وہ بھلا کیا ماننے والے ہیں۔ ان جھگڑوں کو استاد ذوق خوب سمجھتے تھے۔ اس لئے اپنے ساتھ والوں کا انتظام انہوں نے خود کر لیا۔ مگر اس طرح کہ کسی کو یہ خیال بھی نہیں ہوا کہ یہ محفل کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کسی سے کہتے۔ "صاحب عالم ادھر آیئے۔" کسی سے کسی خاص جگہ پر اشارہ کر کے کہتے، "بیٹھو بھئی بیٹھو۔"

غرض تھوڑی دیر میں پوری مجلس جم گئی۔ نشست کا یہ انتظام تھا کہ میر مشاعرہ کے دائیں طرف وہ لوگ تھے جن کا تعلق قلعے سے تھا۔ اور بائیں طرف شہر کے دوسرے استاد اور ان کے شاگرد۔

غالب نمبر

[illegible]

میر امن ۱۷۳۳ء - ۱۱۴۶ھ میں بعہد محمد شاہ دہلی پیدا ہوئے ان کے بزرگ سلطنت مغلیہ میں ہمایوں کے دور سے ہر بادشاہ کے عہد میں ممتاز عہدوں پر فائز رہے تھے احمد شاہ ابدالی کے حملہ ۱۷۶۱ء سے سلطنت کی تباہی اور دلی کی بربادی کے بعد میر امن تلاشِ معاش میں کلکتہ چلے گئے اور وہیں بعمر ستر سال ۱۸۰۳ء - ۱۲۱۷ھ میں وفات پائی۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ (جن کو اردو زبان سے عشق تھا اور جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے پرنسپل تھے) کی فرمائش پر میر امن نے ۱۸۰۱ء میں قصہ "چہار درویش" (جو امیر خسرو دہلوی نے فارسی میں لکھا تھا) کا اردو میں ترجمہ کیا۔ میر امن نے نثر کی طرف ایسی توجہ دی اور اس میں ایسی ایسی گلکاریاں کیں کہ لوگ نثر سے دلچسپی لینے لگے۔

[illegible]

۱۷۸۰ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ والد کا نام اصغر علی بیگ تھا۔ ۱۸۲۴ء میں غازی الدین حیدر، شاہ اودھ نے جلاوطن کر دیا تو سرور کانپور چلے گئے۔ لیکن نصیر الدین حیدر نے پھر لکھنؤ بلا لیا۔ بعد میں واجد علی شاہ نے سرور کو اپنا درباری شاعر بنا لیا۔ جب ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ ضبط ہوئی اور واجد علی شاہ جلاوطن ہو کر مٹیا برج کلکتہ میں نظر بند کئے گئے تو سرور کو مہاراجہ بنارس نے اپنے پاس بلا لیا۔ اور وہیں ۱۸۶۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ سرور نے ۱۸۲۴ء میں "فسانۂ عجائب" لکھی۔ یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے اور اسی سے ان کا نام زندہ ہے۔ "فسانۂ عجائب" کی عبارت نہایت پُرتکلف مقفیٰ و مسجع ہے۔ ہر جگہ رنگینی اور دلکشی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ سرور صاحب کا بہت بڑا کمال تھا ہے۔

استاد ذوق کو آئے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ مرزا فتح الملک ہوادار میں آ پہنچے۔ ان کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ دہلوی تھے۔ میاں داغ کی کوئی سولہ سترہ برس کی عمر ہوگی۔ رنگت تو بہت کالی ہے مگر چہرے پر غضب کی نراہٹ ہے۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں۔ ستواں ناک، کشادہ پیشانی۔ ہوادار فرش سے ملا کر لگا دیا گیا پہلے میاں داغ اترے اور اتر کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ان کے بعد مرزا فتح الملک اترے۔ ان کا نیچے قدم رکھنا تھا کہ سب سرد قد کھڑے ہو گئے۔ چار چوبدار سبز کھڑکی دار پگڑیاں باندھے نیچی نیچی سبز بانات کی چپکنیں پہنے، سُرخ شالی رومال کمر سے لپیٹے ہاتھوں میں گنگا جمنی عصا اور مورچھل لئے ہوادار کے پیچھے پیچھے تھے۔ ادھر مرزا فخرو نے فرش پر قدم رکھا ادھر عصا بردار تو سامنے آ گئے اور مورچھل بردار پیچھے چلے گئے اس سلیقہ سے یہ جلوس آہستہ آہستہ شامیانے تک آیا۔ مرزا فخرو نے شامیانے کے قریب کھڑے ہو کر سب کا سلام لیا۔ پھر چاروں طرف نظر ڈال کر کہا۔ "اجازت ہے؟" سب نے کہا۔ "بسم اللہ!" اجازت پا کر یہ شامیانے میں گئے اور سب کو سلام کر کے بیٹھ گئے۔ دوسرے سب لوگ بیٹھنے کی اجازت کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان سب کی طرف نظر ڈال کر کہا۔ "تشریف رکھیے۔" سب لوگ سلام کر کے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ استاد ذوق نے داغ کو اپنے قریب ہی ایک جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ وہاں جا بیٹھے۔ مورچھل بردار شامیانے کے پیچھے اور عصا بردار سامنے کی سنت کی پشت پر جا کر کھڑے ہوئے۔ جب یہ انتظام سب ہو گیا۔ تو نواب زین العابدین خاں آگے بڑھے، شامیانے کے پاس جا کر تسلیمات بجا لائے اور دو زانو ہو کر چپکے چپکے صاحب عالم سے کچھ باتیں کیں پھر اٹھ کر اپنی جگہ پر جا بیٹھے ان کے اٹھ کر چلے جانے کے بعد نواب فتح الملک نے دونوں ہاتھ فاتحہ کو اٹھائے۔ ساتھ ہی اہل مجلس نے ہاتھ اٹھائے۔ فاتحہ خیر کے بعد صاحب عالم نے فرمایا۔ " اے خوش نوایانِ چمن

غالب نمبر

دہلی! میری کیا بساط ہے جو آپ جیسے استادانِ فن کے ہوتے ہوئے میر مشاعرہ بننے کا خیال بھی دل میں لا سکوں، صرف حضرت پیر و مرشد کے فرمان کی تعمیل میں حاضر خدمت ہو گیا ہوں ورنہ کہاں میں اور کہاں ایسے بڑے مشاعرے کی میر مجلسی! مجھو! اس مشاعرے کی ایک خصوصیت تو آپ کو معلوم ہے کہ اس کے لئے کوئی 'طرح' نہیں دی گئی۔ اس کی دوسری خصوصیت آپ یہ پائیں گے کہ بجائے ایک شمع کے دو شمعیں گردش کرینگی جس طرح 'طرح' کے نکل جانے نے ایک دوسرے کے مقابلے میں فخر و مباہات کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ اسی طرح دو شمعوں کی وجہ سے پڑھنے میں تقدیم و تاخیر سے جو خیالات طبیعتوں کو مکدر کرتے تھے۔ وہ بھی رفع ہو جائیں گے۔ مشاعرے کی ابتدا کرنے اور ختم کرنے کا خیال بھی اکثر دلوں میں فرق ڈالتا ہے۔ لیکن اس مشاعرے میں میں نے انتہا کو ابتدا کر دیا ہے۔ چنانچہ حضرت ظلِ سبحانی کے کلام معجز نظام سے مشاعرے کی ابتدا ہوگی اور اس کے بعد ہی میں اپنی غزل عرض کر کے ابتدا اور انتہا کے فرق کو مٹا دوں گا۔" یہ کہہ کر مرزا فخرو نے ہاتھ کا اشارہ کیا دونوں چوبدار سامنے کھڑے تھے۔ دونوں شمعیں اٹھا کر ان کے سامنے لائے۔ انہوں نے بسم اللہ کہہ کر فانوس اتارے اور شمعیں جلا کر فانوس چڑھا دیئے۔ چوبدار نے شمعوں کو لے جا کر لگنوں میں رکھ دیا۔ اور سیدھے کھڑے ہو کر مرزا فخرو کی طرف دیکھا۔ انہوں نے گردن سے اشارہ کیا۔ اشارہ پلتے ہی دونوں چوبداروں نے باآوازِ بلند کہا، "حضرات! مشاعرہ شروع ہوتا ہے۔"

اس آواز کا سننا تھا کہ ایک سناٹا سا ہو گیا۔ تلنے والوں نے بٹیریں تھیلوں میں بند کر کے تکیوں کے پیچھے رکھ دیں۔ نوکروں نے جھٹ پٹ حقے سامنے سے ہٹا دیئے اور ان کی جگہ سب کے سامنے اگالدان، خاصدان اور بن دھنئے کی طشتریاں رکھ اپنی

سر سید احمد

سید احمد خاں نام، دہلی وطن، ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۹۸ میں علی گڑھ میں وفات پائی۔ والد کا نام میر تقی تھا۔ سرسید کو عزم اور استقلال کا جوہر اپنی والدہ سے ورثہ میں ملا۔ اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد جب مسلمانوں پر مُردنی چھا گئی تھی اور قوم کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ اس وقت سرسید نے مایوس اور افسردہ قوم میں نئی رُوح پھونکی۔ سرسید نے مسلمانوں کے لئے تعلیم کو ترقی کا زینہ قرار دے کر ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں ایک درسگاہ 'مدرستہ العلوم' قائم کی جو آج مسلم یونیورسٹی کے سے مشہور ہے۔ وہ قوم کے سچے خادم، ملک کے خیر خواہ اور اپنی دھن کے پکے رہنما تھے۔ سرسید اُردو کے بھی بڑے محسن ہیں۔ انہوں نے اردو میں سب سے پہلے 'مضمون نگاری' کی ابتدا کی اور انشا پردازی کو نیا اسلوب بخشا۔

داغ دہلوی

نواب مرزا خان نام۔ فصیح الملک خطاب۔ داغ تخلص۔ دہلی کے رہنے والے ۱۸۳۱ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے والد کا نام نواب شمس الدین خاں۔ چھ سال کے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے ان کی والدہ نے فتح الملک مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخرو ولی عہد بہادر شاہ ظفر سے نکاح کر لیا جس کی وجہ سے لال قلعہ دہلی میں رہائش ہوئی اور بہترین تعلیم و تربیت پائی بہادر شاہ ظفر داغ پر اس درجہ مہربان تھے کہ اصلاح شعر و سخن کیلئے اپنے استاذ ذوق کے سپرد کیا۔ ۲۵ سال کی عمر تھی کہ مرزا فخرو نے انتقال کیا۔ لال قلعہ کی رہائش ختم ہوئی اس کے بعد غدر ہو گیا تو رامپور چلے گئے یہاں نواب کلب علی خان نے ان کی بڑی قدر کی نواب کے انتقال کے بعد تمام شعرائے باکمال کا اجتماع درہم برہم ہو گیا تو داغ نے حیدر آباد دکن کا رخ کیا اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں کے استاد مقرر ہوئے فصیح الملک کا خطاب پایا۔ داغ خوش گوئی میں بے نظیر اور بے ساختگی میں بےمثال تھے ۱۹۰۵ء میں حج کے دن داغ نے بعارضہ فالج حیدر آباد دکن میں انتقال کیا۔

اپنی جگہ جا کھڑے ہوئے۔ اتنے میں بارگاہ جہاں پناہی کا خواصی بادشاہ سلامت کی غزل لئے ہوئے قلعے سے آیا۔ اس کیساتھ کئی نقیب تھے۔ وہ خود شمع کے قریب آ کر تسلیمات بجا لایا اور غزل پڑھنے کی اجازت چاہی۔ مرزا فخرو نے گردن کے اشارہ سے اجازت دی۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ نقیبوں نے آواز لگائی۔ "حاضرین! حضرت ظلِ سبحانی صاحبقران ثانی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہٗ کا کلام معجز نظام پڑھا جاتا ہے۔ نہایت ادب کے ساتھ گوش دل سے سماعت فرمائیے۔"

نقیب کی آواز کے ساتھ ہی سب اہلِ محفل دوزانو ہو سنبھل کر بیٹھ گئے اور پاسِ ادب سے سب نے گردنیں جھکا لیں۔ خواصی نے بادشاہ سلامت کی غزل خریطے میں سے نکالی، بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا۔ اور بلند آواز سے سوز کے سُروں میں پڑھنا شروع کیا۔ الفاظ کی نشست، زبان کی خوبی مضمون کی آمد اور سب سے زیادہ پڑھنے والے کے گلے نے سماں باندھ دیا۔ ایک کیفیت تھی کہ زمین سے آسمان تک چھائی ہوئی تھی۔ کسی کو تعریف کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ استادانِ فن ہر شعر پر جھومتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے منہ سے سبحان اللہ سبحان اللہ کے الفاظ بہت نیچی آواز میں نکل گئے ورنہ ساری مجلس پر ایک عالمِ بےخودی طاری تھا۔ مقطع پر تو یہ حال ہوا جیسے کسی نے سب پر جادو کر دیا ہو ہر شخص وجد میں جھوم رہا تھا۔ باصرار تمام کئی کئی دفعہ مقطع پڑھوایا اور مضمون اور زبان کی چاشنی کا لطف اٹھایا۔ لیجئے، آپ بھی پڑھئے اور زبان کے مزے لیجئے۔

نہیں عشق میں اسکا تو رنج ہمیں کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غمِ عشق تو اپنا رفیق رہا، کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا
تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر، تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

ہمیں ساغر بادہ کے دینے ہیں، اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہد نشاط، یہ دور طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

لگے یوں تو ہزاروں ہی تیر ستم، کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
دیے نازو کرشمہ کی تیغ دودم، لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا، ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

غزل پڑھنے کے بعد خواصی نے کاغذ مرزا فخرو کے ہاتھ میں دیا۔ زرافشاں کاغذ پر خود حضرت ظل اللہ کے قلم کی لکھی ہوئی غزل تھی۔ خط ایسا پاکیزہ تھا کہ آنکھوں میں کھبا جاتا تھا۔ مرزا فخرو نے کاغذ ادھر ادھر دیکھا۔ مملوک العلی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "صاحب عالم! ہمارا کیا منہ ہے جو ہم حضرت ظل سبحانی کی غزل کی جیسی چاہیئے ویسی تعریف کرسکیں البتہ ان نوازشات شاہی کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو حضرت پیر و مرشد نے غزل بھیج کر شرکائے مشاعرہ پر مبذول فرمائی ہیں۔ بارگاہ جہاں پناہی میں ہمارا ناچیز شکریہ پیش کر کے ہماری عزت افزائی کی جائے۔ مرزا فخرو نے خواصی کو روکا اور کہا، "جانے سے پہلے صاحب عالم و عالمیان حضرت ولی عہد بہادر کی غزل بھی پڑھتے جاؤ۔ چلتے چلتے مجھے عنایت کی تھی۔ اور فرمایا تھا کہ کسی خوش گلو شخص سے پڑھوانا۔ بھلا تم سے زیادہ موزوں اور کون شخص مل سکتا ہے۔ یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کر خواصی کو دیا۔ اس نے آداب کر کے کاغذ لیا اور وہیں بیٹھ کر یہ غزل سنائی۔

دل سے لطف و مہربانی اور ہے
مہربانی کی نشانی اور ہے

قصۂ فرہاد و مجنوں اور ہے
عشق کی میرے نشانی اور ہے

رو کئے سے کب مرے رکتے ہیں اشک
بلکہ موتی خوں فشانی اور ہے

نذیر احمد

۱۸۳۶ء میں بجنور میں پیدا ہوئے، دہلی کالج میں تعلیم پائی اور دہلی کو ہی اپنا وطن بنا لیا۔ اور یہیں ۱۹۱۲ء میں وفات پائی۔ انہوں نے اردو ناول کو مہذب اور سنجیدہ رنگ میں پیش کیا۔ ان کا پایہ اردو نثر میں بہت بلند ہے اور ان کا شمار آج بھی چوٹی کے نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ مولوی نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ ان کے تمام ناول اصلاحی و معاشرتی ہیں۔ 'مراۃ العروس'، ان کا پہلا ناول ہے۔ نذیر احمد نے دہلی کے شریف گھرانوں کی گھریلو زندگی کے بڑے کامیاب نقشے کھینچے ہیں۔ اور خاص دہلی کی ٹکسالی زبان اور محاورے استعمال کئے ہیں۔ وہ عورتوں کے مکالمے کے بادشاہ ہیں۔ نذیر احمد کی بے نظیر قدرت بیان، وسیع ذخیرۂ الفاظ اور جدت خیال اردو لٹریچر کی جان ہیں۔ نذیر احمد کا عظیم الشان کارنامہ قرآن کریم کا ترجمہ ہے۔

سجاد حسین

پیدائش ۱۸۵۶ء تعلیم ایف اے تک، ۱۸۷۷ء میں اپنا مشہور اخبار 'اودھ پنچ' لکھنؤ سے جاری کیا۔ زندہ دلی انکی گھٹی میں پڑی تھی۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں اکبر آبادی نواب آزاد، ظریف اور رتن ناتھ سرشار جیسے زندہ دل سحر بیان اور جادو قلم نامہ نگار ملے۔ جنہوں نے 'اودھ پنچ' کو چار چاند لگا دیئے۔ سجاد حسین کی تحریر کا ایک خاص انداز تھا، جس میں واقفیت اور معلومات کے ساتھ لطائف و ظرائف بکثرت ہوتے تھے۔ ان کی تحریر میں بے باکی اور آزادی خیال حد سے زیادہ تھی، جو کہتے تھے ہانکے پکارے کہتے تھے۔ سجاد حسین نے ظریفانہ ناول نگاری کی بنیاد ڈالی۔ ان کے ناولوں میں جدت طرازی بھی ہے۔ اور ظرافت نگاری بھی۔ 'حاجی بغلول' ان کا شاہکار ناول ہے۔ ۱۹۱۵ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

ہم سے اے دارا وہ کب ہوتے ہیں صاف
ان کے دل میں بدگمانی اور ہے

غزل تو بہت پھس پھسی تھی۔ ولی عہد بہادر کی غزل تھی۔ بھلا کس کا جگرا تھا جو تعریف نہ کرتا، البتہ غالب اور مومن بالکل چپ بیٹھے رہے۔ بعض قلعے والوں کو برا بھی معلوم ہوا۔ مگر ان دونوں کو خوب سمجھتے تھے کہ یہ سچی تعریف کرنے والے لوگ ہیں۔ ولی عہد تو ولی عہد اگر بادشاہ سلامت کی بھی کمزور غزل ہو تو گردن تک نہ ہلائیں۔ القصہ خواصی تو غزل پڑھ کر رخصت ہوا اور اب حاضرین جلسہ کے غزل پڑھنے کی نوبت آئی۔

مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا۔ اس نے دونوں شمعیں لا شامیانے کے سامنے رکھ دیں۔ صاحب عالم نے اپنی غزل نکالی اور ادھر ادھر نظر ڈال کر اور گردن کو ذرا جھکا کر کہا۔ "بھلا میری کیا مجال ہے کہ آپ جیسے کاملین فن کے مقابلے میں کچھ پڑھنے کا دعویٰ کروں۔ البتہ جو کچھ برا بھلا کہا ہے وہ بنظر اصلاح عرض کرتا ہوں۔

غم وہ کیا ہے جو جاں گزا نہ ہوا — درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا
حال کھل جائیں غیر کے ساتھ — پر کروں کیا کہ تو مرا نہ ہوا
درد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر — بات کیا جس میں کچھ مزا نہ ہوا
وہ تو ملتا، پر اے دلِ کم ظرف — تجھ کو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا
شکوۂ یار اور زبانِ رقیب — کھیل ٹھیرا کوئی گلہ نہ ہوا
تم رہو اور مجمعِ اغیار — میرا کیا ہے، ہوا ہوا نہ ہوا

پھر تمہارے ستم اٹھانے کو
زہر اچھا ہوا برا نہ ہوا

مرزا فخرو کی آواز اونچی تو نہ تھی، مگر پڑھنے میں ایسا درد تھا کہ سن کر دل بے قابو ہو جاتا تھا۔ سارا مشاعرہ واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور سے گونج رہا تھا۔ تیسرے شعر پر مرزا غالب نے اور پانچویں پر حکیم مومن خاں نے ایسے جوش سے واہ واہ کی کہ صف سے آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو اپنی غزل پڑھتے رہے، مگر ان دونوں کو ان ہی دو شعر کی رٹ لگی رہی۔ پڑھتے اور مزے میں آکر جھومتے۔ جب غزل ختم ہوئی تو مرزا نوشہ نے کہا، "سبحان اللہ صاحب عالم، سبحان اللہ! واہ کیا کہنا ہے۔ شعر یوں کہتے ہیں۔ مزا آ گیا۔" استاد ذوق بھی مسکرائے کہ چلو اسی بہانے سے میری تعریف ہو رہی ہے۔ مرزا فخرو نے اٹھ کر سلام کیا اور کہا، "یہ آپ اصحاب کی بزرگانہ شفقت ہے جو اس طرح ارشاد ہوتا ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم" وہ جدھر نظر ڈالتے لوگ تعریفیں کرتے اور وہ جھک جھک کر سلام کرتے۔ جب محفل میں ذرا سکون ہوا تو مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا۔ اس نے شامیانے کے سامنے سے ایک شمع اٹھا

سامنے کی صف میں میاں پل کے آکے آگے رکھ دی۔

ان کی غزل ختم ہوتے ہی چوبدار نے دوسری شمع اٹھا کر مرزا اصلی بیگ کے سامنے رکھ دی۔ یہ نازنین تخلص کرتے ہیں دہلی میں بس یہی ایک ریختی گو ہیں۔ ادھر شمع رکھی گئی۔ ادھر نواب زین العابدین خاں نے آواز دی۔ "اوڑھنی لاؤ" ایک نوکر فوراً تاروں بھرے گہرے سرخ رنگ کی اوڑھنی لے کر حاضر ہوا۔ نازنین نے بڑے ناز و انداز سے اس کو اوڑھا ایک پلو کا بکل مارا، دوسرا پلو سامنے پھیلا لیا۔ اور خاصی بھلی چنگی عورت معلوم ہونے لگے غزل ایسی لوٹ لوٹ کر اور اٹھلا اٹھلا کر پڑھی کہ سارا مشاعرہ عش عش کرنے لگا۔ نرت ایسا پیارا کرتے تھے کہ کوئی بیسوا بھی کیا کرے گی قلعے والوں کو تو اس غزل میں بڑا مزہ آیا۔ مگر جو ریختی کے استاد تھے وہ خاموش بیٹھے سنتے رہے۔

اب دونوں شمعیں اس طرح گردش کرنے لگیں کہ پہلے صف کے سیدھی جانب کا ایک شخص غزل پڑھتا تھا اور پھر اسی کے بائیں جانب کا۔ ان کے غزل ختم کرنے پر بائیں طرف کی شمع اٹھا کر عبداللہ اوج کے سامنے رکھ دی گئی۔ یہ بڑے پرانے ۴۰-۵۰ برس کے مشاق شاعر ہیں۔ مضمون کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں۔ لیکن ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایسے بلند مضامین اور نازک خیالات لاتے ہیں کہ ایک شعر تو کیا ایک قطعے میں بھی ان کی سمائی مشکل ہے۔ اور کوشش کرتے ہیں کہ ایک ہی شعر میں مضمون کو کھپا دیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ بھلا دوسروں کو ان کے شعروں میں کیا مزہ آئے اور کوئی کیا داد دے۔ ہاں یہ خود ہی پڑھتے ہیں خود ہی مزہ لیتے ہیں۔ اور خود ہی اپنی تعریف کر لیتے ہیں۔ غزل اس زور و شور سے پڑھتے ہیں کہ زور میں آکر صف مجلس سے گزوں آگے نکل جاتے ہیں۔

ان کے بعد شمع محمد یوسف تمکین کے سامنے آئی۔ ان

عنایت اللہ دہلوی

پیدائش ۱۸۶۹ء وطن دہلی شمس العلما مولوی ذکاء اللہ دہلوی کے لائق فرزند تھے۔ الٰہ آباد اور علی گڑھ میں تعلیم پائی اپنے والد، سرسید، اور علی گڑھ کالج کے پروفیسروں کی صحبت میں رہ کر ترجمہ کا شوق ہوا اور سرسید کی فرمائش پر سر ٹامس آرنلڈ کی 'پریچنگ آف اسلام' کا ترجمہ 'دعوتِ اسلام' کے نام سے کیا۔ ان کا علمی کارنامہ لین پول کی مشہور کتاب 'صلاح الدین ایوبی' اور ہیرلڈ لیمب کی دل چسپ اور محققانہ تصنیف 'چنگیز خاں' اور 'تیمور' کے ترجمے ہیں۔ ان کا ایک اور شاہکار 'اندلس کا تاریخی جغرافیہ' جو ڈوزی کی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ ہے۔ ان کے تراجم اس قدر سلیس آسان، عام فہم اور بامحاورہ ہوتے ہیں کہ انگریزی کتابوں کے تراجم میں ان کی نظیر نہیں ملتی ۱۹۴۳ء میں آپ نے دہلی میں وفات پائی۔

کی عمر کوئی ۱۵-۱۶ سال کی ہوگی۔ مدرسہ دہلی کے طالب علم ہیں۔ غضب کی ظریفانہ طبیعت پائی ہے۔ بات کرنے میں منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ نازک نازک نقشہ، سانولا رنگ، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں۔ جوان ہوں گے تو بڑے خوب صورت آدمی نکلیں گے۔

اب شمع غلام احمد تصویر کے سامنے پہنچ گئی۔ ان کو میاں بتن بھی کہتے ہیں۔ الف کے نام بے نہیں جانتے، مگر طبیعت غضب کی پائی ہے۔ بچارے نیچہ بندی پر گزر اوقات کرتے ہیں۔ بڑے پُر گو شاعر ہیں۔ کلام ایسا پاکیزہ ہے کہ بڑے بڑے استادوں کے سر ہل جاتے ہیں۔ ان کو سنو تو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ایک امی پڑھ رہا ہے۔ بس یہی سمجھ لو کہ الشعراء تلامیذ الرحمٰن کی بہترین مثال ہیں۔

محمد حسین آزاد

۱۸۲۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور دہلی کالج میں تعلیم پائی۔ محکمۂ تعلیم کی ملازمت کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی و فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔ ۱۹۱۰ء میں انتقال ہوا۔ اردو نثر نگاروں میں آزاد کی شخصیت بہت نمایاں ہے۔ نثر میں ان کا طرز جداگانہ ہے۔ ان کی تصانیف میں 'آبِ حیات' اور 'نیرنگِ خیال' نے اہلِ قلم کو محوِ حیرت کر دیا۔ محمد حسین آزاد میں نازک خیالی اور لطافت و موزونیت خداداد تھی۔ فارسی زبان کی محبت نے اس جوہر کو اور بھی چمکا دیا۔ نثر میں شاعرانہ تخیل اور اسلوبِ بیان کی دل کش و برجستہ مثالیں آزاد کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتیں۔ جس انشا پردازی کو ادب کی جان اور لٹریچر کی روح کہا جا سکتا ہے وہ صرف آزاد کی تحریر ہے۔ ان کا انداز دل کش اور دل آویز ہوتا ہے۔ اس انشا پردازی کی تقلید آج تک کسی سے نہیں ہو سکی۔

غزل کہی تھی۔

ہجر کی شب تو سحر ہو یارب! — وہ نہ آیا تو قیامت ہی سہی
جانِ بے کار تو اپنی نہ گئی — اے ستم گر، تری شہرت ہی سہی
مجھ سے اتنا بھی نہ کھنچئے صاحب — آپ پر میری طبیعت ہی سہی
جذبۂ دل نہیں لایا تم کو — آپ کی خیر عنایت ہی سہی

ہر شعر پر واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور سے محفل گونج جاتی تھی۔ غزل تمام ہوئی تو استاد ذوق نے حکیم مومن خاں کی طرف دیکھ کر کہا، خان صاحب یہ میاں بجن بھی غضب کی طبیعت لے کر آئے ہیں۔ کہنے کو تو میرے شاگرد ہیں، مگر اب تک ان کے کسی شعر میں اصلاح دینے کی مجھے تو ضرورت نہیں ہوئی۔ کل ایک غزل سنائی تھی۔ میں تو پھڑک گیا۔ ایک شعر تو ایسا بے ساختہ نکل گیا کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ ہاں، میاں بجن وہ کیا شعر تھا۔ میاں بجن نے ذرا دماغ پر زور ڈالا اور شعر دماغ سے پھسل کر زبان پر آ گیا۔ مطلع تھا۔ برچھی تری نگاہ کی پہلو میں آ گئی — پہلو سے دل میں دل سے کلیجے میں جا لگی
اور شعر یہ تھا۔

دامن پہ وہ رکھے نہ رکھے دلربا گئی — لیکن ہماری خاک ٹھکانے سے آ گئی

حکیم صاحب نے بہت تعریف کی اور کہا، "میاں بجن یہ خدا کی دین ہے۔ یہ بات پڑھنے پڑھانے سے پیدا نہیں ہوتی۔ میاں خوش رہو، اس وقت دل خوش کر دیا۔"

ان کے بعد شمع محمد جعفر تابش کے سامنے آئی۔ یہ الٰہ آباد کے رہنے والے ہیں۔ بہت دنوں سے دلی میں آ رہے ہیں۔ بچارے گوشہ نشین آدمی ہیں۔ شاعری سے دلی لگاؤ ہے، کوئی مشاعرہ نہیں ہوتا جہاں یہ نہ پہنچتے ہوں۔ غزل میں دو شعر بہت اچھے تھے وہی لکھتا ہوں۔

کبھی بن بادہ رہ نہیں سکتے — توبہ کچھ ہم کو سازگار نہیں
دل میں خوش ہیں عدو پہ اے تابش — وہ ستم گر کسی کا یار نہیں

قطع کی کچھ ایسی پیاری بندش پڑی ہے کہ سب کے

منہ سے بے ساختہ واہ واہ نکلی. مفتی صدرالدین صاحب کی تو یہ حالت تھی کہ پڑھتے تھے اور جھومتے تھے۔

تابش کے بعد الٹی جانب کی شمع میاں قلق کے آگے گئی. عبدالعلی نام ہے۔ مدراس کے رہنے والے ہیں. کوئی ۳۰ برس کی عمر ہے. شعر خاصا کہتے ہیں۔ لکھا تھا۔

خُمِ شراب سے خُمِ گردوں تو بن گیا
ساقی بنادے ماہ، پیالا اچھال کے
ہم مشربوں میں چل کے قلق میکشی کرو
جھگڑے وہاں نہیں ہیں حرام و حلال کے

یہ پڑھ چکے تو شمع منشی محمود جان اوج مرزا کامل بیگ کامل. حکیم سید محمد تعشق کے سامنے ہوتی ہوئی میر حسین تجلی کے سامنے آئی یہ میر تقی میر کے پوتے ہیں. بڑے ظریف اور نکتہ سنج آدمی ہیں۔ کلام میں وہی میر صاحب کا رنگ جھلکتا ہے. زبان پر جان دیتے ہیں۔ غزل تو چھوٹی سی ہوتی ہے مگر جو کچھ کہتے ہیں اچھا کہتے ہیں. کیوں نہ ہو، آخر کس کے پوتے ہیں۔

مری وفا پہ تجھے روز شک تھا اے ظالم
یہ سر یہ تیغ ہے، لے اب تو اعتبار آیا
یہ شوق دیکھو پس مرگ بھی تجلی نے
کفن میں کھول دیں آنکھیں، سنا جو یار آیا

دوسرے شعر پر وہ وہ تعریف ہوئی کہ میاں تجلی کی باچھیں کھل گئیں. میاں تجلی پڑھ چکے تو حکیم سکھا نند رقم کی باری آئی۔ کلام تو ایسا اچھا نہیں ہوتا. مگر پڑھتے خوب ہیں۔ جہاں کسی نے ذرا بھی تعریف کی اور انہوں نے سلام کا تار باندھ دیا۔

ان کے بعد شمع کا شیخ نیاز احمد جوش کے سامنے جانا تھا کہ شاگردانِ ذوق ذرا سنبھل بیٹھے. جوش کو استاد ذوق بہت عزیز رکھتے ہیں۔ ان کی عمر تو ۱۸۔ ۱۹ سال کی ہے

الطاف حسین حالی

الطاف حسین نام، حالی تخلص، ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں وفات پائی. تعلیم کے لئے دہلی آئے. شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ پہلے گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازم ہوئے۔ پھر عربک کالج دہلی میں مدرسی کی۔ اسی زمانے میں سرسید سے ملاقات ہوئی اور سرسید کے دستِ راست بن کر قومی تحریک کے ایک ممتاز رکن بن گئے. سرسید کی فرمائش پر ۱۸۷۹ء میں اپنا مشہور مسدس لکھا، جس نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے چونکا دیا. نثر میں 'حیاتِ سعدی'، 'تریاقِ مسموم'، مجالس النساء (اخلاقی قصہ) 'حیاتِ جاوید' (سرسید کی سوانح عمری) اور 'یادگارِ غالب' میں مرزا غالب کے کمالات کو اجاگر کیا۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں فنِ شعر پر جو بھرپور تنقید کی ہے، اردو کے تمام تنقیدی لٹریچر میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

فرحت اللہ بیگ

۱۸۸۴ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۵ میں سینٹ اسٹیفنسز کالج دہلی سے بی اے کر کے حیدرآباد دکن میں ملازم ہوگئے۔ جب ریٹائر ہوئے تو اسسٹنٹ ہوم سکریٹری تھے۔ وہیں ۱۹۴۷ء میں انتقال ہوا۔ فرحت اللہ بیگ کی زبان دِلّی کی ٹکسالی زبان ہے۔ شوخی اور سنجیدہ طنز وظرافت ان کی انشا طرۂ امتیاز ہے۔ بیان کی سادگی اور زبان کا لوچ ان کی ظرافت میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ اسی لئے مزاح نگاری میں انہیں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ مشاہیر کی قلمی تصویر کھینچنے میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں۔ اپنے استاد "مولوی نذیر احمد کی کہانی اپنی زبانی" ان کا غیر فانی شاہکار ہے۔

آخری شمع

مگر بلا کے طباع اور ذہین ہیں۔ ان کی سخن گوئی اور سخن فہمی کی قلعے بھر میں دھوم ہے۔ مگر مشاعرے میں انہوں نے جو غزل پڑھی، وہ تو مجھ کو پسند نہیں آئی۔ ہاں قلعے والوں نے واہ واہ کے شور سے مکان سر پر اٹھا لیا۔ استاد ذوق نے بھی سبحان اللہ کہہ شاگرد کا دل بڑھایا۔ غزل دیکھ لیجئے، ممکن ہے کہ میں نے ہی غلط اندازہ لگایا ہو۔

کیوں کر وہ ہاتھ آئے کہ یاں زور و زر نہیں
لے دے کے ہے اک آہ، سو اس میں اثر نہیں
قسمت سے درد بھی تو ہوا وہ ہمیں نصیب
جس درد کا کہ چارہ نہیں، چارہ گر نہیں
قسمت ہی میں نہیں ہے شہادت وگرنہ یاں
وہ زخم کون سا ہے کہ جو کارگر نہیں
سجدے میں کیوں پڑا ہے ارے اٹھ شراب پی
اے جوش مے کدہ ہے خدا کا یہ گھر نہیں

ان کے بعد مولوی امام بخش صہبائی کے بڑے فرزند محمد عبدالعزیز کا نمبر آیا۔ یہ عزیز تخلص کرتے ہیں۔ غزل خوب کہتے ہیں، کیوں نہ ہو بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ ہائے کیا کیا شعر نکالے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

جو ان شمع شعل تیرے سراپا نیاز کا
جلتا جو سوز کا ہے تو رونا گداز کا
کج فہمیوں سے خلق کی دیکھا کہ کیا ہوا
منصور کو حریف نہ ہونا تھا راز کا
ہم عاصیوں کا بارِ گنہ سے جھکا ہے سر
اور خلق کو گمان ہے ہم پر نماز کا
مغرور تھا ہی اور وہ مغرور ہو گیا
اس میں گلہ نہیں مجھے آئینہ ساز کا
اوروں کے ساتھ لطف سے تھا تو نیاز
یاں بڑھ گیا دماغ تغافل سے ناز کا

ذرا سچ کہئے گا، ساری غزل مرصع ہے یا نہیں۔ ہاں اس غزل کی جو کچھ تعریف ہوئی وہ بجا ہوئی۔ استاد ذوق نے بھی کہا، بھئی صہبائی تمہارا یہ لڑکا غضب کا نکلا ہے۔ خدا اس کی عمر میں برکت دے۔ ایک دن بڑا نام پیدا کرے گا۔ واہ میاں صاحبزادے واہ! کیا کہنا ہے! دل خوش ہو گیا، کیوں نہ ہو۔ ایسوں کے ایسے ہی ہوتے ہیں۔" میاں عزیز نے اٹھ کر سلام کیا۔ اور بیٹھ گئے۔ میاں عزیز کے بعد شمع خواجہ معین الدین یکتا کے سامنے آئی۔ غزل پھسپھسی تھی اس لئے کیا خاک تعریف ہوتی۔

ہاں اب جس کے سامنے شمع آئی ہے وہ شاعر ہے۔ یہ کون ہیں، مرزا حاجی بیگ شہرت۔ گورا رنگ، میانہ قد، کوئی ۳۰۔۳۲ برس کی عمر۔ بڑے بنے سنورے رہتے ہیں۔ پہلے ان ہی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ اب تھوڑے دنوں سے بند ہے۔ مفتی صدرالدین صاحب کے شاگرد رشید ہیں۔ کہتے

بھی خوب ہیں۔ اور پڑھتے بھی خوب ہیں۔ بڑی پاٹ دار آواز ہے
پڑھنے کا ڈھنگ ایسا ہے کہ ایک ایک لفظ دل میں اتر جاتا ہے
ہر شعر پر تعریفیں ہوئیں۔ اور کیوں نہ ہوتیں۔ ہر شعر تعریف
کے قابل تھا۔ غزل یہ ہے۔

ایک دن دو دن کہاں تک! تو بھی کچھ انصاف کر
یہ تو جلنا روز کا اے سوزِ ہجراں ہو گیا
ہے ترقی جو ہر قابل ہی کے شایاں کہ میں
خاک کا پتلا بنا، پتلے سے انساں ہو گیا
کفر دیں میں تھا نہ کچھ عقدہ بجز بند نقاب
اس کے کھلتے ہی یہ کارِ مشکل آساں ہو گیا
پہلے دعوائے خدائی اس بتِ کافر کو تھا
کچھ درستی پر جو آج آیا تو انساں ہو گیا

آخری شعر پر تو مرزا غالب کی یہ حالت تھی کہ گویا
بالکل مست ہو گئے تھے۔ رانوں پر ہاتھ مارتے اور کہتے۔
"واہ میاں شہرت واہ! کمال کر دیا۔ شعر کیا ہے، اعجاز ہے
یہ ایک شعر بڑے بڑے دیوانوں پر بھاری ہے۔ ہاں، کیا
کہا ہے۔ سبحان اللہ!

پہلے دعوائے خدائی اس بتِ کافر کو تھا
کچھ درستی پر جو آج آیا تو انساں ہو گیا

غرض اس شعر نے ایک عجیب کیفیت محفل پر طاری کر
دی تھی۔ لوگ خود پڑھتے، ایک دوسرے کو سناتے، مزے
لے لے کر جھومتے اور جوش میں واہ واہ اور سبحان اللہ
کے نعرے مارتے۔ بڑی دیر میں جا کر محفل میں ذرا سکون
ہوا، تو شمع نوازش حسین تنویر کے سامنے آ گئی۔ میاں شہرت
کے شعر نے وہ جوش پیدا کر دیا تھا کہ ان کی غزل کسی نے
بھی غور سے نہیں سنی۔ غزل بھی معمولی تھی۔
تنویر پڑھ چکے تو شمع میر بہادر علی حزیں کے سامنے رکھی

سید علی بلگرامی

۱۸۵۱ء میں اپنے وطن بلگرام (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۷۴ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد ۱۸۷۶ء میں تعلیم حاصل کرنے انگلستان گئے۔ اور یورپ سے ڈاکٹریٹ اور ڈی لٹ کی ڈگریاں لیں۔ بلگرامی بہت سی زبانوں کے ماہر تھے۔ لیکن تصنیف کی طرف کبھی توجہ نہیں دی۔ بہت ترجمے ان کی یادگار ہیں۔ مگر وہ ترجمے بھی تصنیف سے کم نہیں۔ تمدن عرب کا ترجمہ اس قدر لطیف ہے کہ یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے۔ نازک سے نازک فلسفیانہ بحثیں اور معمولی روزمرہ اس برجستگی کے ساتھ اردو قالب میں ڈھالے گئے ہیں کہ ان ترجموں سے معلوم ہوتا ہے کہ سید علی بلگرامی کو اردو زبان پر پوری طرح عبور حاصل تھا۔

آخری شمع

گئی۔ یہ بڑے سنجیدہ، متین اور وضع دار آدمی ہیں۔ عارف
کے شاگرد ہیں۔ ان کی غزل کے دو تین شعر اچھے تھے۔

دنیا کی وسعتیں ترے گوشے میں آ گئیں
اللہ رے وسعتیں تری اے تنگنائے دل
جل جل کے آخر ش، تپشِ غم کے ہاتھ سے
اک داغ رہ گیا مرے پہلو میں جلائے دل
دیکھا وہ اپنی آنکھ سے جو کچھ سنا نہ تھا
اور دیکھے حزیں ابھی کیا کیا دکھائے دل

مقطع کو سب نے پسند کیا اور واقعی ہے بھی اچھا۔
ان کے بعد شمع ایسے شخص کے پاس آئی جو خود شاعر، جس
کا باپ شاعر، جس کا بھائی شاعر، جس کا سارا خاندان شاعر!
وہ کون؟ میاں باقر علی جعفری فخر الشعرا نظام الدین ممنون
کے چھوٹے بھائی، ملک الشعرا قمر الدین منت کے چھوٹے
بیٹے۔ ان کی غزل میں زور نہ ہوگا، تو اور کس کی غزل میں

شبلی نعمانی

۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ علمیت و فضیلت کے اعلیٰ مدارج طے کئے ۱۸۸۱ء میں سرسید نے انہیں علی گڑھ کالج میں فارسی کا پروفیسر بنا دیا۔ علی گڑھ کی فضا شبلی کی علمی نشوونما کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی، اور دم میں سے علمی دنیا میں شہرت حاصل کی۔ مولانا شبلی نے علم کلام، تاریخ، تنقید، سیرت غرض ہر میدان میں اپنی ذہانت کا نقش جمایا۔ لیکن سب سے زیادہ نام تاریخ اور تنقید میں پیدا کیا۔ ادب، تاریخ اور تحقیق میں مولانا کا رتبہ بہت بلند ہے۔ آخر عمر میں سیرت النبی شروع کی۔ دو جلدیں مکمل کی تھیں، کہ زندگی نے دفانہ کی اور ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔

شبلی کی طرز تحریر اپنی شگفتگی، بانکپن، روانی اور زورِ بیان کے اعتبار سے بہت ممتاز ہے۔

ظہور قدسی، دعوتِ عشیرہ، اسلامی حکومت کا تمدن پر اثر، شاعری کس چیز کا نام ہے۔ آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔

ہو گا۔ دو شعر لکھے ہیں۔

تیغ یوں دل میں خیالِ نگہِ یار نہ کھینچ
ناخدا ترس، تو کعبے میں تو تلوار نہ کھینچ

بے سرو پا چمن و دشت میں عالم کے نہ پھر
نازِ ہر گل نہ اٹھا، منتِ ہر خار نہ کھینچ

اس کے بعد منشی سید علی تشنہ کے پڑھنے کی باری تھی چوبداران کے سامنے شمع رکھنے میں ذرا ہچکچایا۔ یہ رنگ دیکھ کر مزے میں دو زانو بیٹھے جھوم رہے تھے۔ چوبدار نے مرزا فخرو کی طرف دیکھا۔ انہوں نے آنکھ سے اشارہ کیا کہ رکھ دے۔ اس نے شمع رکھ دی۔ جب شمع کی روشنی آنکھوں پر پڑی تو تشنہ نے بھی آنکھیں کھولیں۔ کچھ سمجھ کر پھونک مار شمع گل کر دی۔ اور کہا، "میں بھی کچھ عرض کروں" سب نے کہا، "ضرور فرمایئے۔" انہوں نے نہایت آزادانہ لہجے میں کچھ گاتے کچھ پڑھتے ہوئے یہ غزل سنائی۔

آنکھ پڑتی ہے کہیں، پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر، اپنی خبر کچھ بھی نہیں

شمع ہے، گل بھی ہے، بلبل بھی ہے، پروانہ بھی
رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں

حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

نیستی کی ہے مجھے کوچۂ ہستی میں تلاش
سیر کرتا ہوں اُدھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں

ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ
فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

میں کیا بتاؤں کہ اس غزل کا کیا اثر ہوا۔ ایک سناٹا تھا کہ زمین سے آسمان تک چھایا ہوا تھا۔ غزل کا مضمون آدھی رات کی کیفیت، پڑھنے والے کی حالت، غرض یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ ادھر یہ عالم طاری تھا

ادھر میاں تشنہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے چل دیئے اور "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کی آواز بڑی دیر تک کانوں میں گونجتی رہی۔ جب طبیعتیں سنبھلیں تو سب کے منہ سے بے اختیار یہی نکلا کہ "واقعی کچھ بھی نہیں۔"

مرزا فخرو نے شمع منگا کر روشن کی اور کہا۔ "ہاں صاحب پھر شروع کیجئے۔" شمع حافظ محمد حسین بسمل کے سامنے رکھی گئی بھلا تشنہ کے بعد ان کا کیا رنگ جمتا۔

اب شمع میر حسین تسکین کے پاس پہنچ گئی۔ ان کی کوئی ۴۰ برس کی عمر ہوگی۔ صہبائی کے شاگرد ہیں۔ مومن سے بھی اصلاح لی ہے۔ سپاہی پیشہ آدمی ہیں۔ شعر بُرا نہیں کہتے۔ لکھا تھا۔

ہزار طرح سے کرنی پڑی تسلّیِ دل
کسی کے جانے سے گو خود نہیں قرار مجھے

شبِ وصال میں سننا پڑا فسانۂ غیر
سمجھتے کاش وہ اپنا نہ رازدار مجھے

وہ اپنے وعدے پہ محشر میں جلوہ فرما ہیں
نہیں ہے ضعف سے انبوہ میں گزار مجھے

مرے تصور سے دیدار میں ہوئی تاخیر
نہ دیکھنا تھا تماشائے روزگار مجھے

مزے یہ دیکھے ہیں آغازِ عشق میں تسکین
کہ سوجھتا نہیں اپنا مآلِ کار مجھے

غرض اس غزل نے مشاعرہ کا رنگ پھر درست کر دیا۔ اور لوگ ذرا سنبھل بیٹھے اور استاد احسان کے شاگرد خواجہ غلام حسین بیدل کے سامنے شمع آئی۔ ساری غزل پھیکی پھیکی تھی بھلا اس کی کون تعریف کرتا۔ ہاں اس کے بعد جو غزل محمد حسین صاحب تائب نے پڑھی۔ اس میں مزا آگیا۔ میاں تائب مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے بھتیجے ہیں اور فخر الشعرا نظام الدین ممنون کے شاگرد ہیں۔ چھوٹی بحر میں ایسی غزل

سید احمد دہلوی

۱۸۴۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۶۸ء سے اردو لغت کی ترتیب شروع کی اور ۱۸۷۸ء میں اس کا ایک حصہ "ارمغانِ دہلی" کے نام سے شائع کیا۔ ڈاکٹر فیلن (انسپکٹر مدارس صوبہ بہار) کو اپنی انگریزی اردو ڈکشنری کے لئے ایک ماہر زبان کی ضرورت تھی۔ انہوں نے سید احمد دہلوی کو منتخب کیا۔ سید احمد نے سات سال تک ان کے ساتھ کام کیا اور ۲۵ سال کی مسلسل محنت کے بعد ۱۸۹۲ء میں لغت مکمل کی۔ جو سید علی بلگرامی کی سفارش پر نظام دکن نے شائع کرائی۔ اور انہیں کے نام پر "فرہنگِ آصفیہ" نام رکھا گیا۔ سید احمد دہلوی کا سب سے بڑا کارنامہ اردو لغت ہے۔ اردو زبان میں فرہنگِ آصفیہ سے پہلے اتنی مستند اور مکمل لغت موجود نہ تھی۔ اسی کارنامے (نمایاں) سے ان کا نام زندہ ہے۔ سید احمد نے ۱۹۱۸ء میں دہلی میں وفات پائی۔

اکبر الہ آبادی

اکبر حسین نام ۔ اکبر تخلص ۔ الہ آباد وطن ۔ ولادت ۱۸۴۶ء ۔ مورث اعلیٰ سید عرب نیشاپور خراسان سے ۱۷۳۲ء میں ہندوستان تشریف لائے والد کا نام سید تفضل حسین جو نائب تحصیلداری کے عہدہ پر مامور تھے ۔ ابتدائی تعلیم سرکاری مدرسہ میں ہوئی ۱۸۶۶ء میں ہائیکورٹ میں مثل خوانی کی جگہ ملی پھر وکالت کا امتحان پاس کیا اور منصف ہو گئے اور منصفی سے درجہ بدرجہ ترقی پاکر سشن جج بنے ۱۸۹۴ء میں خان بہادر کا خطاب ملا ۱۹۰۳ء میں جج سے پنشن مل گئی ۔ شعر گوئی کا بچپن سے شوق تھا ۔ منشی غلام حسین وحید شاگرد آتش لکھنوی سے تلمذ تھا ۔ اکبر الہ آبادی اپنی ظریفانہ شاعری کے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم تھے مشرقی تہذیب کے پرستار تھے حساس دل اور متفکر دماغ رکھتے ۔ اکبر الہ آبادی کی ظرافت بظاہر ہنساتی ہے لیکن دراصل خون کے آنسو رلاتی ہے وہ ایک دکھے ہوئے دل کی پکار اور مصلح قوم کی آواز ہے ' اکبر غزل بھی بہت بلند کہتے تھے ۔ ۱۹۲۱ء کو ۷۵ سال کی عمر میں بمقام الہ آباد انتقال کیا ۔ دنیائے ادب آج تک آپ کی سوگوار ہے ۔

لکھتے ہیں کہ سبحان اللہ اور پڑھنا تو ایسا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی ۔ غزل تھی ۔

پھر کتاں وار جگر چاک ہوا   پھر کوئی ماہ لقا یاد آیا
کہئے اس بت کو مشابہ کس کے   دیکھ کر جس کو خدا یاد آیا
عہد پیری میں جوانی کی امنگ   آہ کس وقت میں کیا یاد آیا

دوسرے اور تیسرے شعر پر تو یہ حال تھا کہ لوگ تعریفیں کرتے کرتے اور میاں تابؔ سلام کرتے کرتے تھکے جاتے تھے ۔ جب ذرا جوش کم ہوا تو شمع استاد ذوقؔ کے استاد غلام رسول شوقؔ کے سامنے آئی ۔ بچارے بڈھے آدمی ہیں ۔ شاہ نصیرؔ کے شاگرد ہیں ۔ مسجد عزیز آبادی میں امامت کرتے ہیں ۔ شروع میں استاد ذوقؔ نے ان کو اپنا کلام دکھایا تھا ۔ اسی برتے پہ یہ اپنے آپ کو ان کا استاد کہا کرتے ہیں ۔ اور اب بھی چاہتے ہیں کہ ذوقؔ اسی طرح آ کر مجھ سے اصلاح لیا کریں ۔ مجھے تو کچھ سٹھیائے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں غزل جو پڑھی تو واقعی اس کا مطلع بڑے زور کا تھا ۔ باقی اللہ اللہ خیر سلا ۔

لکھا ہوا ہے یہ اس مہ جبیں کے پردے میں
نہیں ہے کوئی اب ایسا زمیں کے پردے میں

استاد ذوقؔ کے چھیڑنے کو غالبؔ ۔ مومنؔ ۔ آزردہؔ ، صہبائیؔ غرض جتنے استادان فن تھے سب نے میاں شوقؔ کی بڑی واہ واہ کی ۔ وہ سمجھے کہ میرے کلام کی تعریف ہو رہی ہے ۔ یہ نہ سمجھے کہ بنا رہے ہیں ۔ ذرا کسی نے واہ واہ کی اور انہوں نے استاد ذوقؔ کی طرف دیکھ کر کہا ۔ " دیکھو شعر یوں کہتے ہیں " ۔ بچارے ہنس کر خاموش ہو جاتے ۔

خدا خدا کر کے ان سے فراغت ہوئی تو شمع آزادؔ کے سامنے آئی ۔ ان کا نام الگزنڈر ہیڈلے ہے ۔ قوم سے فرانسیسی ہیں ۔ دہلی میں پیدا ہوئے ۔ یہیں تربیت پائی اور یہیں سے

توپ خانے کے کپتان ہو کر الو گئے۔ کوئی ۲۱ سال کی عمر ہے ڈاکٹری بھی جانتے ہیں۔ شعر و سخن کا بہت شوق ہے۔ عارف کے شاگرد ہیں۔ جہاں مشاعرے کی خبر سنی اور دہلی میں آ موجود ہوئے۔ لباس تو وہی فوجی ہے مگر بات چیت اُردو میں کرتے ہیں۔ ایسی صاف اردو بولتے ہیں جیسے کوئی دہلی والا بول رہا ہے۔ شعر بھی کچھ بُرے نہیں ہوتے۔ ایک فرانسیسی کا اردو میں ایسے شعر کہنا واقعی کمال ہے۔ غزل ملاحظہ ہو

وہ گرم رو راہ معاصی ہوں جہاں میں
گرمی سے رہا نام نہ دامن میں تری کا
کچھ پاؤں میں طاقت ہو تو کر دشت نوردی
ہاتھوں سے مزا دیکھ ذرا جیب دری کا
جہلم کو عیادت کے لئے وہ سر آئے
آزاد شہ کا نا بھی ہے اس بے خبری کا

آزاد کے بعد شمع دوسری طرف میر شجاعت علی تسلی کے پاس آئی۔ میاں تسلی کے بعد سوز نے غزل پڑھی۔ یہ کول کے رہنے والے ہیں۔ قوم کے عیسائی ہیں۔ اور نام جارج ہیں ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ کس کے شاگرد ہیں۔ ہاں اکثر دہلی آتے جاتے رہتے ہیں۔ جو کچھ کہہ لیتے ہیں۔ بہت غنیمت ہے۔ غزل۔

عاجز تھا اپنی جان سے ایسا تیرا مریض
دیکھے سے جس کے حالتِ عیسیٰ تباہ تھی
بل بے یہ بیخودی کہ خودی سے بھلا دیا
ورنہ یہ زیست مرگ کی اپنے گواہ تھی
دیر و حرم میں تو نہ دے ترجیح زاہدا
جس جگہ سر جھکا، وہی بس سجدہ گاہ تھی

ان کے بعد محمد عسکری نالاں کی باری آئی۔ بھلا اس نوے برس کے بڈھے کی آواز نیند کے خمار میں کسی کو کیا سنائی دیتی۔ مصحفی کے سب سے پہلے شاگرد ہیں۔ اب تو ان کو بس تبرک سمجھے

ڈاکٹر اقبال

دورِ حاضر کے سب سے بڑے پولیٹیکل شاعر و ترجمان حقیقت علامہ ڈاکٹر اقبال ۱۸۷۶ء میں سیالکوٹ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار کا نام شیخ نور محمد۔ ان کے بزرگ کشمیر کے رہنے والے تھے۔ عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں شمس العلماء مولوی سید میر حسن سے اور ایم اے کی ڈگری لاہور سے حاصل کر کے انگلستان چلے گئے۔ مسٹر مس آرنلڈ سے فلسفہ سیکھا کیمبرج یونیورسٹی سے فراغت ملی تو جرمنی گئے۔ اہل جرمن نے آپکو ڈاکٹری کا علمی اعزاز بخشا۔ اس کے بعد ہندوستان آئے تو گورنمنٹ برطانیہ سے "سر" کا ممتاز خطاب ملا۔ ہندوستان میں اقبال قومی شاعر کی حیثیت سے بے انتہا مشہور و مقبول ہیں۔ ان کا پیام صادقانہ اور پُرجوش ہے۔ سر عبد القادر فرماتے ہیں "کسے خبر تھی کہ غالب کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا جو اردو شاعری کے جسم میں ایک نئی رُوح پھونک دے گا۔" ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے اور اپنی نہ مٹنے والی یاد ہمارے لئے چھوڑ گئے۔ + +

حسرت موہانی

مولانا حسرت موہانی ۱۸۷۵ء میں موہان ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ سید فضل الحسن نام۔ حسرت تخلص۔ سید اظہر حسین کے بیٹے۔ یہ نیشاپوری خاندانِ سادات کے چشم و چراغ ہیں۔ جدِ اعلیٰ سید محمود نیشاپوری نے ترکِ وطن کر کے قصبہ موہان میں سکونت اختیار کی ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی لیکن علم و ادب کی تکمیل کے لئے علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے وہیں سے بی اے کیا۔ آپ لکھنؤ کے مشہور شاعر تسلیم کے شاگرد ہیں۔ مولانا کو سیاست سے بھی عشق تھا کئی بار آپ نے قومی فلاح و بہبود کے لئے جیل میں شدید مصائب برداشت کئے لیکن ضمیر کے خلاف کبھی کوئی کمزوری ظاہر نہیں کی مولانا حسرت کا شمار ان مخصوص شعرا میں ہے جو اشعار میں تغزل کا بہت خیال رکھتے تھے یہ خصوصیت ان کے کلام کا امتیازی پہلو ہے۔ نہایت مختصر اور شگفتہ اشعار میں وہ حسن و عشق کی نفسیات کو بہت کامیابی کے ساتھ پیش کرتے تھے آپ کا کلام پاکیزہ خیالات، صحیح جذبات، بلند تخیل اور علم و ادب کا اعلیٰ نمونہ ہے حسرت کی غزلیں اردو ادب کے لئے مایۂ ناز ہیں۔ ●●

اور شعر بھی وہی بادا آدم کے وقت کے کہتے ہیں۔

نالاں نے پڑھنا ختم کیا تھا کہ شمع میر صاحب کے سامنے پہنچ گئی۔ شمع کا رکھنا تھا کہ ہر شخص سنبھل کر بیٹھ گیا۔ بعض نے انگلیوں سے آنکھیں مل ڈالیں۔ بعض نے کرتے کے دامن سے رگڑ ہیں، بعض اٹھے اور پانی کا چھپکا منہ پہ مار آ بیٹھے۔ کیسی نیند، کہاں کا سونا۔ میر صاحب کے نام نے سب کو چاق چوبند کر دیا۔ مرزا فخرو اب تک ایک پہلو بیٹھے۔ انہوں نے بھی پہلو بدلا۔ استادانِ فن کے چہروں پر مسکراہٹ آئی۔ نوجوانوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ میر صاحب صف سے کچھ آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو نے کہا "میر صاحب۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ آپ تو بیچ میں آ کر بیٹھئے۔" یہ کہہ کر چوبدار کو اشارہ کیا۔ اس نے دونوں شمعیں اٹھا کر وسطِ صحن میں رکھ دیں۔ میر صاحب بھی اپنی جگہ سے اٹھ شامیانے کے عین سامنے آ بیٹھے۔ چہرے پہ متانت بلا کی تھی، مگر جب غصہ آتا تھا تو پھر کسی کے سنبھالے نہیں سنبھلتے تھے چھوٹا ہو یا بڑا کوئی ان سے بغیر مذاق کے بات نہیں کرتا تھا۔ اور یہ بھی تڑسے جواب دیتے تھے کہ منہ پھر جائے اس سے ان کو غرض نہ تھی کہ جواب ہو بھی گیا یا نہیں۔ مشاعرے میں بادشاہ سلامت سے لے کر میاں تمکین تک ان کو چھیڑتے تھے۔ انہوں نے نہ ان کا برا مانا نہ ان کا جواب دینے میں کسر رکھی نہ ان سے رکے غزل ہمیشہ فی البدیہہ پڑھتے تھے۔ لکھ کر لانے کی تکلیف کبھی گوارا نہیں کی۔ غزل میں مصرعوں کے توازن کی ضرورت ہی نہ تھی۔ صرف قافیہ اور ردیف سے کام تھا۔ جو کچھ کہنا ہوا نہایت اطمینان سے نثر میں بیان کرنا شروع کر دیا۔ بیچ میں دوسرے کے اعتراضوں کا جواب بھی دیتے رہے۔ جب کہتے کہتے تھک گئے تو ردیف اور قافیہ کے شعر کو ختم کر دیا۔ انہوں نے شعر پڑھنا شروع کیا۔ اور چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھار ہوئی۔ یہ بھلا کب دبنے والے آسامی تھے چوکھا لڑتے۔ جب زبان سے نہ دبا سکتے تو زور میں آ کھڑے ہو جاتے

یہ کھڑے ہوئے اور کسی نہ کسی نے انہیں بٹھا دیا۔ معترض صاحب کو ڈانٹا۔ میر صاحب کا دل بڑھایا۔ اور پھر وہی اعتراضوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور تو اور مولوی مملوک العلی صاحب کو بھی ان سے الجھنے میں مزا آتا تھا۔ یہ بھی مولوی صاحب کی وہ خبر لیتے تھے کہ اگر ان کا کوئی شاگرد سن لیتا تو مدرسے میں مولوی صاحب کا سارا رعب داب رخصت ہو جاتا۔

میر صاحب نے شمع کے سامنے بیٹھتے ہی ساری محفل پر نظر ڈالی، اور کہا "حضرات، میں آج میاں ہدہد کی شان میں ایک قصیدہ سناؤں گا۔ اپنے منہ میاں مٹھو۔ یہ اپنی تعریف تو خود بہت کر چکے ہیں۔ اب ذرا دل لگا کر اپنی ہجو بھی سن لیں۔" میاں ہدہد سے سب جلے بیٹھے تھے۔ اب جو سنا کہ ان کی ہجو ہو رہی ہے اور پھر وہ بھی میر صاحب کے منہ سے۔ سب نے کہا، "ہاں میر صاحب، ضرور فرمایئے۔" میاں ہدہد حکیم آغا جان عیش کے پٹھو تھے، اور ان ہی کے بل پر پھدکتے تھے۔ اب جو حکیم صاحب نے سنا کہ میر صاحب ہدہد کی ہجو پر اتر آئے ہیں تو بہت پریشان ہوئے۔ ڈر تھا کہ کہیں مجھ کو بھی نہ لپیٹ لیں۔ دوسرا کوئی ہجو کرے تو جواب بھی دیا جائے۔ بھلا میر صاحب کی بحر طویل کا کون جواب دے سکتا ہے۔ اور تو کچھ بن نہ پڑا۔ میاں ہدہد کو گاؤ تکیے کے پیچھے غائب کر دیا۔ اب جو میر صاحب اُدھر نظر ڈالتے ہیں تو ہدہد ندارد ہیں۔ بہت گھبرائے۔ ادھر دیکھا اُدھر دیکھا جب کسی طرف نظر نہ آئے تو کہا "ہجو ملتوی کر کے غزل پڑھتا ہوں۔" سب نے کہا "ہیں میر صاحب یہ آپ نے ارادہ کیوں تبدیل کر دیا۔ پڑھیے میر صاحب، خدا کے لئے۔ سودا کے بعد ہجو تو اردو زبان سے اٹھ ہی گئی۔ اگر آپ بھی اس طرف توجہ نہ کریں گے تو غضب ہو جائے گا۔ زبان ادھوری رہ جائے گی۔" میر صاحب نے کہا "نا بھئی نا، میاں ہدہد ہوتے تو ہم کو جو کچھ کہنا تھا ان کے منہ پر کہتے۔ ان کے بیٹھ پیچھے ان کو کچھ کہنا ہجو نہیں، غیبت ہے

سجاد حیدر یلدرم

۱۸۸۰ء میں ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں علی گڑھ سے بی اے پاس کیا۔ پھر ترکی میں سفیر بن کر گئے اور وہیں ترکی قلم 'یلدرم' (بمعنی بجلی) رکھا، اور ترکی زبان کے چند شہ پاروں کو اردو میں منتقل کیا۔ واپسی پر یوپی میں ڈپٹی کلکٹر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار رہے۔ ۱۹۴۳ء میں انتقال ہوا۔ سجاد حیدر یلدرم نے ایک خاص طرز تحریر کی بنیاد ڈالی اور اردو ادب میں ایک نیا تصور، ایک نیا اسلوب اور ایک نئی زندگی منتقل کی۔ ان کے مضامین ہمیشہ اپنے رنگ میں نئے اور خیال میں اچھوتے ہوتے تھے۔ اردو میں انشائے لطیف کے ماہر تھے۔ ان کی انشا کی خصوصیت رعنائی خیال، لطافتِ بیان، شگفتگی اور ندرت کے ساتھ ایک ایسا انداز ہے جسے نثر میں شاعری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یلدرم کے افسانے ادبیت کے شاہکار ہیں۔ اور ان کے قلم نے افکارِ لطیف کی ایک دنیا آباد کی ہے۔

پریم چند

منشی پریم چند ۱۸۸۰ء میں بنارس میں پیدا ہوئے بی۔ اے تک تعلیم حاصل کر کے محکمہ تعلیم میں اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوئے۔ وطن کی محبت سے سرشار ہو کر افسانوں کا پہلا مجموعہ 'سوزِ وطن' ۱۹۰۹ء میں شائع کیا۔ برٹش گورنمنٹ کو اس کتاب میں بغاوت کے جذبہ کی جھلک نظر آئی تو اس کو ضبط کر لیا۔ پریم چند نے اپنی آزادی سلب ہوتے ہوئے دیکھی تو ملازمت سے استعفا دیدیا اور تمام عمر تصنیف و تالیف میں گزار ۱۹۳۶ء میں بنارس میں وفات پائی۔ پریم چند شہرۂ آفاق ادیب اور بے مثل افسانہ نگار تھے۔ انہوں نے دیہاتی زندگی کی بڑی خوبی سے تصویر کشی کی ہے اور ان کے افسانوں میں حقیقت نگاری اپنے شباب پر ہے۔ پریم چند کے افسانوں میں رومانی اور وجد آفریں تخیلی دنیا کے مرقعے بھی ہیں۔ پریم چند کی زبان سادہ، آسان اور شگفتہ ہے۔

اور میں غیبت کرنے والوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔" جب میر صاحب کا یہ رنگ دیکھا تو حکیم آغا جان کے دم میں دم آیا۔ انہوں نے بھی اس ہجو اور غیبت کے فرق کے متعلق چند مناسب الفاظ کہے اور خدا خدا کر کے یہ آئی بلا ٹلی۔

اب میر صاحب نے غزل شروع کی۔ کیا پڑھا؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ بس اتنا تو معلوم ہوا کہ 'تیر، بیر، کھیر' قافیہ اور 'رہے' ردیف ہے۔ اس کے علاوہ میں تو کیا خود میر صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ انہوں نے کیا پڑھا اور مضمون کیا تھا۔ جہاں قافیہ اور ردیف آئی لوگوں نے سمجھ لیا کہ شعر پورا ہو گیا۔ اور تعریفیں شروع ہوئیں کسی نے ایک آدھ اعتراض بھی جڑ دیا۔ اعتراض ہوا اور میر صاحب بگڑے۔ ان کے بگڑنے میں سب کو مزا آتا تھا۔ اعتراضوں اور میر صاحب کے جوابوں کا رنگ بھی دیکھ لیجئے۔ غزل میں میر صاحب نے جو ایک مصرع کو کھینچنا شروع کیا اور اتنا کھینچا اتنا کھینچا کہ شیطان کی آنت ہو گیا تو مولوی مملوک العلیٰ صاحب نے کہا، "جی میر صاحب! یہ مصرعہ بحرِ طویل میں جا پڑا۔" میر صاحب نے کہا مولوی صاحب کبھی بحرِ طویل دیکھی بھی ہے۔ یا یوں ہی سنی سنائی باتوں پر اعتراض ٹھونک دیا۔ پہلے مطول پڑھیے مطول تب معلوم ہو گا کہ بحرِ طویل کس کو کہتے ہیں۔"

مولوی صاحب بڑے چکرائے۔ کہنے لگے "میر صاحب بھلا مطول کو بحرِ طویل سے کیا واسطہ۔" "روں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ آپ کا جو جی چاہتا ہے کہہ جاتے ہیں۔" میر صاحب کو اب کسی حمایتی کی تلاش ہوئی مولانا صہبائی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے کہا "مولوی صاحب مطول میں بحرِ طویل کی بحریں نہیں ہیں تو کیا ہے۔ آپ بھی ہمارے میر صاحب کو اپنی علمیت کے دباؤ سے خاموش کر دینا چاہتے ہیں۔" بس اتنی مدد ملنی تھی کہ میر صاحب شیر ہو گئے۔ کہنے لگے، "جی ہاں مولوی صاحب، آپ سمجھے ہوں گے کہ آپ کے سوا کسی نے مطول پڑھی نہیں۔ اجی حضرت۔ میں روزانہ اس کے دو دور کرتا ہوں۔ کل ہی اس کی بحر میں ایک غزل لکھنے بیٹھا تھا، لکھتے لکھتے تھک گیا۔ ایک مصرعہ کوئی پونے دو سو صفحے میں لکھا۔ وہ تو کہو کہ بیاض کے صفحے ہی ختم ہو گئے۔ جو مصرعہ ختم ہوا۔ ورنہ خدا معلوم اور کہاں تک جاتا۔" مرزا نوشہ نے کہا، "میر صاحب! آپ سچ فرماتے ہیں۔ ہمارے مولوی صاحب نے بحرِ طویل کہاں دیکھی ہے۔ مجھ سے پوچھو میرے بھتیجے خواجہ امان کو جانتے ہو۔ اس نے ایک کتاب بوستانِ خیال لکھی ہے۔ یہ بڑی اور موٹی بارہ جلدیں ہیں۔ بحرِ طویل کے بس بارہ مصرعوں میں ساری جلدیں ختم ہو گئی ہیں۔"

میر صاحب نے بڑے زور سے ہیں کی اور بگڑ کر کہا "مرزا صاحب یہ سیدھے چلتے چلتے بھٹک گئے۔ رباعی کی بحریں آپ کو معلوم بھی ہیں، بھلا بتایئے تو یہی کون سی کتاب میں ہیں۔" یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا، مرزا غالب ذرا چپ ہوئے تو خود میر صاحب نے کہا، "میں

تو پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ نے زبردستی اعتراض کر دیا ہے۔ مرزا صاحب اربعین پڑھیے، جب معلوم ہوگا کہ رباعی کی بحریں کون کون سی ہیں۔"

غرض اسی طرح کی خوش مذاقی میں کوئی گھنٹہ بھر گزر گیا ہنستے ہنستے جو آنسو نکلے انہوں نے نیند کے خمار سے آنکھیں صاف کر دیں اور ایسا معلوم ہونے لگا گویا مشاعرے کا دوسرا دور شروع ہو رہا ہے۔ اور سب لوگ تازہ دم آکر ابھی بیٹھے ہیں۔ جب لوگ اعتراض کرتے کرتے اور میر صاحب جواب دیتے دیتے تھک گئے تو ایک دفعہ ہی میر صاحب نے کہا: "حضرت غزل ختم ہوگئی۔" سب نے کہا: "میر صاحب ابھی مقطع تو آیا ہی نہیں۔ بے مقطع کی یہ کیسی غزل؟" میر صاحب نے فرمایا: "مقطع کی اس شاعر کو ضرورت ہے جو بتانا چاہے کہ یہ غزل میری ہے۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری غزل کی یہی پہچان ہے۔ جہاں شروع کی بس معلوم ہو گیا کہ یہ میر صاحب کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔" یہ کہتے کہتے انہوں نے جزدان گردانا اور اپنی جگہ آبیٹھے۔ ایک شمع اٹھا کر میر صاحب کے عین مقابلے کے شاعر مرزا حجیت شاہ ماہر کے سامنے رکھ دی گئی۔ یہ شاہ عالم شاہ غازی انار اللہ برہانہٗ کے پوتے اور صابر کے شاگرد ہیں۔ کلام صاف اور زبان بڑی میٹھی ہے۔ لکھا تھا:

ہم بھی ضرور کعبے کو چلتے بداب تو شیخ
قسمت سے بت کدے ہی میں دید رہ گیا

ضح کی بات سننے کا کس کو یہاں دماغ
تیرا ہی ذکر تھا کہ میں ناچار ہو گیا

اے ذوق بس دہ حضرت ماہر نہ ہو کہیں
یک پارسا ہے کہ بے خوار ہو گیا

پڑھنا سب کے کلام نے سب کی آنکھوں سے نیند کا خمار اتار دیا تھا۔ اس لیے اس غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف ہونا درمیان۔ صبر کو محنت کا پورا پورا صلہ مل گیا۔ ان کے بعد شیخ دانی

عالب مہر

خواجہ حسن نظامی

۱۸۷۸ء میں دلی میں پیدا ہوئے اور یہیں ۱۹۵۵ء میں وفات پائی۔ 'مصورِ فطرت' لقب پایا۔ خواجہ صاحب اردو میں خاص طرز کے موجد اور مشہور انشاپرداز تھے۔ ان کی تحریریں شہد کی سی مٹھاس، دلکشی، سادگی اور بے تکلفی ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ معمولی مضمون کو نہایت دلکش و موثر بنا دیتے تھے۔ زبان دلی کی ٹکسالی، سادہ، شگفتہ اور شیریں ہونے کی وجہ سے قبول عام حاصل کر چکی ہے۔ دلی کی پرانی تہذیب و معاشرت اور مغلیہ شہزادوں کے واقعات نہایت دردانگیز پیرائے میں بیان کیے ہیں۔ سی پارہ دل میں ان کے پُراثر ادبی، اخلاقی اور صوفیانہ مضامین ہیں۔

آغا حشر

آغا محمد شاہ نام حشر تخلص، وطن کشمیر تھا۔ ۱۸۷۹ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ ان کی ڈرامہ نویسی کی ابتدا ۱۹۰۱ء میں ہوئی۔ بعد میں کلکتہ چلے گئے۔ کیوں کہ یہی ان دنوں تھیٹریکل کمپنیوں کا مرکز تھا۔ اور تھیٹر کا طوطی بول رہا تھا۔ جب تھیٹر کا بازار سرد پڑ گیا تو فلموں کے لئے آغا حشر نے 'یہودی کی لڑکی' اور 'رستم و سہراب' مشہور ڈرامے لکھے۔ چونکہ وہ شاعر بھی تھے۔ اس لئے ان کے ڈرامے زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اعلیٰ معیار کے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں میں وفورِ جذبات خوب دکھاتے ہیں۔ ان کا عشق بہت گہرا اور ان کے جذبات بہت عمیق ہیں۔ وہ نظم اور نثر دونوں کے استاد ہیں۔ حشر کی مکالمہ نگاری میں زورِ بیان معراجِ کمال پر ہوتا ہے۔ ان کو مکالمہ پیش کرنے میں کمال حاصل ہے۔ آغا حشر کا ۱۹۳۵ء میں لاہور میں انتقال ہوا۔

آخری شمع

نجم الدین برق کے سامنے آئی۔ یہ سکندر آباد کے رہنے والے ہیں کوئی ۲۰-۲۲ برس کی عمر ہے۔ آواز بڑی دل کش اور طرزِ ادا خوب ہے غزل ایسی پڑھی کہ واہ واہ کہتے ہیں۔

بزمِ اغیار ہے، ڈر ہے نہ خفا تو ہو جائے
ورنہ اک آہ جو کھینچوں تو ابھی تو ہو جائے
حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھپنے سے پڑے
ورنہ تو پردہ اٹھا دے تو، تو ہی تو ہو جائے

رتن لال سرشار ۱۸۴۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ کشمیری خاندان سے تھے کیننگ کالج لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ ۱۸۷۸ء میں منشی نول کشور کے اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہو گئے۔ اسی اخبار میں "فسانۂ آزاد" لکھا۔ جو ناول نویسی کے فن میں منفرد اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۹۰۲ء میں حیدر آباد میں انتقال ہوا۔

کچھ مزا ہے یہ ترے روٹھ کے من جانے کا
چاہتا ہوں یونہی ہر بار خفا تو ہو جائے
تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک
میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے
آپ انکار کریں وصل سے میں در گزرا
کچھ تو ہو جس سے طبیعت مری یکسو ہو جائے
ہو نہ ہو بس میں کوئی، کچھ نہیں اس کی پروا
دلِ بیتاب یہ اے برق جو قابو ہو جائے

اللہ اللہ! در و دیوار سے بے خودی برس رہی تھی جب یہ مصرع پڑھا کہ 'میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے' تو ساری محفل پر ایک مستی سی چھا گئی اور تو اور استادانِ فن کی بھی یہ حالت تھی کہ بار بار شعر پڑھواتے، خود پڑھتے اور مزے لیتے تھے۔ ابھی ان کی تعریفیں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ شمع مرزا انجھلے المتخلص بہ فسوں کے سامنے رکھی گئی۔ یہ نوجوان آدمی ہیں۔ مرزا کریم بخش مرحوم کے فرزند اور حضرت ظلِ سبحانی کے نواسے ہیں۔ ان کا کیا کہنا۔ زبان تو ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ گا کر پڑھتے ہیں، پڑھتے کیا ہیں جادو کرتے ہیں ان کی غزل کے دو شعر لکھتا ہوں:

اللہ رے جذبۂ دلِ مضطر کہ تیر کا
باہر ہمارے پہلو کے سوفار بھی نہیں
کچھ آپ ہی آپ دل یہ مرا بیٹھا جاتا ہے
ظاہر میں تو الٰہی میں بیمار بھی نہیں

دوسرے شعر میں الفاظ کیا ٹھاٹے ہیں۔ نگینے جڑ دیئے ہیں۔ آخر کیوں نہ ہو۔ قلعہ کے رہنے والے ہیں۔ ان کے بعد سیدھی جانب سے شمع سرک کر لالہ بالمکند حضور کے سامنے آئی۔ یہ ذات کے کھتری اور خواجہ میر درد کے شاگرد ہیں۔ کوئی ۷۰-۸۰ برس کا سن ہے سفید نورانی چہرہ، اس پر سفید لباس، بغل میں انگوچھا۔ کندھوں پر سفید کشمیری رومال، بس جی چاہتا تھا کہ ان کو دیکھے ہی جائیں۔ شمع سامنے آئی تو

انہوں نے عذر کیا کہ میں اب سنانے کے قابل نہیں رہا، سننے کے قابل رہ گیا ہوں۔ جب سبھوں نے اصرار کیا تو انہوں نے یہ قطعہ پڑھا:

نہ پاؤں میں جنبش، نہ ہاتھوں میں طاقت
جو اٹھ کھینچیں دامن، ہم اس دل رُبا کا
سرِ راہ بیٹھے ہیں اور یہ صدا ہے
کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا

قطعہ اس طرح پڑھا کہ خود تصویر ہو گئے "وہ" نہ پاؤں میں جنبش، کہتے ہوئے اٹھے مگر پاؤں نے یاری نہیں کی۔ لڑکھڑا کر بیٹھ گئے۔ "نہ ہاتھوں میں طاقت" کہہ کر ہاتھ اٹھائے مگر ضعف سے وہ بھی کچھ یوں ہی سے اٹھ کر رہ گئے۔ دوسرا مصرعہ ذرا تیز پڑھا۔ تیسرا مصرعہ پڑھتے وقت اس طرح بیٹھ گئے۔ جیسے کوئی بے دست و پا سرِ راہ بیٹھ کر صدا لگاتا ہے۔ اور ایک دفعہ ہی دونوں آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر جو چوتھا مصرعہ پڑھا تو یہ معلوم ہوتا تھا گویا ساری محفل پر جادو کر دیا۔ ہر ایک کے منہ سے تعریف کی بجائے بے ساختہ یہی نکل گیا کہ "اللہ والی ہے بے دست و پا کا"۔ استاد ذوق نے کہا، "استاد یہ خدا کی دین اور خواجہ میر درد کا فیض ہے۔ سبحان اللہ! کیا موثر کلام ہے ہم دنیاداروں میں یہ اثر پیدا ہونے کے لئے میر درد ہی جیسا استاد ہونا چاہیئے۔"

اس کلام کے بعد مرزا غلام محی الدین اشکیؔ کی غزل بھلا کون سنتا ہے۔ یہ شاہ عالم بادشاہ غازی کے پوتے ہیں۔ کوئی چالیس سال کی عمر ہے۔ اونچا قد، سفید پوش، ثقہ صورت آدمی ہیں پہلے نظام الدین ممنونؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ اب مفتی صدر الدین کے شاگرد ہو گئے ہیں۔ لکھا تھا:

کچھ وجد نہیں نغمۂ مطرب ہی پہ موقوف
کافی ہے یہاں نالۂ بے ربط درا کا
سجدے میں گرے دیکھ کے تصویر بت اشکیؔ

غالب نمبر

معلوم ہوا آپ کا سرقہ تھا دیا کا

آخری شمع

ان کے بعد شمع صاحبزادہ عباس علی بیتابؔ کے سامنے آئی۔ ۳۰۔۳۲ کا سن ہوگا۔ رامپور کے رہنے والے اور مومن خاں کے شاگرد ہیں۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے بڑی دوستی ہے۔ ان ہی کے ساتھ مشاعرہ میں آگئے تھے۔ بڑی اونچی آواز میں غزل پڑھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تحت اللفظ پڑھ رہے ہیں۔ غزل تو کچھ اچھی نہ تھی مگر قطعہ ایسا تھا کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ بے خانے

امتیاز علی تاج

سید امتیاز علی تاجؔ ۱۹۰۰ء میں بمقام لاہور پیدا ہوئے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کیا۔ کالج کے ڈرامیٹک کلب میں بہت دلچسپی لی۔ تصنیف و تالیف کا بہت اچھا ملکہ اور سلیقہ رکھتے ہیں۔ امتیاز علی تاج کا شاہکار 'انار کلی' ہے جو اردو ادب کے ڈراموں کا 'تاج' ہے۔ اسی لئے اس ڈرامے پر اردو زبان کو فخر و ناز ہے۔ اس میں سلیم (جہانگیر) کی دل نوازیدگی اور اس کی دلربا کنیز 'انارکلی' کا حسرت ناک انجام معاشرت اور تمدن کی ہو بہو تصویریں اور لال قلعہ کی بول چال ہے۔ انارکلی کا اندازِ بیان ملاحظہ فرمایئے: "سلیم، تمہیں کیا مل گیا میری نیندوں لوٹ کر میری راحت کو غارت کرکے۔ تمہیں کیا مل گیا سلیم۔ پھر تم نے کیوں محبت کے پیام بھیجے، کیوں سلگتی ہوئی چنگاری کو دہکایا۔" اس تحریر کے اسلوب سے حسنِ بیان کا اندازہ آپ بخوبی کر سکتے ہیں۔

برج نرائن چکبست

برج نرائن چکبست ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے کشمیری پنڈت ہیں ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ سے بی اے کیا۔ پھر قانون کا امتحان پاس کرکے وہیں وکالت شروع کردی۔ ۱۹۲۶ء میں وفات پائی۔ چکبست نے نیچرل شاعری نازک خیالی، شاعرانہ لطافت اور قومی جذبات اور حب الوطنی کے ایسے جوہر دکھائے جو آج تک دل پر نقش ہیں۔

چکبست لکھنوی

پنڈت برج نرائن چکبست ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ آباؤ اجداد کشمیر سے لکھنؤ آئے تھے ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی اے کیا پھر قانون کے امتحان میں کامیاب ہو کر لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ بچپن سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ کسی کے شاگرد نہیں ہوئے لیکن اساتذہ کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا اور اپنے پیام میں ایک نئی روح پھونکی۔ ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ کی پیروی میں بریلی گئے کہ یکایک فالج میں مبتلا ہوئے اور رائے بریلی کے اسٹیشن پر انتقال کیا۔

آخری شمع کی تقسیم ایسی خوبی سے کی تھی کہ سبحان اللہ۔ ہائے لکھا ہے۔

معمور ہے خدا کی عنایت سے مے کدہ

ساقی اگر نہیں ہے نہ ہو مے سے کام ہے

بیتاب پی، خدا نے تجھے بھی دیے ہیں ہاتھ

یہ خم ہے یہ سبو ہے یہ شیشہ یہ جام ہے

بھلا ایسے بڑے مشاعرے میں مرزا فخرالدین حشمت کو پڑھنا کیا ضرور تھا۔ نہ کلام ہی اچھا، نہ پڑھنے کی طرز ہی اچھی مگر ان کو روک کون سکتا تھا شہزادے تھے اور وہ بھی شاہ عالم بادشاہ کے پوتے۔ خیر پڑھ لیا اور بھائی بندوں نے تعریفیں بھی کر دیں، خوش ہو گئے۔

ہاں، ان کے بعد جن کے سامنے شمع آئی وہ نوجوان سہی مگر شاعر ہیں۔ اور ایسا شاعر ہوگا کہ ہندوستان بھر میں نام کرے گا۔ بھلا کون سا مشاعرہ ہے جس میں مرزا قربان علی بیگ سالک کی غزل شوق سے نہ سنی جاتی۔ اور کون سا شعر ہوتا ہے جو بار بار نہیں پڑھوایا جاتا۔ شمع کا ان کے سامنے آنا تھا کہ سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بھی انگرکھے کی آستین الٹ ٹوپی کو اچھی طرح جما اپنے استاد مرزا غالب کی طرف دیکھا۔ ادھر سے مسکرا کر کچھ اشارہ ہوا۔ تو انہوں نے صاحبِ عالم کی طرف دیکھ کر عرض کی۔ "اجازت ہے۔" مرزا فرخ نے کہا۔ "ہاں، میاں سالک پڑھو۔ آخر اس میں اجازت کی ضرورت ہی کیا ہے۔" سالک نے جیب میں سے کاغذ نکالا۔ کچھ الٹا پلٹا۔ پھر ایک بار سنبھل کر کہا، عرض کیا ہے۔

انتہا صبر آزمائی کی	ہے درازی شبِ جدائی کی
راز کھلتے گئے مرے سب پر	جس قدر اس نے خودنمائی کی
کتنے عاجز ہیں ہم کہ پاتے ہیں	بندے بندے میں بو خدائی کی

رہ گئیں دل میں حسرتیں سالک

آگئی عمر پارسائی کی

ایک ایک شعر پر یہ عالم تھا کہ مجلس لوٹی جاتی تھی۔ ایک شعر کئی کئی بار پڑھوایا جاتا تھا۔ ایک ایک لفظ پر تعریفیں ہوتیں اور ایک ایک بندش کی داد ملتی۔ استاد ذوق نے تیسرے شعر پر کہا۔ "واہ سالک کیا کہنا ہے۔ سب ہی جبہ سائی باندھتے ہیں پر تمہاری داستان کو کوئی نہیں پہنچا۔ کیا کلام ہے کیا روانی ہے سبحان اللہ" حکیم مومن خان نے کہا، "میاں سالک یہ جوانی اور مقطع میں یہ بوڑھا مضمون تمہاری عمر پارسائی کو بہت دن پڑے ہیں۔ ابھی سے تو بڈھوں

کی باتیں نہ کرو۔" میاں سالک نے جواب دیا۔ "استاد، میں تو جوانی ہی میں بڈھا ہوگیا۔ دیکھئے بڑھاپا دیکھنا نصیب ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ پھر دل میں آئے ہوئے مضمون کیوں چھوڑ دوں۔ بعد میں یہ کون دیکھتا پھرے گا کہ یہ شعر بڈھے نے کہا تھا یا جوان نے۔ ہم نہ رہیں گے مضمون رہ جائے گا۔" جب تعریفوں کا سلسلہ تھما تو شمع مرزا رحیم الدین ایجاد کے سامنے آئی۔ یہ شہزادے مرزا حسین بخش کے صاحبزادے اور مولانا صہبائی کے شاگرد ہیں۔ کوئی ۲۴-۲۵ سال کی عمر ہے۔ شعر کہتے ہیں، مگر پھیکے۔ ہاں پڑھتے اچھی طرح ہیں۔ گانا خوب جانتے ہیں۔ ان کی آواز شعر کی کمزوری ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ لکھا ہے۔

بت خانے میں تھا یا کہ میں کعبہ کے قریں تھا
اے زاہد ناداں تجھے کیا ہے میں کہیں تھا

ہر چند کہ میں دوست کے ہمراہ نہیں تھا
پر دل وہ بلا ہے وہ جہاں تھا یہ وہیں تھا

غزل میں تو کیا خاک مزہ آتا۔ ہاں ان کے گانے میں مزہ آگیا۔ گا کر پڑھنے کا یہ رنگ قلعہ میں چلا ہے۔ مگر استادان فن اس کو پسند نہیں کرتے۔

ان کے بعد شمع نواب علاء الدین خاں علائی کے سامنے آئی۔ انہوں نے بہت اونچی آواز میں اپنی غزل سنائی۔ علائی مرزا غالب کے بڑے چہیتے شاگرد ہیں۔ ابھی نو عمر ہیں۔ شعر اچھا کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو کس کے شاگرد ہیں۔

آوارگانِ گل کدۂ آرزو، سنو
حاشا اگر تمہیں سر سیر و فراغ ہے

رکھیو سنبھل کے پاؤں جو مینا ہو چشم دل
کچھ سمجھ کے کام جو روشن دماغ ہے

جس جا کہ تھا ترانۂ بلبل نشاط خیز
اس جا یہ آج دل شکن آواز زاغ ہے

مغرورِ جاہ سے یہ کہو تم علائیا
کل ایک سطح خاک ہے جو آج باغ ہے

علائی کے پاس سے شمع کا ہٹ کر سامنے آنا تھا کہ مرزا کریم الدین رسا سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ایک بڑی لمبی غزل پڑھی مگر ساری کی ساری بے مزہ۔ نہ الفاظ کی بندش اچھی نہ مضامین میں کوئی خوبی۔

یہ پڑھ چکے تو نواب ضیاء الدین خاں نیر رخشاں کے پڑھنے

شاد عظیم آبادی

سید علی محمد نام۔ شاد تخلص ۱۸۴۶ء میں عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے والد کا نام سید عباس مرزا ہے ان کی تعلیم چار برس کی عمر سے شروع ہوگئی تھی لیکن تربیت میر سید مرحوم کے ذمہ تھی جو اردو زبان کے بہت بڑے محقق تھے ان کی تربیت ہی کا اثر تھا جس نے آئندہ چل کر شاد کی زبان کو اس قدر فصیح و بلیغ کر دیا شاد کی شاعری کا دور پندرہ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے کلام کی اصلاح وحید العصر شاہ الفت حسین فریاد عظیم آبادی نے کی جو خواجہ میر درد دہلوی کے شاگرد تھے ۱۹۲۶ء میں پٹنہ میں انتقال کیا۔

آخری شمع

ریاض خیر آبادی

سید ریاض احمد نام۔ ریاض تخلص ۱۸۵۳ء میں خیر آباد میں پیدا ہوئے۔ بزرگ ایران کے رہنے والے تھے۔ مورث اعلیٰ علاؤ الدین غوری کے عہد میں ہندوستان آئے۔ اور خیر آباد ضلع سیتاپور میں سکونت اختیار کی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سید طفیل احمد سے حاصل کی۔ ریاض کی زندگی کا زیادہ حصہ گورکھپور میں گذرا۔ ان کی زندگی کے تفصیلی حالات تو معلوم نہیں مگر اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ پریشانی اور افلاس میں زندگی گذری لیکن کلام دیکھئے تو کہیں حزن و ملال کا نام نہیں ۱۹۳۴ء میں گورکھپور میں انتقال کیا

آذرؔ کی باری آئی۔ فارسی کے شعر خوب کہتے ہیں۔ اردو کی غزلیں ذرا پھیکی ہوتی ہیں۔ لکھا تھا۔

پی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں   ساقیا لیجیو سنبھال ہمیں
شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر   گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں

ان کے بعد شمع مرزا پایۂ رفعت کے سامنے آئی۔ یہ سلاطین زادے ہیں۔ بٹیریں لڑانے کا بڑا شوق ہے۔ شعر بھی خوب کہتے ہیں لکھا تھا۔

بسان طائر رنگ پریدہ وحشت سے
کسے دماغ ہے اب آشیاں بنانے کا
گندھی تھی کون سے بدست تشنہ لب کی وہ خاک
کہ جس سے خم یہ بنا ہے شراب خانے کا
بذوق یار کو دے رخصت جفا کہ یہاں
ہمیں بھی عزم ہے طاقت کے آزمانے کا
ہیں ایک وہ بھی کہ تم سے ہے جن کو راز نہاں
اور ایک ہم ہیں کہ تکتے ہیں منہ زمانے کا

آخری شعر میں مایوسی کی جو تصویر کھینچی ہے۔ اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ کوئی نہ تھا کہ اس شعر کے دوسرے مصرعے کو پڑھ پڑھ کر نہ جھومتا، اور بار بار واہ واہ اور سبحان اللہ نہ کہتا۔ ہوتے ہوتے میاں عارف کی باری آ ہی گئی۔ بھلا ان کو مشاعرے کے انتظام سے کب فرصت تھی جو غزل لکھتے۔ پھر بھی چلتے پھرتے کچھ لکھ ہی لیا تھا۔ وہی پڑھ دیا۔ اس دن رات کی گردش کے بعد اتنا بھی لکھ لینا کمال ہے۔ غزل تھی۔

اٹھتا قدم جو آگے کو اے نامہ بر نہیں
پیچھے تو چھوڑ آئے کہیں اس کا گھر نہیں
اوروں کو ہو تو ہو ہمیں مرنے کا ڈر نہیں
خط لے کے ہم ہی جاتے ہیں گر نامہ بر نہیں

مطلع کی سب نے تعریف کی۔ استاد احسان نے کہا۔ ”میاں عارف، میں بھی شعر کہتے کہتے بڈھا ہو گیا ہوں۔ لاکھوں شعر سنے، لاکھوں سنائے مگر یہ مضمون بالکل نیا ہے۔ اور کس خوبی سے ادا کیا ہے کہ دل خوش ہو گیا۔“

میاں عارف کے بعد شمع مرزا غلام نصیر الدین عرف مرزا منجھلے کے سامنے آئی۔ یہ شہزادے ہیں۔ احسان کے شاگرد ہیں۔ اور قناعت تخلص کرتے ہیں۔ غزل خاصی کہتے ہیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ شہزادوں میں بہت کم ایسے شاعر ہوں گے۔ غزل تھی۔

شوق کو کثرت نظارہ سے رشک آتا ہے

فانی بدایونی

فانی ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے شوکت علی خاں نام۔ فانی تخلص بدایوں کے رہنے والے۔ آپ کے والد کابل سے شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں دہلی آئے۔ فانی نے ۱۹۰۱ء میں بریلی سے بی۔ اے کیا۔ پھر علی گڑھ سے وکالت کی ڈگری لی لیکن وکالت سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ کسی کے شاگرد نہ ہوئے ۱۸۹۹ء میں ایک حادثہ جانکاہ سے متاثر ہو کر آپ نے اپنا تخلص فانی رکھا۔ فانی کی زندگی مایوسیوں اور ناکامیوں کی داستان ہے۔ ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد دکن میں انتقال کیا۔

حشر سے پہلے میسر ہو وہ دیدار مجھے

کعبے تک جانے میں تھی خاطرِ زاہد ورنہ
دیر میں بھی تھی سدا رخصتِ دیدار مجھے

جنس دزدیدہ کی مانند ہے الجھاؤ میں جان
کر نہ لیتا ہے، نہ پھیرے ہے خریدار مجھے

رازِ دل لب پہ نہ لاتا کبھی منصور کر یاں
کر دیا بات کے کہنے نے گنہگار مجھے

شمع کا حکیم آغا جان عیش کے سامنے آنا تھا کہ لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ حکیم صاحب بادشاہی اور خاندانی طبیب ہیں۔ زیورِ علم سے آراستہ اور کمالات سے پیراستہ، صاحبِ اخلاق، خوش مزاج، شیریں کلام اور شگفتہ صورت، جب دیکھو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسکرا رہے ہیں۔ طبیعت ایسی ظریف و لطیف اور لطیفہ سنج پائی ہے کہ سبحان اللہ۔ کچھ دنوں سے انکے دوست بھی ان سے ذرا کھنچ گئے تھے۔ میاں ہدہد کو پال کر انہوں نے سب بگاڑ لی۔ لیکن جب اس نے استادوں پر حملے شروع کیے اس وقت سے ہدہد کے ساتھ حکیم صاحب سے بھی لوگوں کو کچھ نفرت سی ہو گئی۔ غضب یہ کیا کہ اجمیری دروازے والے مشاعرے میں خود انہوں نے مرزا نوشہ پر کھلا ہوا حملہ کر دیا۔ ایک قطعہ لکھا تھا۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مولوی عبدالعلی نے کہا، "حکیم صاحب! شعر کے سمجھ میں نہ آنے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو شعر ہی بے معنی ہے یا سمجھنے والے کے دماغ کا قصور ہے۔ ہم سب تو ان کے شعر کو سمجھتے ہیں، پھر آپ نے ہم غریبوں کو کیوں پیٹ لیا۔"

مومن خاں نے کہا، "بھئی مجھے تو اس قطعے کے تیسرے مصرعے میں شاعرانہ تعلّی معلوم ہوتی ہے۔" بہرحال بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔ اس معرکے کے بعد یہ دوسرا موقع تھا کہ حکیم صاحب مشاعرے میں تشریف لائے تھے۔ میر صاحب نے ہدہد کے مقابلے میں جو اعلانِ جنگ کیا تھا وہ سن چکے تھے۔ اب جو لوگوں میں کانا پھوسی ہونے لگی، اس سے اور بھی پریشان ہوئے۔ پڑھنے میں تامل کیا۔ آخر مرزا فخرو کے اصرار پر غزل پڑھی۔

دل پہ جھگڑا تھا دل دیجیے ہی بنی   صلح ان سے ہمیں کیے ہی بنی

اصغر حسین نام۔ اصغر تخلص ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ آباد اجداد گورکھپور کے رہنے والے تھے۔ اصغر کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ کسی مدرسہ یا کالج میں مستقل طور پر نہیں پڑھا۔ جو کچھ قابلیت پیدا کی۔ وہ آپ کے ذاتی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح شاعری میں بھی کسی کے باقاعدہ شاگرد نہیں ہوئے۔ پہلے منشی جلیل احمد وجد بلگرامی سے اصلاح لیتے رہے۔ پھر چند غزلیں منشی امیراللہ تسلیم لکھنوی کو دکھائیں۔ اصغر متقی اور پرہیزگار تھے۔ ۱۹۳۶ء میں انتقال ہوا۔

آخری شمع

زہد و تقویٰ دھرے رہے سارے — ہاتھ سے اس کے مے پیے ہی بنی
لائے وہ ساتھ غیر کو ناچار — پاس اپنے بٹھائے ہی بنی
کس کا تھا پاسِ شوق ظلمِ عشق — ان جفاؤں پہ بھی جیے ہی بنی

جب ایسی غزل ہو تو بھلا کون تعریف نہ کرے۔ صلِ علیٰ کے شور اور سبحان اللہ کی آوازوں نے پڑھنے والے اور سننے والوں کے دلوں سے غبارِ کدورت دور کر دیا۔

حکیم صاحب کے بعد مرزا رحیم الدین حیا کا نمبر آیا۔ بڑے خوش طبع، ذہین، نیک فطرت اور ظریف آدمی تھے۔ کوئی ۳۵-۳۶ سال کی عمر ہے۔ اکثر بنارس میں رہتے ہیں۔ کبھی کبھی دہلی چلے آتے ہیں۔ شاعر بھی اچھے ہیں، مگر محنت نہیں کرتے۔ زبان کی چاشنی پر مضمون کو نثار کر دیتے ہیں۔ یہ غزل لکھ کر لائے تھے۔

موت ہی چارہ سازِ فرقت ہے — رنج مرنے کا مجھ کو راحت ہے
ہو چکا وصل، وقت رخصت ہے — اے اجل جلد آ کہ فرصت ہے
کاروانِ عمر کا ہے رخت بدوش — ہر نفس بانگ کوس رحلت ہے

تم بھی اپنے حیا کو دیکھ آؤ
آج اس کی کچھ اور حالت ہے

اب شمع مولانا صہبائی کے روبرو آئی۔ ان کی علمیت کا ڈنکا تو تمام ہندوستان میں بج رہا ہے۔ ایسے جامع الکمال کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ہزاروں شاگرد ہیں۔ اکثر ریختہ کہتے ہیں۔ ان کو اصلاح دیتے ہیں اور خوب دیتے ہیں۔ مگر خود ان کا کلام تمام و کمال فارسی ہے۔ میں نے تو ریختے میں نہ کبھی ان کی کوئی غزل دیکھی نہ سنی انہوں نے مشاعرے میں فارسی کی غزل پڑھی۔ خوب خوب تعریفیں ہوئیں مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ لوگوں کو مزہ نہ آیا۔

ہمچو شبنم خویش را فارغ ز عالم ساختم
محرم خورشید گشتم باخساں کم ساختم
مردم ودر چشمِ مردم عالمے تاریک گشت
من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم
کفر در کیشم سپاسِ نعمتِ دیدار اوست
جلوہ در ہر رنگ دیدم گردنے خم ساختم
جرمِ عشقم راجزا شد حور و من از ہجر دست
داغ بر دل بردم و خلدش جہنم ساختم
نیست صہبائی جو جامِ جم نصیبم گو مباد
مے ز خونِ دل کشیدم خویش راجم ساختم

مقطع پر اتنی تعریفیں ہوئیں کہ بیان سے باہر ہے مگر جو

بچارے فارسی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ بیٹھے منہ دیکھا کئے۔ صاف صاف بات تو یہ ہے کہ اردو مشاعرے میں فارسی کو ٹھونسنا کچھ مجھے بھی پسند نہ آیا۔

آہاہا! زبان کا لطف اٹھانا ہے تو اب سید ظہیرالدین حسین خاں ظہیر کو سنئے۔ ابھی ۳۰۔۳۲ سال کی عمر ہے مگر کلام میں خدا نے وہ اثر دیا ہے کہ واہ واہ۔ استاد ذوق کی اصلاح نے اور سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ غزل ہوئی تھی۔

جبیں اور شوق اس کے آستاں کا — ارادہ اور ارادہ بھی کہاں کا
لٹا ہے قافلہ تاب و تواں کا — خدا حافظ ہے دل کے کارواں کا
مری درماندگی منزل رساں ہے — سراغ نقش پا ہوں کارواں کا
رہے پابند دل کے دل میں ارماں — قدم منزل نے پکڑا کارواں کا
اٹھا سکتے نہیں سر آستاں سے — غضب ہے بار منت پاسباں کا
ہمیشہ موردِ برق و بلا ہوں — مٹے جھگڑا الٰہی آشیاں کا
دلِ بیتاب نے وہ بھی مٹایا — کسی کو کچھ جو دھوکا تھا فغاں کا

ظہیر آؤ چلو اب بے کدے کو
نکالا زہد و تقویٰ ہے کہاں کا

اور تو اور استادانِ فن نے اس غزل کی ایسی داد دی کہ میاں ظہیر کا دل غنچے کی طرح کھل گیا۔ تیسرے شعر پر تو یہ حالت تھی کہ تعریفوں کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ سلام کرتے کرتے بچارے کے ہاتھ دکھ گئے ہوں گے۔ جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی جانب کی شمع نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے سامنے آئی۔ ان کا کیا کہنا۔ یہ استادانِ فن میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مومن کے شاگرد ہیں مگر خود استاد ہیں۔ انہوں نے کسی شعر کی تعریف کی اور اس کی وقعت بڑھی۔ یہ بن کر ذرا خاموش ہوئے اور شعر دوسروں کی نظر سے بھی گر گیا۔ زبان کے ساتھ مضمون کو ترتیب دینا ایسے ہی لوگوں کا کام ہے۔ پڑھتے بھی ہیں تو ایک ایک لفظ سمجھا سمجھا کر، آواز ایسی اونچی ہے کہ دور اور پاس سب کو صاف سنائی دے۔ غزل پڑھنے سے پہلے ادھر ادھر دیکھا۔ ذرا انگرکھا درست

جگر مرادآبادی

جگر مرادآبادی ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے علی سکندر نام۔ جگر تخلص مرادآباد کے رہنے والے۔ آپ کا خاندان نہایت ممتاز اور بااثر تھا آپ کے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد سمیع دہلی کے رہنے والے تھے۔ اور شاہجہاں بادشاہ کے استاد تھے۔ ایک موقعہ پر عتاب شاہی کی وجہ سے ترک سکونت کر کے مرادآباد چلے گئے۔ اور وہیں کے ہو رہے۔ جگر کو ابتدا میں فصیح الملک داغ دہلوی سے اور ان کے بعد منشی امیراللہ تسلیم لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ ۱۹۶۰ء میں انتقال ہوا۔

کیا، ٹوپی درست کی۔ آستینوں کو چڑھایا اور یہ غزل پڑھی۔ آخری شمع

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں
گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں
سب اس میں محو اور یہ سب سے علاحدہ
آئینہ میں ہے آب، نہ آئینہ آب میں
معنی کی فکر چاہیئے صورت سے کیا حصول

ملزم ہوا ہوں پر نہیں عاجز جواب میں

تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو مگر حضور

اس وقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

غزل تو ایسی ہے کہ بھلا کس کا منہ ہے جو تعریف کا حق ادا کر سکے۔ مگر تعریف سنبھل سنبھل کر کی گئی۔ بڑے مشاعروں میں میں نے ہمیشہ دیکھا کہ نو مشقوں کے دل تو تعریف سے خوب بڑھاتے ہیں۔ مگر جب استادوں کے پڑھنے کی نوبت آتی ہے تو وہ جوش و خروش نہیں رہتا بلکہ جوش کے بجائے متانت زیادہ آجاتی ہے۔ استادوں کے ان ہی شعروں کی تعریف ہوتی ہے جو واقعی تعریف کے قابل ہوں اگر کسی شعر کی ذرا بے جا تعریف کر دی جائے تو الٹی ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ صرف اسی کلام کی تعریف جس کو یہ خود سمجھتے ہیں کہ اس کی تعریف ہونی چاہئے۔ شعر پڑھ کر اگر دیکھتے بھی ہیں تو اپنے برابر والوں کی طرف اور وہی داد بھی دیتے ہیں۔

ان کے بعد شہزادہ مرزا قادر بخش صابر کی باری آئی۔ یہ کوئی چالیس برس کے ہوں گے۔ ان کی شاعری کی قلعہ میں بڑی دھوم ہے۔ خود ان کو بھی اپنے کلام پر ناز ہے۔

اب اس کلام پر ان کو استاد کہو یا جو جی چاہے۔ غزل میں بھی یہی پھیکا رنگ ہے۔ مضمون بھی کچھ بلند پایہ نہیں ہے۔ مگر سارا شہر ان کو استاد مانتا ہے۔ ہوں گے۔ ممکن ہے۔ میری ہی سمجھ کا پھیر ہو غزل یہی تھی۔

نظارہ برقِ حسن کا دشوار ہو گیا

جلوہٗ حجاب دیدۂ بیدار ہو گیا

محفل میں میں تو اس لب میگوں کے سامنے

نام شراب لے کے گنہگار ہو گیا

حائل ہوئی نقاب تو ٹھیری نگاہ شوق

پردہ ہی جلوہ گاہِ رخ یار ہو گیا

اس کی گلی میں آن کے کیا کیا اٹھائے رنج

خاکِ شفا ملی تو میں بیمار ہو گیا

پیری میں ہم کو قطع تعلق ہوا نصیب

جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے شبیر حسین خاں نام۔ جوش تخلص۔ ملیح آباد وطن۔ آپ کے بزرگ کابل سے تشریف لائے ملیح آباد میں سکونت اختیار کی۔ آپ کے دادا فقیر محمد گویا تھے۔ شاعری آپ کے یہاں چار پشت سے ہوتی آئی ہے۔ چنانچہ جوش بھی دس برس کی عمر سے شعر کہنے لگے۔ شروع میں عزیز لکھنوی سے اصلاح لی۔ ان کے بعد اپنے ذوق سلیم اور وجدان صحیح کو اپنا استاد بنا لیا۔ جوش نے لکھنؤ کی فضا اور تاریخ کے اسکول میں تعلیم پائی۔

کیا فائدہ ہے موج اگر ہے سراب میں

ذات و صفات میں بھی یہی ربط چاہیئے

جوں آفتاب و روشنی آفتاب میں

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا

وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

بیباک شیوہ، شوخ طبیعت، زباں دراز

صفی لکھنوی

سید علی نقی نام۔ صفی تخلص۔ لسان القوم خطاب۔ لکھنؤ وطن پیدائش ۱۸۶۲ء۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آپ نے کیننگ کالجیٹ لکھنؤ سے انٹرنس پاس کیا۔ ۱۸۷۹ء میں محکمۂ دیوانی میں ملازم ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں پنشن لی۔ شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا لیکن کسی سے تلمذ حاصل نہیں کیا۔ مولانا صفی کی ذات ان لوگوں میں سے تھی جنہوں نے لکھنؤ اسکول کی شاعری کے دامن کو داغِ بدنامی سے پاک کیا۔ امیر اور داغ کے بعد صفی نے بھی اردو غزل میں ایک نئی روح پھونکی۔ زبان اتنی نرم اور شیریں ہے کہ پڑھنے والے کو ایک غزل کئی بار پڑھنے پر بھی سیری نہیں ہوتی۔

قامت خمیدہ ہوتے ہی تلوار ہو گیا

یہ پڑھ چکے تو شمع مفتی صدر الدین صاحب آزردہ کے سامنے پہنچی۔ اس پلّے کے عالم شاعر نہیں ہوتے اور ہوتے ہیں تو اُستاد ہو جاتے ہیں۔ مفتی صاحب کے جتنے شاگرد جیّد عالم ہیں اُس سے کہیں زیادہ اُن کے تلامذہ شاعر ہیں اور شاعر بھی کیسے کہ بڑے پائے کے۔ مفتی صاحب کہتے تو خوب ہیں مگر پڑھتے اس طرح ہیں کہ گویا طالب علموں کو سبق دے رہے ہیں۔ آواز ذرا نیچی ہے لیکن ان کی وجاہت کا یہ اثر ہے کہ مشاعرے میں سناٹا ہوتا ہے اور تعریف بھی ہوتی ہے تو خاص خاص شعروں پر اور بہت نیچی آواز میں۔ ہاں مرزا نوشہ ان سے مذاق کرنے میں نہیں چوکتے۔ کبھی کبھی اعتراض بھی کر بیٹھتے ہیں اور مزے مزے کی نوک جھونک ہو جاتی ہے۔ غزل ملاحظہ ہو کیا پختہ کلام ہے۔

باتوں سے میری کب تہ و بالا جہاں نہیں\
کب آسماں زمین و زمین آسماں نہیں

افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند\
کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں

شب اُس کو حالِ دل نے جتایا کچھ اس طرح\
ہیں لب تو کیا نگہ بھی ہوئی ترجماں نہیں

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں\
ایک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

کٹتی کسی طرح بھی نہیں یہ شبِ فراق\
شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

کہتا ہوں اس سے کچھ میں نکلتا ہے منہ سے کچھ\
کہنے کو یوں تو ہے گی زباں اور زباں نہیں

آزردہ ہونٹ تک نہ ہلے اُس کے روبرو\
مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

آزردہ جیسے اُستاد کے بعد نواب مرزا خاں داغ کا

آخری شمع

پڑھنا ایک عجیب سی چیز ہے مگر بات یہ ہے کہ اوّل تو داغ کو سب چاہتے ہیں، دل بڑھاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کسی دن یہی داغ ہندوستان کا چراغ ہوگا، دوسرے مرزا فخرو کے خیال سے ان کو اُستادوں میں جگہ ملی تھی۔ مگر اُنھوں نے غزل بھی ایسی پڑھی کہ اُستاد بھی قائل ہو گئے۔ ۱۷، ۱۸ برس کے لڑکے کا اس قیامت کی غزل اور اس جرأت سے پڑھنا واقعی

سیماب اکبر آبادی

عاشق حسین نام، سیماب تخلص، تلمیذ حضرت داغ دہلوی (اکبر آباد) آگرہ کے رہنے والے۔ مولوی محمد حسین صدیقی کے صاحبزادے ۱۸۸۰ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے علوم مشرقی کی تحصیل کے بعد گورنمنٹ کالج اجمیر میں علوم مغربی کی تکمیل کی اپنے فطری ذوق شعری اور خدمت زبان و ادب کے شوق سے اپنے وطن آگرہ میں قصر الادب کی بنیاد ڈالی آگرہ اسکول آپ کا قائم کیا ہوا ہے نظم و غزل دونوں میں طبع آزمائی کی ہے انکی شاعری کا موضوع حسن محض، و عشق محض تھا فلسفۂ حقائق و معارف کے نکات پسند کرتے تھے

کماں ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ جو زبان داغ نے لکھی ہے وہ شاید کسی کو نصیب ہو گی۔ ذرا زبان کی شوخی، مضمون کی رنگینی اور طبیعت کی روانی ملاحظہ کیجئے اور داد دیجئے۔

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں　　ناز والے نیاز کیا جانیں
شمع رُو آپ گو ہوئے لیکن　　لُطفِ سوز و گداز کیا جانیں
کب کسی در پہ جبہ سائی کی　　شیخ صاحب نماز کیا جانیں
جو رہِ عشق میں قدم رکھیں　　وہ نشیب و فراز کیا جانیں
پوچھیے میکشوں سے لُطفِ مے　　یہ تمہارا پاک باز کیا جانیں
جن کو اپنی خبر نہیں اب تک　　وہ مرے دل کا راز کیا جانیں
حضرتِ خضر جب شہید نہ ہوں　　لُطفِ عمرِ دراز کیا جانیں
جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے　　آپ بندہ نواز کیا جانیں

اللہ اللہ! وہ سُہانا وقت، وہ پھوٹی سی آواز، وہ دل کش لَے، وہ الفاظ کی نشست، وہ بندش کی خوبصورتی اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ داغ کی بھولی بھالی شکل ایک عجیب لُطف دے رہی تھی ساری محفل میں کوئی نہ تھا جو متحیر نہ ہو گیا ہو اور کوئی نہ تھا جس کے منہ سے جزاک اللہ، سبحان اللہ اور صلِ علیٰ کے الفاظ بے ساختہ نہ نکل رہے ہوں۔ مرزا فخرو کی تو یہ حالت تھی کہ گھڑی گھڑی پہلو بدلتے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے تھے۔ غزل ختم ہوئی اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ کب ختم ہو گئی۔ جب شمع حکیم مومن خاں مومن کے سامنے پہنچ گئی۔ اس وقت لوگوں کا جوش کم ہوا اور اس نکتے کے اُستاد کا کلام سُننے کو سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اُنھوں نے شمع کو اُٹھا کر ذرا آگے رکھا، ذرا سنبھل کر بیٹھے، بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی، ٹوپی کو ترچھا کیا۔ آستینوں کی چُنٹ کو صاف کیا اور بڑی درد انگیز آواز میں دل پذیر ترنم کے ساتھ یہ غزل پڑھی۔

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ
بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ
دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ
مانگا کریں گے اب سے دُعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دُعا کے ساتھ
ہے کس کا انتظار کہ خوابِ عدم سے بھی
ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ
سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر

یوں رُوئیے زار زار تو اہلِ عزا کے ساتھ

بے پردہ غیر پاس اُسے بیٹھا نہ دیکھئے
اُٹھ جائے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

اُس کی گلی کہاں، یہ تو کچھ باغِ خلد ہے
کس جائے مجھ کو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ

اللہ رے گمرہی، بُت و بُت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

شاعری کیا تھی، جادو تھا۔ تمام لوگ ایک عالمِ محویت میں بیٹھے تھے۔ وہ خود بھی اپنے کلام کا مزہ لے رہے تھے جس شعر میں ان کو زیادہ لطف آتا تھا اُس کے پڑھتے وقت ان کی انگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں میں چلنے لگتی تھیں، بہت زیادہ تیزی سے بالوں میں چلنے لگتی تھیں، بہت زیادہ جوش میں آ تو کاکلوں کو انگلیوں میں بل دے کر مروڑنے لگے۔ کسی نے تعریف کی تو گردن جھکا کر ذرا مسکرا دیئے۔ پڑھنے کا طرز بھی سب سے جُدا تھا۔ ہاتھ بہت کم ہلاتے تھے اور ہلاتے بھی کیسے، ہاتھوں کو بالوں سے کب فرصت تھی۔ ہاں آواز کے زیر و بم اور آنکھوں کے اشاروں سے جادو سا کر جاتے تھے غزل ختم ہوئی تو تمام شعراء نے تعریف کی۔ سُنکر مسکرائے اور کہا "آپ لوگوں کی یہی عنایت تو ہماری ساری محنت کا صلہ ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں ؎

ہم داد کے خواہاں ہیں نہیں طالبِ زر کچھ
تحسینِ سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

ان کے بعد شمع اُستاد احسان کے سامنے آئی۔ میں سمجھتا تھا کہ اُن کی آواز کیا خاک نکلے گی۔ مگر شمع کے پہنچتے ہی وہ تو کچھ بدل گئے سے ہو گئے اور اتنی بلند آواز سے غزل پڑھی کہ تمام مجلس پر چھا گئے کسی شعر پر مومن خاں کو متوجہ کرتے، کسی شعر پر مرزا نوشہ کو، کسی پر اُستاد ذوق کو اُن کی عظمت کچھ لوگوں کے دلوں

سائل دہلوی

نواب سراج الدین احمد خاں نام۔ بوالمظفر لقب، سائل تخلص، تاریخی نام "مرزا سراج دین خاں" ہے۔ آپ کا نام اور تخلص دونوں تاریخی حیثیت رکھتے ہیں نام مرزا غالب کا نکالا ہوا ہے اور تخلص نواب غلام حسین خاں محمود شاگرد مرزا غالب نے قرعہ اندازی کے بعد رکھا۔ سائل صاحب کی زبان کا کیا کہنا پرانی دلی کی شستہ اور شہری زبان کا مکمل نمونہ ہے داغ کی جیتی بولتی تصویر تھے۔ صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ اشعار بے شمار کہے لیکن ابھی تک کوئی مجموعہ مرتب ہو کر شائع نہ ہو سکا۔

آخری شمع

ایسی چھائی ہوئی تھی کہ جسکو انھوں نے متوجہ کیا اس کو تعریف ہی کرتے بن پڑی۔ ردیف قافیہ بڑا سخت تھا مگر ان کی سادگی کی داد دینی چاہئے کہ ان دشواریوں پر بھی ساری کی ساری غزل مرصع کہہ گئے ہیں۔ ہائے کیا کہتے ہیں۔

تو کیوں ہے گریہ کناں اے مِرے دلِ محزوں
نہ رو نہ رو کہ نہ تجھ کو کبھی رُلائے خدا

جب یہ پڑھ چکے تو مرزا غالب کی باری آئی۔ یہ رنگ ہی دوسرا تھا صبح ہو چلی تھی۔ شمع کے سامنے آتے ہی فرمانے لگے "صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں"۔ یہ کہہ کر ایسے دل کش اور مؤثر لہجے میں غزل پڑھی کہ ساری محفل محو ہو گئی۔ آواز بہت اونچی اور پُر درد تھی، یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدرداں نہیں پاتے۔ اور اس لیے غزل میں فریاد کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ غزل تھی۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ۔۔۔ آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار ۔۔۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں ۔۔۔ کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود ۔۔۔ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ۔۔۔ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے ۔۔۔ نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ۔۔۔ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید ۔۔۔ جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا ۔۔۔ اور درویش کی صدا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں ۔۔۔ میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب ۔۔۔ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

غزل پڑھ کر مسکرائے اور کہا: "اس پر بھی نہ سمجھیں وہ تو پھر ان سے خدا سمجھے"۔ حکیم آغا جان سمجھ گئے اور کہنے لگے "مرزا صاحب! غنیمت ہے کہ تم اس رنگ کو آخر ذرا سمجھے"۔ غزل تعریف کے ساتھ ساتھ مذاق بھی ہوتا رہا۔ اور شمع اُستاد ذوق کے سامنے پہنچ گئی۔ اُستاد نے مرزا فخرو کی طرف دیکھ کر کہا "صاحب عالم! غزل پڑھوں یا کل جو قطعہ ہوا ہے وہ عرض کروں۔ کل رات خدا جانے کیا بات تھی کہ کسی طرح نیند ہی نہیں آتی تھی لوٹتے لوٹتے صبح ہو گئی۔ شب ہجراں کا مزہ آ گیا اسی کش مکش میں قطعہ ہو گیا۔ اجازت ہو تو عرض کروں"۔ مرزا فخرو نے کہا۔ اُستاد آج کا مشاعرہ سب بندوں سے آزاد ہے، غزل پڑھیے رُباعی

ابوالکلام آزاد

محی الدین احمد نام، والد ماجد کا نام مولانا خیرالدین۔ آبائی وطن دہلی۔ حجاز و مصر میں تعلیم حاصل کی۔ آزاد نے ہندوستان آنے کے بعد کلکتہ میں رہائش اختیار کی اور رسالہ "الہلال" نکالا جس کے خاص اسلوبِ تحریر اور طرزِ ادا نے اردو ادب میں حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا پھر "البلاغ" جاری کیا۔ مولانا ہندوستان کے مشہور سیاستداں، مصنف، مقرر اور زبردست اہلِ قلم تھے ان کی تحریر میں علمی شان، بیان میں شوکت و رعنائی اور زبان میں متانت کے ساتھ بانکپن بھی ہے ۱۹۴۷ء سے ۵۸ء تک آزاد ہندوستان کے وزیرِ تعلیم رہے۔ مولانا اردو کے بہترین انشاپردازوں میں جس پر اردو ہمیشہ ناز کرے گی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ تفسیر قرآن ہے۔ فروری ۱۹۵۸ء دہلی میں انتقال ہوا۔

آخری شمع

بُتو! بتاؤ تو کیا تم خدا کو دو گے جواب
خدا کے بندوں پہ یہ ظلم بندہ ہائے خدا

رضا پہ تیری ہوں دن رات اے صنم مصروف
جو اس پہ تو نہیں راضی، نہ ہو، رضائے خدا

بتوں کے کوچے میں کہتا تھا کل یہی احسان
یہاں کسی کا نہیں ہے کوئی سوائے خدا

سید سلیمان ندوی

پیدائش ۱۸۸۴ء، وطن عظیم آباد پٹنہ، والد کا نام حکیم سید ابوالحسن۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی اور خوش قسمتی سے مولانا شبلی جیسے بے مثل ادیب، محقق اور مفکر استاد ملے۔ ان کی نظر انتخاب بھی انہی کو اپنا جانشین بنایا۔ عربی ادب و تاریخ کے ذوق نے ان کو بجائے طبیب کے ادیب بنا دیا مولانا شبلی نے بستر مرگ پر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر "سیرت سیرت" کہا تھا۔ مولانا سلیمان نے یہ حق ادا کیا اور سیرت النبی کی بقیہ چار جلدیں لکھیں۔ مولانا کی تحریروں میں علمیت اور ادبیت کے ساتھ ایک زور اور حلاوت پائی جاتی ہے۔ ۱۹۵۳ء میں کراچی میں انتقال فرمایا۔

پڑھیئے۔ قطعہ پڑھیئے، غرض جو دل چاہے پڑھیئے، ہاں پڑھیئے کچھ نہ کچھ ضرور"۔

•

اُستاد ذوق سنبھل کر بیٹھ گئے، اور یہ قطعہ ایسی بلند اور خوش آہنگ آواز میں پڑھا کہ محفل گونج اُٹھی اور اُن کے پڑھنے کے انداز نے کلام میں تاثیر اور زیادہ زور پیدا کر دیا۔

کہوں کیا ذوق احوالِ شبِ ہجر — کہ تھی اِک اِک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اندھیر — مرے بختِ سیاہ کی تیرگی نے
تپِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم — اندھاتے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے — کہ اے بے مہر، بدا ختر، کمینے
مری جاں بہ لب ہے دل میں کینے — کہاں میں اور کہاں یہ شب کہ تھے
سوا اس ظلمت کے پردے میں کئے ظلم — مرے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج — پڑے یہ زہر کے ہے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے — قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سُنکر — پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اُٹھایا آہ اور گلہ بٹھایا — مجھے بے تابی بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ — بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ — بہت سی جان توڑی جانکنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی — طلوعِ صبح سے منھ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات — یقیں ہے صبح تک دیگی نہ جینے
لگے پانی چُوانے منھ میں آنسو — پڑھی یٰسین سرہانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی — لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریبِ خانہ میرے — اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
بشارت مجھکو صبحِ وصل کی دی — اذاں کے ساتھ میمن و فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر — کہ خوش ہو کر کہا یہ خود خوشی نے

مؤذن مرحبا بر وقت بولا
تری آواز مکّے اور مدینے

آخری شعر پر پہنچے تھے کہ برابر کی مسجد سے آواز آئی "اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر اللہ اکبر"۔ اس کے ساتھ ہی سب کے منھ سے نکلا "تری آواز مکّے اور مدینے"۔ اذان ختم ہوئی تو سب نے دعا کو ہاتھ اٹھائے۔ دُعا سے فارغ ہو کر مرزا فخرو نے کہا صاحبو! کچھ عجیب اتفاق ہے کہ فاتحہ خیر سے ہی یہ مشاعرہ شروع ہوا تھا اور اب فاتحہ خیر ہی پر ختم ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے دونوں شمعوں کو جو جلتی رکھا کر ان کے سامنے لگی تھیں بجھا دیا شمعوں کے گُل ہوتے ہی نقیبوں نے آواز دی "حضرات! مشاعرہ ختم ہوا"۔ یہ سُننا تھا

کر چلنے کو سب کھڑے ہو گئے۔ سب سے پہلے مرزا فخرو سوار ہوئے اور پھر سب ایک ایک کر کے رخصت ہوئے۔ آخر میں میں، اور نواب زین العابدین خاں رہ گئے۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگے "میاں کریم الدین یہ تمہاری نیک نیتی تھی جو اتنا بڑا مشاعرہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔ تمہارا کام بھی بن گیا اور میرا ارمان بھی نکل گیا! اچھا خدا حافظ"۔

[illegible]

۱۸۷۰ء میں ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے ۱۹۶۱ء میں کراچی میں انتقال ہوا ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ سے بی اے پاس کیا اور وہیں سر سید اور مولانا حالی کی صحبتیں رہیں پھر عثمانیہ کالج اورنگ آباد کے پرنسپل اور حیدرآباد دکن میں جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبۂ اردو مقرر ہوئے پچاس سال تک انجمن ترقی اردو کے سکریٹری رہے۔ ۱۹۳۸ء میں انجمن کا دفتر حیدرآباد دکن سے دہلی منتقل کیا اور آزادی ۱۹۴۷ء کے بعد دہلی سے کراچی چلے گئے انہوں نے اپنی تمام عمر اردو کی خدمت میں گزار دی مولوی عبدالحق کی نثر میں ایک خاص قسم کی پختگی ہے۔ ان کی تحریر متین، پر وقار، سنجیدہ

اور آسان ہے بحیثیت "زبان دان" اور "نقاد" ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ انجمن ترقی اردو دہلی نے ان کی نگرانی میں بے مثال تصانیف شائع کی ہیں۔

[illegible]

پنڈت برجموہن دتاتریہ نام کیفی تخلص۔ دہلی کے رہنے والے ۱۸۶۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے آپ کے بزرگ کشمیر سے بادشاہ فرخ سیر کے عہد میں دہلی آئے والد بزرگوار کا نام پنڈت کنہیا لال تھا صغیر سن تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا فارسی کی تکمیل اپنے نانا سے کی جو اس زبان کے جید عالم تھے شاعری کا مذاق اپنے ایک بزرگ پنڈت نرائن داس ضمیر دہلوی سے ورثہ میں پایا انگریزی زبان میں فضیلت کا درجہ رکھتے تھے انجمن ترقی اردو دہلی کے رکن خاص تھے اور آپ کو محقق زبان کا درجہ حاصل تھا۔

تلوک چند محروم

پیدائش یکم جولائی ۱۸۸۷ء مقام کا جراں والا ضلع میانوالی ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ ۶ جنوری ۱۹۶۶ء دہلی میں وفات پائی۔ تعلیم بی۔اے۔ اساتذہ کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا اور اپنے کلام کے ذریعہ قوم کے نوجوانوں میں ایک نئی روح پھونکی۔ گنج معانی، رباعیات محروم، مہرشی درشن، کاروان وطن، بہار طفلی، شعلۂ نوا، نیرنگ معانی، بچوں کی دنیا۔ آپکے کلام کا مجموعے ہیں۔ جو مختلف اوقات میں چھپتے رہے۔

فراق گورکھپوری

رگھوپتی سہائے نام۔ فراق تخلص گورکھپور وطن ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے آپکے والد کا نام منشی گورکھ پرشاد عبرت تھا۔ عبرت حالی کے ہمعصروں میں تھے اردو فارسی کی تعلیم گھر پر ہوئی فراق کے گھر میں بچپن سے ہی شعر و شاعری کا چرچا تھا ایم اے پاس کرنے کے بعد یو پی گورنمنٹ نے فورا ڈپٹی کلکٹری کے لئے منتخب کر لیا اور آئی سی ایس کے لئے نامزد کر دیا تھا مگر ڈپٹی کلکٹر بننے سے قبل آپ سیاسی تحریک میں شریک ہو گئے۔ آجکل آپ اپنی پرانی درسگاہ الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے لیکچرار ہیں فراق نے اپنی شاعری میں یہ چاہا ہے کہ وید اور ہندوستان کے شاندار قدیم ادب اور ہندو مزاج کی مخصوص پاکیزگی و لطافت نئے سرے جائیں

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

از مرقع چغتائی مصوّر

اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے — سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دامِ شنیدن جسقدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا

موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم۔ اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسن اور اس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عزّ و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے۔ پر نہ کرے خدا کہ یوں

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھیے
اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئنہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا | مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

ہوں دردمند جبر ہو یا اختیار ہو
گہ نالۂ کشیدہ گہ اشکِ چشیدہ ہوں

پیدا نہیں ہے اصلِ تگ و تازِ جستجو
مانندِ موجِ آب زبانِ بریدہ ہوں

جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بسکہ تلخیِ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں

نے سبحہ سے علاقہ نے ساغر سے واسطہ
میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں

ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
نے دانۂ فتادہ ہوں نے دامِ چیدہ ہوں

اہلِ ورع کے حلقہ میں ہر چند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے زمرہ میں میں برگزیدہ ہوں

ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
یعنی کلامِ نغز و لے ناشنیدہ ہوں
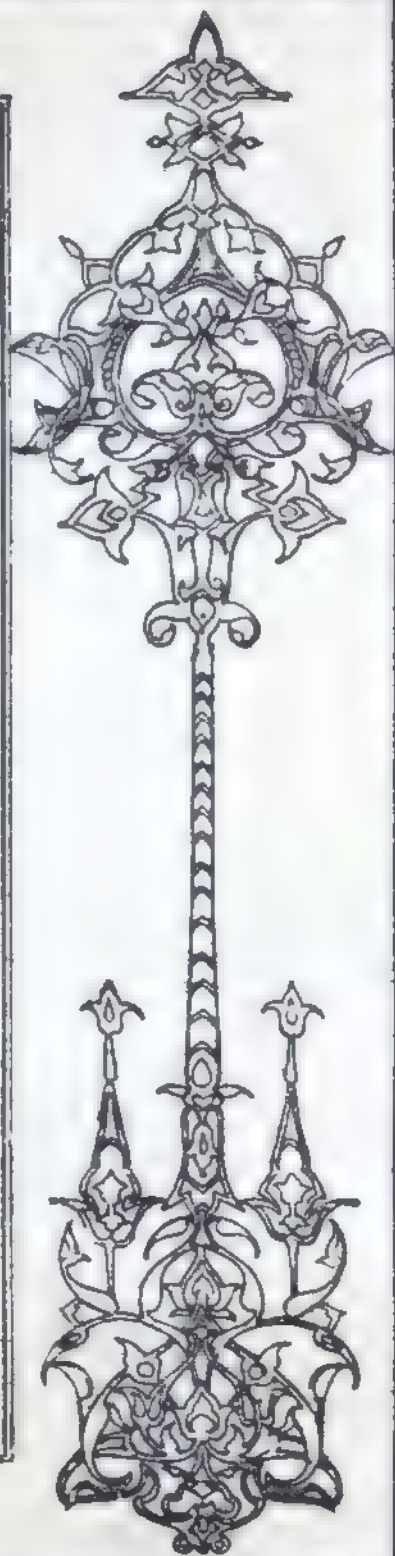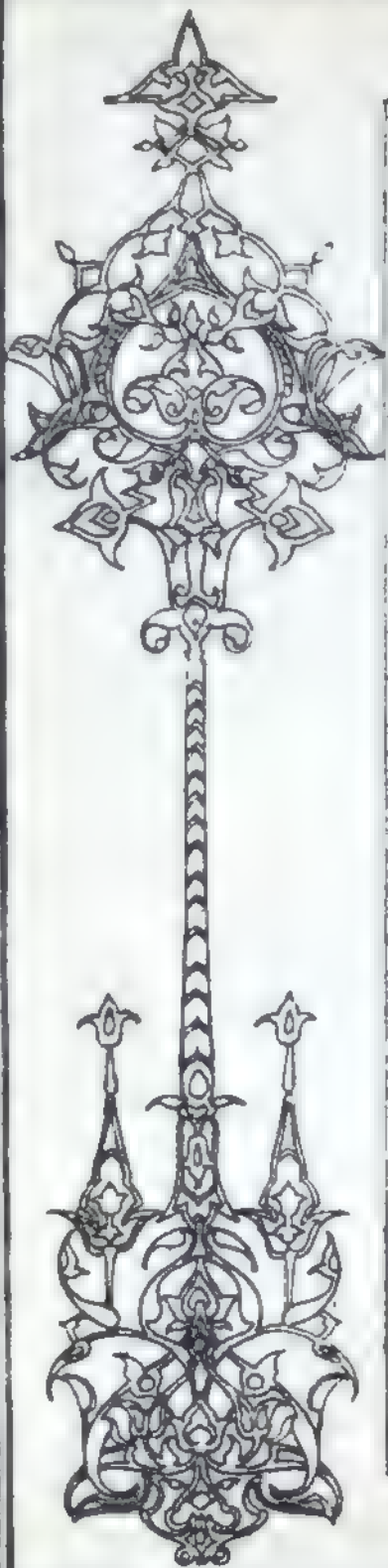
ہوں گرمیِ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج
مَیں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

میں چشمِ واکشادہ و گلشن نظر فریب
لیکن عبث کہ شبنمِ خورشید دیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ
خانۂ آگہی خراب دل نہ سمجھ بلا سمجھ

وحشتِ دردِ بیکسی بے اثر اس قدر نہیں
رشتۂ عمرِ خضر کو نالۂ نارسا سمجھ

گاہ بہ خلد امیدوار گہ بہ جحیم بیم ناک
گرچہ خدا کی یاد ہے کلفتِ ماسوا سمجھ

اے بہ سرابِ حسنِ خلق تشنۂ سعیِ امتحاں
شوق کو منفعل نہ کر ناز کو التجا سمجھ

نے سرو برگِ آرزو نے رہ و رسمِ گفتگو
اے دل و جانِ خلق تو ہم کو بھی آشنا سمجھ

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو ٭ سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل ، کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

واں اُس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار — یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ — آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو — صدرہ آہنگِ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے — کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہم کو

ضعف سے نقش پئے مور ہے طوقِ گردن — تیرے کوچے سے کہاں طاقت رم ہے ہم کو

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو — یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں — نالۂ مرغ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا — ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ ولیکن ناچار — پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہے ہم کو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو — ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی — ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر — عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب — جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو — مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے — قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

کیا وہ بھی بیگنہ کش و حق ناشناس ہیں — مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

ابھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار — مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست — لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

ہمیں پھر اُن سے اُمید اور انہیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

بتاؤ اُس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقولِ حضور
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اِس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جسکے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے
عمل چغتائی

شوق ہر رنگ رقیبِ سرو ساماں نکلا / قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے / میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر / ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں / صورتِ دُود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں / کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں / صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

بے خودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو / پُر ہے سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

شوقِ دیدار میں گر تُو مجھے گردن مارے / ہو نگہ مثلِ گُلِ شمع پریشاں مجھ سے

بے کسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے / سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے / آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد / ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے / کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بُلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل / اُس پہ بَن جائے کچھ ایسی کہ بِن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے / کاش یوں بھی ہو کہ بِن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر / کوئی پُوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

اِس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا / ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے / پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بِن آئے نہ رہے / تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بُلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے / کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب — کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے — صبح کے مانند زخمِ دل گریبانی کرے

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال — دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک — آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پائے شکست — موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو اُلفت نے عہد — یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے — ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا — تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہمکو — نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے — پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے — کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے — مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے

سرشکِ سر بصحرا دادہ نور العین دامن ہے — دلِ بے دست و پا اُفتادہ برخوردارِ بستر ہے

خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو — فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی — شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

ابھی آتی ہے بُو بالش سے اُسکی زلفِ مشکیں کی — ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالب — کہ بے تابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

خطر ہے رشتۂ اُلفت رگِ گردن نہ ہو جائے — غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے

سمجھ اس فصل میں کوتاہیٔ نشو و نما غالب — اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے :: صاحب کو دل نہ دینے پر کتنا غرور تھا

کسی مخفی گو نے داستان یوسف یوں بیان کی تھی شخصے بود بسرے داشت گم شد باز یافت. غالب نے اپنی زندگی کا خاکہ ان لفظوں میں پیش کیا ہے.

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

ہرچند قاعدہ یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں چنانچہ آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ کو میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا. تیرہ برس حوالات میں رہا. ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم حبس دوام صادر ہوا. ایک بیڑی پاؤں میں ڈالی اور شہر دلی کو زنداں مقرر کیا. فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا. برسوں کے بعد جیل خانہ سے بھاگا. تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا. پایان کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے. جب یہ دیکھا کہ قیدی گریز پا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں. پاؤں بیڑیوں سے فگار. ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخمدار. مشقت مقرری اور مشکل ہو گئی. طاقت یک قلم زائل ہو گئی. بے حیا ہوں بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگ بھاگا. میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا. کچھ کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا. اب عہد کیا ہے کہ پھر نہ بھاگوں گا. بھاگوں گا کیا بھاگنے کی طاقت بھی نہ رہی. حکم رہائی دیکھئے کب صادر ہو. بہر تقدیر بعد رہائی کے آدمی سوا اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا. میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا.

فرخ آں روز کہ از خانۂ زنداں بردم
سوئے شہر خود ازیں وادی ویراں بردم

اب ذرا اس اجمال کی تفصیل سنئے. غالب کی زندگی ہزاروں مشکلوں سے عبارت تھی. ان کا ہر دن پہاڑ کی طرح گزرتا اور ہر شام کو صبح کرنا جوئے شیر لانا تھا. پانچ برس کے تھے کہ باپ مرا، نو برس کے تھے جو چچا مرا اور وہ بے سروپائی کے عالم میں بہت دنوں سے جیتے رہے. بعد ایک زمانے کے بادشاہ دلی نے پچاس روپیہ مہینہ وظیفہ کر کے سرپرستی فرمائی. ان کے ولیعہد نے چار سو روپئے سال مقرر کیا. ولیعہد اس تقرر کے دو سال بعد مر گئے. واجد علی شاہ کی سرکار سے مدح گستری کا صلہ ملا. وہ اگرچہ جیتے رہے مگر سلطنت جاتی رہی. غرض یہ کہ جہاں گئے وہیں ان کے طالع برگشتہ نے اپنا رنگ دکھایا. فلک ستم شعار نے وہ ستم ڈھایا کہ زیست کرنا مشکل ہو گیا. مگر قربان ہیں اس مرد آہن پر کہ اس نے زندہ دلی، عزم اور ظرافت طبعی میں فرق نہ آنے دیا. کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم اور صراف سے دام قرض لیکر کھاتا رہا اور کبھی یہ نہ سوچا کہ کہاں سے دوں گا. پھر جب یہ فاقہ مستی رنگ لائی تو آپ اپنا حریف بن کے مذاق اڑایا. اپنے تئیں اپنا غیر متصور کیا جو کچھ بیتی

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

کبھی غالب کے ایک جوتی اور لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر ہوں آج دور دور تک میرا جواب نہیں، خاندانی وجاہت، نسلی برتری سب مٹی میں مل گئی۔ نجم الدولہ، دبیر الملک، سلجوقی اور افراسیابی غالب کو قرض خواہ جوتے سناتے رہے اور یہ سادہ لوح فلک کی طرف دیکھ اپنا شعر پڑھا کیا۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

یہ ہنگامہ غدر بپا ہوا۔ مئی ۱۸۵۷ء دوپہر دن چڑھے قہر الٰہی کا نزول ہوا، میرٹھ کے باغی دلی آئے۔ وہ فتنہ و فساد مچا یا کہ الحفیظ والاماں پانچ لشکروں کا حملہ پے بہ پے دلی شہر پر ہوا پہلا لشکر باغیوں کا اس میں شہر کا اعتبار لٹا، دوسرا لشکر خاکیوں کا اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا اس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مر گئے۔ چوتھا لشکر ہیضہ کا اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا اس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی اور غالب آتش نوا، عافیت کا دشمن یہ سب کچھ اپنی آنکھ سے دیکھتا رہا۔ جیتے جی مر گیا۔ غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت۔ جو غم تھا ایسا غم تھا کہ آدمی اس غم سے حواس کھو بیٹھے، سودائی ہو جائے۔ زندگی کی فضیلتوں سے منکر ہو کر دنیا و ما فیہا سے مایوس ہوا اور آخرت تک خراب ہو چلی۔ چھٹی ہوئی نہ یہاں کچھ ملا نہ وہاں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

دلی کو غالب کا وطن ہی سمجھئے۔ پیدا یہاں ہوئے اور کچھ دن بچپن کے گذار کے پھر یہیں آ بسے۔ اس دلی پر قیامت ٹوٹی۔ دہلی وہ دہلی نہ رہی جس میں غالب کیا دن برس سے مقیم تھے بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار، اردو بازار، اور خانم کا بازار اس طرح ڈھائے گئے کہ ان کا کچھ پتہ ملنا دشوار تھا۔ غالب کے دوست کچھ مرے کچھ بچھڑ گئے۔ وہ شخص جو شاگرد پیشہ میں ہر وقت احباب سے گھرا رہتا تھا اب یکہ و تنہا رہ گیا۔ ہزاروں کا ماتم دار ہوا۔

ذرا غور تو کیجئے ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو گا اس کا زیست کرنا کس قدر دشوار ہو گا۔ روح جسم میں اس طرح گھبراتی تھی جس طرح طائر قفس میں، کوئی شغل کوئی اختلاط، کوئی مجمع پسند نہ رہا۔ کتاب سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت، ضعف و سستی و گراں جانی، اور ہر دم اس وظیفے کا ورد کئے جاتا کہ،

؎ اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

یہ تھا تصویر کا ایک رخ اب ذرا دوسرا رخ دیکھئے جس کے سبب مجھے غالب کی شخصیت ان کی شاعری سے کہیں زیادہ عزیز ہے۔ غالب کو ابتدائے شباب میں ایک بزرگِ کامل نے نصیحت کی تھی کہ میاں پیو کھاؤ، مزے اڑاؤ مگر مصری کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو انکا تمام عمر اس نصیحت پر عمل رہا۔ کبھی کسی ستم پیشہ ڈومنی کو مار رکھا، کبھی اٹھ کر کوئے ملامت کے چکر لگائے کبھی ایک نو بہارِ ناز کو تاکا اور کبھی کسی کی زلفِ سیاہ رخ پہ پریشان دیکھیں تو مچل گئے، عرض و نیاز چھوڑ حریفانہ دامن کھینچنے پر آمادہ ہوئے۔ دھول دھپے سے دریغ نہ کیا اور بدمستی کر کے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ یہ کارنامے کوئی معرکے نہیں ہیں کہ غالب کی عزت و حرمت کو چار چاند لگائیں مگر جب ہم ان شوخیوں کو غالب کی زندگی اور ان کے بے پناہ مصائب کے پس منظر میں دیکھتے ہیں تو یہ معرکے محض معرکے نہیں رہتے معجزے ہو جاتے ہیں۔

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

اس کی رندی پر ہزار پاکبازیاں نثار ہیں۔ میرؔ نے کہا تھا۔

تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

مگر حقیقت یہ ہے کہ میر کا یہ دعویٰ محض ایک بات برائے سخن ہے انہوں نے چور، اچکوں، سکھ، مرہٹوں، جاٹوں اور ابدالیوں کے حملے دیکھے تو وہ ایک دیوار کے سائے میں جا بیٹھے۔ عافیت کے متلاشی ہوئے۔ غالب تلاطم خون کے شناور رہے۔ انہوں نے موج خون سر سے گذر جانے دی شمشیر عریاں کی دید ان کے لئے عید نظارہ ہوئی، آبلہ پائی سے گھبرائے تو دشت پرخار کی تلاش، گھر لٹنے پر رہزن کو دعائیں دیں اور ان کے در و دیوار پہ سبزہ اگا تو انہوں نے بہار سے تعبیر کیا۔ جان بوجھ کر زخم تمنا کھائے۔ جگر ریش ریش پہ نمک چھڑکا لیکن زندگی کا حوصلہ ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ بظاہر موت کی دعائیں مانگیں۔ مرنے کے بعد ہاویہ زاویہ سقر مقر ملنے کی پیشین گوئی کی مگر دل میں حوروں کی تمنا کو فروغ دیتے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

رہے "اگر پرسیدہ بخشیگی اور یک حور لِی، ایک قصر لِی۔ بے رے زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی — وہی زمردیں کاخ، وہی طوبیٰ کی شاخ، چشم بددور وہی ایک حور بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔

زنِ نو کن اے دوست در ہر بہار
کہ تقویم پارینہ نہ آید بکار

حشر میں حساب معصیت سے پہلے ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد چاہی۔ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے کا شکوہ

لے کر گئے" اور داورِ محشر کو زندگی کی محرومیوں کا فسانہ سنا بخشش کے طالب ہوتے۔

ع میں الزام انکو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

میر نے جس بار گراں کو با حسرت و یاس اٹھایا غالب اسے ہنستے کھیلتے اٹھائے پھرے۔ فانی پر زندگی ایک تہمت تھی۔ میر پر بار اور غالب پر اکرام و احسان۔ وہ ممنون خداوند بھی رہے۔ اور ان کی شوخیوں نے خالق کو وہ مزا بھی دیا جس کے لئے بقول درد انسان کی تخلیق عمل میں آئی تھی وہ غرق شراب ناب ہوئے اور پھر جامۂ احرام کے دھبے زمزم پہ بیٹھ کے دھوئے کعبہ جانے کا منہ نہ ہوا لیکن ثواب طاعت و زہد کے معترف ضرور رہے غالب کی شخصیت بڑی رنگا رنگ اور تہہ دار شخصیت تھی۔ وہ گاہ یزداں تھے گاہ اہرمن۔

ع جو ادھر چراغ حرم کی لو تو ادھر ہے کفر بھی شعلہ زن

وہ موحد خالص اور مومن کامل تھے شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتے تھے اور سوچتے تھے کہ اگر باری تعالیٰ انھیں جہنم میں ڈالیں گے تو ان کا جلانا مقصود نہ ہوگا۔ بلکہ دوزخ کا ایندھن بنیں گے اور دوزخ کی آنچ تیز کریں گے تاکہ مشرکین رسالت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں۔

ع اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما

کسی کا مصرعہ ہے "سراسر موم ہو یا سنگ ہو جا" غالب کی زندگی پر رکھ کے دیکھئے تو کس قدر مہمل نظر آتا ہے۔ ان کی شخصیت میں متنوع عناصر، متضاد اجزاء اور متناقض جوہر یکجا تھے یہی تخلیق کا کمال ہے۔ نابغہ ایسی ہی تخلیق کو کہتے ہیں غالب ایک نابغہ تھے ان کی سرشت میں آب و آتش دونوں کی جلوہ گری موجود تھی وہ کبھی وحدت کے نشہ سے سرشار ہوتے تو لاموجود الا اللہ کا ورد کرتے۔ قطرے کے دریا میں فنا ہو جانے کی بات کرتے۔ کل میں جزکو مدغم کر دیتے

ع ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اور کبھی کثرت کی طرف مائل ہوتے تو ہر دم ایک طرفہ معشوق کی طلب کرتے، زنان بازاری کا نظارہ کرتے، ناکامی کے ہاتھوں مجبور ہو کسی کو لب بام دیکھنے کی تمنا کرتے۔ ذوقِ تماشا کی داد دیتے؛

ع ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا

ان کی انائیت زور پر ہوتی، قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ایسی وجدانی کیفیت میں ہوتے تو در کعبہ کے وا ہونے پر وہاں سے الٹے پھر آتے اور جب یہی لطافت کثافت میں جلوہ فرما ہوتی تو تجمل حسین خاں کے لئے قصیدے لکھتے، بہادر شاہ کی مدح سرائی کرتے، کبھی اپنی کوشش کو قفس میں خس فراہم کرنے سے تعبیر کرتے اور کبھی کہتے کہ:

ع نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

زیست سے تنگ آتے تو مرنے کی دعائیں کرتے اور موت کا قرب ہوتا تو اسے جل دے کر صاف بچ نکلتے — کبھی موت آئی تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ شہر میں وبا پھیلی ہے۔ ہر کنجڑا جلاہا تیلی تنبولی مرتا ہے میں اس طرح افراتفری میں مرنا نہیں چاہتا، یہ ہنگامہ فرد ہو تو اطمینان سے مروں گا۔ اور کبھی اپنے جینے کا الزام معشوق کے سر رکھتے ع وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

اور جب جی لٹتے تو پھر وہی زور شور سے موت کی تمنا کرتے ع آہ جی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "بڑا شاعر وہ ہے جو زندگی کے متعلق گہری بصیرت فراہم کرے : یہ بصیرت کچھ توائے شر وسس کا عطیہ ہوتی ہے اور کچھ شاعر کی تجرباتی زندگی کا نچوڑ"، غالب زندگی کی شمع کو ہر رنگ میں سحر تک جلنے کا درس دیتے تھے اور ان کا اعتقاد چشم کو ہر رنگ میں وا رکھنے پر تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زندگی کے ہر گوشہ کو دیکھا ہر رنگ میں اس کا مشاہدہ

کیا اور اس کی ہر آواز کو سن کے اپنے محرم نوائے راز ہونے کا ثبوت دیا۔ غالب کی غزل میر کی غزل کی طرح محض حدیث دل اور واردات عشق کا بیان نہیں ایک صحیفۂ کائنات ہے اسے پڑھ کر انسان کی چشم ہوش وا ہوتی ہے۔ عقل کو بصیرت اور فہم کو روشنی ملتی ہے۔ میر کی شاعری پر شیفتہ نے پستش بغایت پست اور بلندش بغایت بلند کا فتویٰ دیا تھا۔ یہ میر کے اشعار کے ظاہری پیکر کا ذکر ہے مگر غالب سے یہ بات منسوب کی جائے تو مضامین کے اعتبار سے بھی درست ٹھہرے گی ان کے یہاں اس عشق کا بھی ذکر ہے جس کو خلل دماغ کہا جائے اور اس جذب شوق کا بھی جو درد کی دوا ہے اور درد لا دوا بھی۔ جس سے انجمن ہستی روشن ہوتی ہے جسے برتر از محبوبیت، معشوقیت اور خلیلیت و حبیبت کہیں تو کچھ غلط نہ ہوگا

کہ انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

عبدالرحمٰن بجنوری نے اپنی کتاب محاسن کلام غالب کے شروع میں لکھا ہے کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، وید مقدس اور دیوان غالب۔ میں بصد معذرت یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ غالب کی شاعری الہامی سے زیادہ تجرباتی ہیں۔ ان کی شخصیت اور زندگی کا مطالعہ کیجیے تو میری بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی اور صرف اسی وقت آپ کو یہ کہنے کا حق ہے کہ غالب ایک عظیم انسان تھا، ایک عظیم شاعر تھا ایک نابغہ تھا گو یک فنہ تھا لیکن یکتائے روزگار تھا ۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی ●●

قاصد سے رشک ؎

گذرا اسدؔ مسرت پیغام یار سے
قاصد پر مجھ کو رشک سوال و جواب ہے

معشوق سے رشک ؎

آتا ہے میرے قتل کو پر جوش رشک سے
مرتا ہوں ان کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل
مرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

بلائے رشک و رشک بلا ؎

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفت رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو کاش کہ تم مرے لئے ہوتے!

خود سے رشک ؎

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنا رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

(شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ)

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے ۔۔۔ کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

مہذب اور متمدن قومیں ہمیشہ اپنے بلند مرتبہ شاعروں مفکروں، صوفیوں، رہناؤں، فلسفیوں، فنکاروں اور سخنوروں کو موزوں موقعوں پر موزوں طریقوں سے خراج عقیدت پیش کرتی ہیں۔ عظیم ہندوستان کے عظیم سخنور مفکر اور عالم مرزا غالب مرحوم کی یاد میں "جشنِ صد سالہ غالب" شایانِ شان انداز سے منانے کا اہتمام واقعی قابلِ تحسین ہے۔ اس سلسلہ میں اس وقت ملک کے گوشے گوشے میں نزدیک و دور مختلف ادبی، ثقافتی اور فنی پروگرام مرتب کئے جا رہے ہیں۔

مرزا غالب مرحوم ہندوستان کا محبوب ترین قومی شاعر ہے۔ جو اپنی نظیر آپ تھا۔ تمام جلیل القدر نقاد اور بڑے بڑے سخن سنج اور سخن فہم ان کی عظمت کے قائل ہیں۔ غالب کے تخیل کی بلندی تصور کا انوکھا پن، تنوع فکر، فصیح بیانی، معنی آفرینی اور فلسفہ بے مثال ہے۔ ہر پڑھا لکھا آپ کا کلام ذوق وجدان سے پڑھتا ہے۔ اور اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ہر ایک ادیب غالب کے افکار کی ترجمانی کا آرزومند نظر آتا ہے۔ غالب کی ذات ہر ذی علم و شعور کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ان کے کلام کا انداز ہر مکتب فکر و خیال کو محظوظ کرتا ہے۔ وہ فطرت انسانی کا نباض اور وقت کے تقاضوں سے بخوبی واقف ہے۔ غالب نے زمانہ کے دل کی دھڑکن کو اچھی طرح سنا، محسوس کیا اور اس کی ترجمانی کی۔

مرزا فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر دستگاہ رکھتے تھے۔ ان دونوں زبانوں میں آپ کے دلکش شاہکار موجود ہیں جبکہ ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم غالب کے کلام کے محاسن کے متعلق لکھتے ہیں۔ "غالب نے بزم ہستی میں جو فانوس خیال روشن کیا ہے۔ کون سا پیکر تصور ہے۔ جو اس کے کاغذی پیراہن میں منازل زیست قطع کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔"

ابن آدم کو عزم و استقلال کا درس دینے کے لئے ایک فارسی غزل میں فرماتے ہیں ؎

دمیدانہ دبالید و آشنا نگر شد ۔۔۔ در انتظار ہما دام چیدنم بنگر

فن شعر میں مرزا غالب کسی کے مقلد نہ تھے۔ انہوں نے اپنے لئے ایک نیا راستہ نکالا اور نظم و نثر دونوں میں پرانی روایتوں کو

ترک کر کے اپنا نیا رنگ سخن اور انداز بیان نمایاں کیا۔ غالب نے ہر صنف سخن میں اپنے کمال کے جوہر دکھائے بالخصوص دامن غزل کو کافی وسعت عطا کی۔ مرزا نے کسی کا رنگ قبول نہیں کیا لیکن ان کے معاصروں اور بعد میں آنے والے شعراء نے ان کے تتبع کو طرۂ امتیاز سمجھا خود فرماتے ہیں ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

مرزا غالب کا تعلق ایک ایسے پر آشوب اور انقلاب آفریں عہد سے ہے جبکہ ہر محب وطن کے دل میں جذبۂ آزادی راکھ میں دبی ہوئی ایک چنگاری کی طرح شعلہ افروز ہونے کے لئے بیقرار تھا۔ وہ اس انقلاب سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ ان کی تحریرات میں جگہ جگہ اس تاثر کا عکس نمایاں ہے۔

اس فخر روزگار شاعر کی ہر نوا میں راز زندگی نغمۂ حیات مضمر ہے۔ شوخیٔ تحریر سے لب تصویر بھی گویا نظر آتا ہے۔ کلام میں تصوف کی چاشنی بھی موجود ہے۔ اور وہ اس حسن ازلی کو دیکھنے کے متمنی نظر آتے ہیں جو کہ سوز زندگی بنکر ہر شے میں پنہاں ہے۔

میں اس مایۂ ناز فرزند وطن کی جشن صد سالہ تقریب پر دل کی گہرائیوں سے اپنے اور کشمیر کی طرف سے جو علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے خراج عقیدت پیش کرتا ہوں ؎

اے جہان آباد اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے
(اقبال)

شیخ محمد عبداللہ
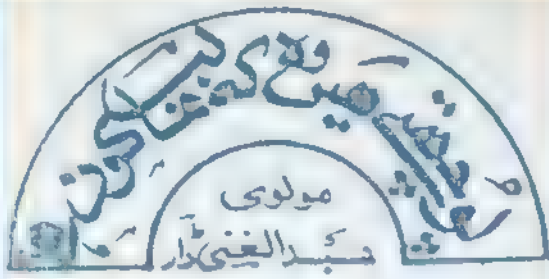
پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

حضرت غالب نے زبان اردو کو حیات جاوید بخشی اردو نثر معنی نے تحریر کو مکالمہ کی رنگت دی۔ مخاطب غالب ہے اور غالب مخاطب سے باتیں کرتے دکھائی پڑتے ہیں بلاشبہ غالب اس نئی طرز نگارش میں پہلے بھی اور آخری بھی۔

مختلف زمانوں، زبانوں اور ملکوں میں بڑے بڑے شاعروں نے بڑے سے بڑا نام پایا اور اپنے اپنے رنگ میں وہ ادبی دنیا کی آنکھوں کے ستارے بنے۔ حضرت غالب انہی میں سے ایک ہیں فرق ہے تو یہ کہ غالب شمار ان ستاروں میں ہے جن کی روشنی کی کرنیں کروڑوں برس سے ہے لیکن انکی بلندی اتنی ہے کہ اس تک پہنچنے کیلئے شاید ابھی دنیا کو بہت لمبے زمانہ تک انتظار کرنا پڑے۔ غالب کی عظمت یقیناً ان کے فارسی دیوان میں مضمر ہے۔ اردو زبان میں دیوان ان کی عظمت کی ایک چھوٹی سی کرن ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ادبی دنیا کے ماہتاب ہوں یا آفتاب وہ اس ننھی سی کرن کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میر تقی، مومن، داغ، حسرت، جگر اور بھی غزل کے بادشاہ ہیں لیکن حضرت غالب کی طرز بیان نے فلسفہ کے بحر بیکراں کو چھوٹی سی چھوٹی غزل کے کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ خیالات کی بلندی اور سادگی۔ غنا اور بے نیازی ہر دور میں ابھرتی چلی جائے گی۔ غالب غالب رہیں گے اور رہتی دنیا تک زبان اردو کی زندگی کے ضامن۔ متعصب سے متعصب اردو دشمن حکومت اردو کو مٹانے میں ناکام و نامراد رہے گی۔ غالب اردو ہے اور اردو غالب

حضرت غالب زندہ باد۔

رقم ________
تاريخ ١٢٨٨/١١/٩ هـ
مرفقات ________

وزارة الخارجية
السفارة العربية السعودية
بالهند

بسم الله الرحمن الرحيم

حضرة الاخ المكرم الاستاذ عبد الوحيد صديقي

رئيس تحرير مجلة " هما " / المحترم حفظه الله

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

وبعد بالاشارة الى خطابكم المؤرخ ١٩ يناير ١٩٦٩ المتضمن انه جاري عزمكم على اصدار عدد ممتاز من مجلتكم " هما " " الغراء " . وذلك بمناسبة الاحتفالات الشعبية باحياء ذكرى شاعر الهند " غالب " .

يسرني ان اقدم اليكم برفقه كلمة حول الشاعر المذكور كما رغبتم في ذلك .

ختاما تقبلوا تحياتي .

السفير

انس يوسف ياسين

برادر مکرم الاستاذ عبدالوحید صدیقی ایڈیٹر ہما

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپ کے خط مورخہ ۱۹ جنوری ۱۹۶۹ء کے حوالہ کے ساتھ جس میں آپ نے ہندوستان کے عظیم شاعر غالب کی صد سالہ برسی کے موقعہ پر ہما نمبر نکالنے کا ذکر کیا ہے۔ مجھ کو مسرت ہے کہ میں آپ کی خواہش کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس عظیم شاعر کے بارے میں چند کلمات کا ہدیہ دوں۔ انس یوسف یاسین

سفیر العربیۃ السعودیہ

سفیر سعودی عرب کی رائے

ہندوستان سرکاری اور عوامی سطح پر ہندوستان کے ایک عظیم شاعر اور اردو ادب میں نظم اور نثر دونوں میں یکساں طور پر ممتاز حیثیت رکھنے والی ایک شخصیت کی صد سالہ تقریبات منا رہا ہے۔ غالب حقیقت میں وہ شاعر تھا جو ہندوستان کے مختلف طبقوں میں یکساں طور پر مقبول تھا۔ اس کی شاعری کے مطالعہ سے دل کو راحت پہونچتی ہے اور رنج وغم دور ہو جاتے ہیں اس کی شاعری کو آپ سماجی اعتبار سے، ادبی اعتبار سے، تاریخی اعتبار سے، دل کی

گہرائیوں میں پائے جانے والے جذبات کی عکاسی کے اعتبار سے خواہ کسی بھی زاویہ سے دیکھیں وہ علم و ادب کا ایک نہ سوکھنے والا سرچشمہ اور بے بہا دولت سے کم ثابت نہ ہوگی۔

چنانچہ اگر اس عظیم شاعر کے فن، اس کے ادبی ذوق اور اس کے ادبی رتبہ کو اجاگر کرنے کے لئے اور اس کو ذہنوں میں از سرنو تازہ کرنے کے لئے صد سالہ تقریبات منائی جاتی ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ خاصکر جب کہ اس کے شعر سے اس کے زمانہ کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس کا دور ہندوستان کی ادبی، سیاسی، اور سماجی زندگی کے لئے ایک قدیم دور کا خاتمہ اور نئے دور کا آغاز تھا۔ میں اس یادگار کو جلا بخشنے والوں اور ذہنوں میں اس کی تجدید کرنے والوں کو تہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں جس کی سچی لگن حقیقت میں اس عظیم شاعر کو وہ مرتبہ اور وہ درجہ دیتی ہو جس کا وہ اہل ہے۔ اور یہ حکومت ہند اور ہندوستانی عوام کا ایک کارنامہ ہے کہ وہ اپنے سپوتوں کی یادگار کی تجدید کو اتنی اہمیت اور سچا مقام دیں۔

جن سنگھ کے بلراج مدھوک

MEMBER OF PARLIAMENT
(LOK SABHA)

23 Feroz Shah Road
N. Delhi
20.1.69

پیارے صدیقی جی۔

آپ کا پتر ملا۔ دھنیواد

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ آپ مرزا غالب کی شتابدی پر اسپیشل نمبر نکال رہے ہیں۔ مرزا غالب ہمارے دیش کے ایک مہان کوی تھے۔ میں ان کے پرتی اپنی شردھانجلی بھینٹ کرتا ہوں۔

آپ کا۔
بلراج مدھوک

پیارے صدیقی جی

آپ کا پتر ملا۔ دھنیواد

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ آپ مرزا غالب کی شتابدی پر اسپیشل نمبر نکال رہے ہیں۔ مرزا غالب ہمارے دیش کے ایک مہان کوی تھے۔ میں ان کے پرتی اپنی شردھانجلی بھینٹ کرتا ہوں

آپ کا
بلراج مدھوک۔
ممبر پارلیمنٹ (جن سنگھ)

منسٹر ٹرانسپورٹ وجہاز رانی

مجھے یہ جان کر بہت مسرت ہوئی کہ آپ غالب کے صد سالہ جشن کے موقع پر ہمارا اردو ڈائجسٹ کا اسپیشل نمبر شائع کر رہے ہیں۔ غالب بہت ذہین اور بڑے حساس انسان تھے انہی خوبیوں نے انہیں ایک عظیم شاعر بنایا۔ انکی شاعری ہمیں یہ پیغام دیتی ہے کہ زندگی اپنی کمیوں اور خامیوں کے باوجود خوبصورت اور قابل قدر ہے۔ انہوں نے اپنے دور کی روایتوں سے بغاوت کی اور اس طرح دنیا کے لافانی شاعروں اور فلسفیوں کی صف میں جگہ پائی۔

وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ

(منسٹر ٹرانسپورٹ وجہاز رانی)

يسعدني أن أجد نفسي بالهند الصديقة وهي تحتفل
بتلك المناسبة التي لا تجمع : المهاتما غاندي : ثم وهي تحتفل
بالشاعر الكبير غالب

لقد قدمت من بلد عربي يحب الشعر ويقدر الشعراء منذ قديم
زمانه . إنه يحس بمثلكم الاعجاب بغالب الذي ترك
ثروة من الافكار والمشاعر

وبقدر ما تقاس أمة بقوتها وإمكانياتها فإنها تقاس أيضا
بكتابها وشعرائها . لقد كان غالب وسيظل شاعرا كبيرا

أمين حلمي الثاني

سفير ج ع م ٣

١٩٦٩/١/٢٣

سفیر متحدہ عرب جمہوریہ

یہ بات میرے لئے بڑی سعادت کی ہے کہ میں ہندوستان میں اس وقت موجود ہوں جبکہ حکومت اپنے دو عظیم سپوتوں، مہاتما گاندھی اور عظیم شاعر غالب کی یادگاری تقریبات منا رہی ہے۔

میں ایک عرب ملک سے آیا ہوں جہاں لوگ شعر و شاعری کو بہت پسند کرتے ہیں اور شعراء کا احترام کرتے ہیں۔ میرا ملک بھی عظیم شاعر غالب کی یادگار کو اجاگر کرنے کے لئے منائی جانے والی تقریبات میں برابر کا شریک ہے۔

جہاں کسی قوم کو اس کی قوت اور اس کے ذرائع سے جانچا جاتا ہے وہیں اس قوم کے شعراء اور قلم کاروں کا نام بھی لیا جاتا ہے، غالب درحقیقت ایک بڑا شاعر تھا اور رہے گا۔

امین حلمی ثانی

سفیر متحدہ عرب جمہوریہ

ہما — کی پرواز دنیا میں یکتا ہے

مولانا عبدالغنی ڈار

حضرت مولانا۔ تعمیل ارشاد میں عرض ہے۔ ہما کی پرواز دنیا میں یکتا ہے آپ نے ہما کی لاج رکھی۔ پرواز ہر رنگ میں بے مثال ہے دلکشی ہو یا رعنائی، نفاست ہو یا تخیلات کی عمدگی زبان کی پاکیزگی ہو یا بے باکی۔ آرٹ میں نئی کروٹ یا تاریخ میں نئی زندگی "ہما" ہما ہے اسی لیے اس کا غالب نمبر یقیناً سب پر غالب آئے گا۔ انشاء اللہ!

عبدالغنی ڈار
22/1/69

صحافتی برادری کی طرف سے

غالب کو ہدیہ عقیدت

(ایم ایل بھاردواج پرنسپل انفارمیشن آفیسر)

ڈیر صدیقی۔ آپ نے شمارہ خصوصی کے سلسلے مجھ سے چند سطور ارسال کرنے کے لیے کہا ہے۔ یہ چند جملے اس عظیم شاعر کو خراج عقیدت کی شکل میں حاضر خدمت کر رہا ہوں۔

(آپ کا مخلص۔ ایم۔ ایل بھاردواج)

مجھے یہ معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی کہ ادارہ ہما کی جانب سے غالب کی صد سالہ یادگار کے موقع پر ایک خصوصی شمارہ شائع ہو رہا ہے۔

غالب ہمارا عظیم قومی شاعر ہے اس کی نثر اور نظم دونوں ہی ہمارے عزیز اور مشترک قومی ورثے کی اہم یادگاریں ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ غالب کا کلام کئی ملکی اور بیرونی زبانوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ اس پر فارسی اور اردو ہی کا نہیں بلکہ ہر اس زبان کا حق ہے جس میں محبت کے نغمے گائے —— اور ابدی اقدار کے زمزمے سنائے جاتے ہیں۔ اس کے کلام پر ایک صدی سے زیادہ کا زمانہ بیت گیا لیکن ہر نسل اور ہر قوم کو اس میں اپنے ہی دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔

غالب کی زندگی بھی، اس کے کلام ہی کی طرح، تمام رسوم وقیود سے بالاتر مشترکہ ہندوستانیت کی آئینہ دار تھی۔ غالب یکجہتی اور ہم آہنگی کا پیام بر ہے۔ اور اس کے یہاں روایت و جدت کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔

ہم لوگ جو صحافتی دنیا سے وابستہ رہے ہیں غالب کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتے کہ اس نے اردو نثر کو آسان، سلیس اور بول چال کی زبان کے قریب کیا اور اسے نئی توانائی اور دلفریبی عطا کی میں، اس یادگار کے موقع پر پوری صحافتی برادری کی طرف سے اور غالب کے طرفداروں اور سخن فہموں کی طرف سے ہدیہ عقیدت پیش کرتا ہوں۔

پہلا لطیفہ: ۲۰ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ شہر میں۔ نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ کو لطیفۂ قدرت بنا کر بھیجا گیا کہ عالم آب و گل پر "غالب" ہو جائیں۔

دوسرا لطیفہ: ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم حبس دوام صادر ہوا۔ ایک بیڑی (یعنی بیوی) میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس میں ڈال دیا۔

دھوکے میں نجات: ایک مرتبہ ایک صاحب بھوپال سے دلی سیر و تفریح کی غرض سے آئے۔ صاحب موصوف مرزا غالب سے بھی ملاقات کا اشتیاق رکھتے تھے چنانچہ ایک دن مرزا غالب سے ملنے ان کے مکان پر گئے ان کی وضع قطع سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ آدمی متقی اور پرہیز گار ہیں۔ مرزا ان سے نہایت خوش خلقی سے ملے لیکن جس وقت یہ صاحب ملنے گئے تھے وہ مرزا کے شغل مے و جام کا وقت تھا لہٰذا معمول کے مطابق شراب کا شیشہ اور گلاس سامنے رکھا تھا ان صاحب کو یہ خبر کہاں کہ مرزا صاحب کو یہ شوق بھی ہے اتفاقاً شراب کے شیشہ کو انھوں نے ہاتھ میں اٹھا لیا تو کسی نے کہا "جناب یہ شراب ہے۔ ان بھوپالی صاحب نے جھٹ شیشہ ہاتھ سے رکھ دیا اور فرمانے لگے۔

میں نے تو اسے شربت کے دھوکے میں اٹھا لیا تھا۔!

مرزا نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور کہا۔

"زہے نصیب، دھوکے میں نجات ہو گئی!"

صہبائی: ایک دن کسی محفل شعر و سخن کا ذکر آیا تو مرزا غالب نے کہا کہ:

"مولانا نے بھی کیا عجیب غریب تخلص رکھا ہے، عمر بھر میں ایک چلو بھی پینا نصیب نہیں ہوئی اور صہبائی تخلص رکھا ہے — سبحان اللہ قربان جایئے اس اتقا کے اور صدقے جایئے اس تخلص کے"

شرابی کی دعا: ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کسی صاحب نے مرزا غالب کے سامنے شراب کی بے انتہا مذمت کی۔ مرزا صاحب دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے رہے اور جب نہ رہا گیا تو ان صاحب سے پوچھا کہ:

"آخر شراب میں ایسی کون سی برائی ہے؟"

وہ صاحب بولے۔

"حضرت پہلی برائی تو یہی ہے کہ شرابی کی دعا قبول نہیں ہوتی: یہ سن کر مرزا صاحب نے ان سے کہا کہ:

"قبلہ یہ تو بتاؤ کہ جس کے پاس شراب موجود ہے پھر اس

بخشت کو اور کون سی دعا کی ضرورت ہے۔

قرض کی پیتے تھے: ایک مرتبہ مرزا غالب کے قرض خواہ نے ان پر مقدمہ چلایا۔ چنانچہ جواب دہی کے لئے مرزا صاحب کو بھی عدالت نے طلب کیا جب مرزا صاحب مفتی صدرالدین آزردہ صدرالصدور دلی کے روبرو پیش ہوئے تو استغاثہ کے جواب میں مندرجہ ذیل شعر پڑھا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مفتی صاحب شعر سن کر پھڑک گئے مگر مرزا صاحب کے خلاف ڈگری بھی دے دی اور مدعی قرض خواہ کو اپنی جیب سے مرزا کا قرضہ بھی ادا کر دیا۔

شراب اور جاڑا: ایک مرتبہ جاڑے کے زمانے میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مرزا غالب کے مکان پر ان سے ملنے کیلئے آنکلے۔ مرزا صاحب شغل مے میں لگے ہوئے تھے۔ نواب صاحب کو دیکھ کر ان کی طرف مرزا صاحب نے شراب کا گلاس بڑھا دیا اور کہا "لیجئے نا"!

نواب شیفتہ خاموشی سے دیکھتے رہے۔

مرزا صاحب نے پھر خود ہی سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

"کیا حضرت جاڑے میں بھی نہیں پیتے؟"

دونوں برابر: شام کو اکثر مرزا غالب کے خاص خاص شاگرد اور بے تکلف دوست جمع ہو کر ان کے پاس بیٹھا کرتے تھے مرزا سرور وکیف کے عالم میں بڑی پر لطف اور دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے۔

ایک دن اسی طرح مرزا صاحب پلنگ پر دراز تھے کہ اتنے میں میر مہدی مجروح آگئے اور بکمال محبت مرزا کے پاؤں دابنے لگے مرزا صاحب نے لاکھ لاکھ کہا کہ:

"ارے تو سیدہ زادہ ہو کر پاؤں دباتا ہے مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے مگر جوشش عقیدت اور خلوص کی فراوانی اتنی تھی کہ یہ کون سنتا۔ میر مہدی مجروح برابر پاؤں دابتے رہے جب مرزا صاحب نے بہت زور دے کر فرمایا تو میر مہدی مجروح بولے:

"اگر آپ کو ایسا خیال ہے تو پاؤں دابنے کی اجرت دیدیجئے گا۔" مرزا صاحب نے فرمایا "خیر یہاں تک تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔" جب میر مہدی پاؤں داب چکے تو بولے "لائیے حضرت میری اجرت دلوائیے۔"

مرزا صاحب نے کہا۔

"واہ بھئی واہ اماں اجرت کیسی؟ تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمہاری اجرت دابی دونوں برابر ہو گئے۔"

شراب نہ پی ہو تو کافر: ہنگامۂ غدر کے بعد جب مرزا غالب کی پنشن بند تھی اور پھر جب دربار میں شریک ہونے کی اجازت ہوئی تھی ان ہی دنوں بندت موتی میر منشی لفٹنٹ پنجاب مرزا صاحب سے ملنے آگئے اتفاقاً کچھ تذکرہ پنشن کا چلا تو مرزا صاحب نے کہا۔

"تمام عمر میں اگر ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے مسلمانوں میں شمار کیا۔"

لعنت خدا کی: ایک مرتبہ ایک صاحب جو مرزا صاحب سے ملاقات کے مشتاق تھے بنارس سے دلی تشریف لائے اور مرزا صاحب کے یہاں حاضر ہوتے ادھر ادھر کی باتیں کیں اور ساتھ ہی مرزا صاحب سے ان کے ایک شعر کی بے انتہا تعریف کی۔ مرزا صاحب کو جب تاب نہ ہوئی تو ان سے پوچھا کہ:

"حضرت وہ کون سا شعر ہے۔"

انھوں نے جھٹ میر امانی تخلص اسد شاگرد مرزا محمد رفیع سودا کا یہ شعر سنا دیا۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

مرزا صاحب نے یہ شعر سن کر کہا۔

"اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اس کو رحمت خدا کی ہو اور اگر مجھ اسد کا یہ شعر ہے تو مجھے لعنت خدا کی۔"

راست و دروغ بہ گردنِ راوی : ایک بار منشی ہرگوپال تفتہ نے مرزا غالب کو کوئی بات لکھی مگر عدم یقین کی وجہ سے یہ مثل بھی لکھ دی۔ "راست و دروغ بہ گردن راوی۔"

چونکہ مرزا صاحب کو اس بات سے کوئی تعلق نہ تھا، اور ان کے لئے راوی تفتہ ہی تھے لہٰذا جواباً مرزا صاحب نے تفتہ کو لکھا۔

"میاں وہ راست و دروغ بہ گردن راوی نے مجھ کو بہت پریشان کیا۔ واسطے خدا کے جو راوی نے روایت کی وہ مجھ کو ضرور لکھو۔"

سورت بہر صورت : میاں داد خاں سیاح مرزا غالب کے ایک نہایت راسخ العقیدہ شاگرد تھے سیر و سیاحت کے عادی تھے ایک مرتبہ گھوم پھر کر جب اپنے گھر پہنچے اور مرزا صاحب کو خط لکھا تو انہوں نے جواباً لکھا: "سورت کا پہنچنا بہر صورت مبارک۔"

وہی کوٹھری ہے

مرزا غالب جس مکان میں رہتے تھے اس مکان میں دروازے کی چھت پر ایک کمرہ تھا اسی کمرہ کی ایک جانب ایک تنگ و تاریک کوٹھری تھی جس میں ہمیشہ فرش بچھا رہا کرتا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں مرزا اکثر لُو دھوپ سے بچنے کے لیے اس کوٹھری میں سہ پہر کے تین چار بجے تک بیٹھتے تھے ___ ایک دن اتفاق سے رمضان کے مہینے میں مرزا صاحب اسی کوٹھری میں بیٹھے کسی کے ساتھ شطرنج یا چوسر کھیل رہے تھے کہ مفتی صدر الدین آزردہ دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے چلے آئے۔ مرزا کو اس طرح رمضان کے مہینے میں شطرنج یا چوسر کھیلتے دیکھ کر مفتی صاحب نے کہا کہ:

"___ مرزا صاحب ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے مگر آج اس حدیث کی صحت میں کچھ شبہ سا ہو رہا ہے ___"

مرزا نوشہ نے برجستہ جواب دیا۔

"قبلہ حدیث بالکل صحیح ہے مگر بات یہ ہے کہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری ہے ___"

روزہ بہلانا

ایک مرتبہ نواب علاء الدین احمد خاں کو اپنی روزہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

"___ دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں، مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا۔ کبھی حقہ پی لیا کبھی کوئی روٹی کا ٹکڑا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں، اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے ___"

روزہ مرا ایمان ہے ...!

ایک سال مرزا صاحب کے کچھ احباب نے اُن سے کہا کہ ___! "مرزا صاحب اس سال تو روزے رکھ ہی لیجئے ___"

اتفاق ایسا ہوا کہ اُس سال بہت شدید گرمی پڑی اور رمضان شریف کا مہینہ مئی جون میں پڑا۔ مرزا نے اس پر یُوں فرمایا ؎

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالب، لیکن
خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں

روزہ اور سُنّی مسلمان

ایک مرتبہ رمضان شریف کے مہینے میں مولوی عبد القادر

دہلوی عصر کے وقت مرزا صاحب سے ملنے چلے آئے ــــــ دورانِ گفتگو مرزا صاحب نے خدمت گار سے پینے کے لیے پانی مانگا۔

مولوی عبدالقادر صاحب نے مرزا صاحب کی طرف حیرت سے دیکھ کر کہا ـــ جناب کا روزہ نہیں ہے ـــ؟
مرزا صاحب نے اطمینان کے ساتھ فرمایا۔
"ـــ سُنّی مسلمان ہوں، چار گھڑی دن رہے روزہ کھول لیتا ہوں ـــ"

روزہ کھا لیتا ہوں

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے مرزا غالب سے پوچھا "مرزا، تم روزہ کیوں نہیں رکھتے ـــ؟"
"پیر و مرشد جب کھانے کو نہیں ملتا تو روزہ ہی کھا لیتا ہوں ـــ" بہادر شاہ ظفر یہ سُنکر ہنس دیئے۔

غالب اور شیطان

ایک دفعہ رمضان شریف کے مہینے میں مرزا نواب حسین، مرزا غالب کے یہاں بیٹھے تھے اور انھوں نے پان منگا کر کھایا اتفاقاً اُس وقت وہاں ایک نہایت متقی و پرہیزگار صاحب بھی حاضر تھے اُنھوں نے تعجب سے پوچھا۔
"قبلہ آپ روزہ نہیں رکھتے ـــ؟"
یہ سُن کر مرزا غالب فوراً مسکرا کر یوں اُٹھے۔
"شیطان غالب ہے ـــ"

بنشیں مادر بیٹھو ری مائی

مولانا فضل حق خیر آبادی گو اپنے عہد کے جیّد عالم تھے ـــ لیکن چونکہ اُن کی اوائل عمری کا زمانہ شہزادوں کی صحبت اور امیرانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ گزرا تھا اس لیے اُس زمانے کے رئیسوں کی طرح مولانا کا تعلق بھی رباب نشاط سے وضع داری کے طور پر تھا اور یہ وضع داری نباہنے کے لیے اُن کے ساتھ بھی ایک طوائف لگی ہوئی تھی۔
ـــ مولانا فضل حق خیر آبادی اور مرزا نوشہ کے بڑے گہرے مراسم اور بے تکلفانہ تعلقات تھے ـ ایک بار مرزا نوشہ اُن سے ملنے کے لیے اُن کے گھر گئے ـــ مولانا کی عادت تھی کہ جب اُن کا کوئی بے تکلف دوست آتا تھا تو "خاقانی" کا یہ مصرعہ پڑھا کرتے تھے چنانچہ مرزا نوشہ کے آتے ہی انہوں نے یہ مصرعہ پڑھا ؎

بیا برادر آ در ے بھائی

اور مرزا کی تعظیم کو اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ مرزا نوشہ آ کے اور بیٹھے ہی تھے کہ اتنے میں مولانا کی منظورِ نظر بھی دوسرے دالان سے اُٹھ کر مرزا نوشہ کے پاس آ کر بیٹھ گئی تو مرزا نوشہ مولانا سے مخاطب ہو کر بولے ـــ "ہاں، مولانا اب دوسرا مصرعہ بھی فرما دیجیے ؎ بنشیں مادر بیٹھو ری مائی
یہ سُنکر مولانا خفیف ہو کر مسکرا دیئے۔

خدا کو سونپا

جب نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور کا انتقال ہو گیا تو مرزا غالب بھی بہ سلسلۂ تعزیت رام پور تشریف لے گئے۔ انتقال نواب یوسف علی خاں کے بعد نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے ـــ اتفاقاً ایک دن نواب کلب علی خاں صاحب لفٹنٹ گورنر سے ملنے کے لیے بریلی جا رہے تھے روانگی کے وقت جہاں اور بہت سے لوگ تھے، مرزا غالب بھی موجود تھے۔
مرزا غالب سے رخصت ہوتے وقت نواب کلب علی خاں صاحب نے کہا ـــ
"ـــ اچھا مرزا صاحب، خدا کو سونپا ـــ"
مرزا صاحب نے کہا۔
"ـــ حضور غضب ہے ـــ"
نواب صاحب نے پوچھا۔ "ـــ کیوں ـــ؟"
"ـــ خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا تھا آپ پھر خدا کے سپرد کئے دیتے ہیں ـــ" مرزا صاحب نے بڑی متانت سے کہا۔

●●

غالب کے بارے میں اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ اب اُن کی شخصیت کا کوئی گوشہ تاریکی میں نہیں رہا۔ محققین نے اُنکی حیات کے ہر پہلو کو نکھار کر آئینہ بنا دیا ہے۔ جو بھی اُس آئینے میں دیکھتا ہے، اُسے مرزا غالب اپنی تمام تر خوبیوں اور زندگی کے نشیب و فراز سمیت نظر آجاتے ہیں۔ خود غالب نے اپنی تحریریں میں ذاتی حالات اور ماحول کی جزئیات اس بے ساختگی سے بیان کی ہیں کہ دورانِ مطالعہ شاید ہمیں یہ محسوس نہ ہو کہ اُنھوں نے اپنے بارے میں کیا کچھ لکھ دیا! — لیکن اگر اُن کے مکاتیب کو بغور پڑھا جائے تو اُن مکاتیب کو سامنے رکھ کر اُن کی زندگی کا مکمل نقشہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً وہ کہاں اور کب پیدا ہوئے، خاندانی کیفیت کیا تھی، بود و باش کہاں رہی، وسائلِ معاش کیا تھے اور سامانِ خورد و نوش کہاں سے آتا تھا۔ تعلقات کن کن لوگوں سے تھے۔ دربارِ شاہی میں اُن کی کیا وقعت تھی، اخلاق کیسا تھا کہاں کہاں سفر کیا اور کھاتے پیتے کیا تھے۔ غرض اُن کی زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو جس کے متعلق اُن کے اپنے قلم سے معلومات کا گراں بہا ذخیرہ فراہم نہ ہوا ہو۔

اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ غالب کو لوگ اب اس قدر جانتے ہیں جتنا کہ وہ بھی خود کو نہیں جانتے تھے تو مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔ ہر عظیم انسان میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔ غالب بھی ان سے مُبّرا نہ تھے۔ وہ شراب کے رسیا تھے۔ کھانوں میں تو خیر اُنھیں سبھی کھانے پسند آجاتے تھے، مگر مشروبات میں شراب اور پھلوں میں صرف آم اُنھیں زیادہ مرغوب تھے۔ دیکھا جائے تو آموں کے معاملے میں وہ حد سے زیادہ بے صبر اور رال ٹپکانے والے تھے۔ اتنے بے صبر کہ قلعۂ معلّٰی میں بہادر شاہ ظفر کے سامنے بھی اپنی اس خواہش کو نہ دبا سکتے تھے۔

مولانا حالی نے اپنی تصنیف 'یادگارِ غالب' میں اُنکی اِس خصلت کی طرف مُبہم اشارے کیے ہیں۔ خود مرزا غالب

کی تصانیف، عودِ ہندی اور اُردوئے معلّےٰ میں بھی کہیں کہیں اُن کے خطوط میں آم کا تذکرہ موجود ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ

"ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور مہمانوں کے لیے دسترخوان بچھایا گیا۔ مہمان کچھ زیادہ نہیں تھے۔ مگر اُن کے لحاظ سے برتن بہت زیادہ تھے۔ اس پر طرّہ یہ کہ برتنوں کے مقابلے میں کھانے کی مقدار بیحد قلیل تھی۔ مہمان ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ مرزا نے یہ بات نوٹ کر لی اور مسکرا کر کہا۔

"اگر برتنوں کی کثرت کا خیال کیجئے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور کھانے کی مقدار کو دیکھیے تو بایزید کا۔"

سب یارانِ محفل اس بات پر ہنس پڑے۔ اس دسترخوان پر آم بھی موجود تھا۔ آم کو دیکھ کر محفل میں آموں کے متعلق سلسلۂ گفتگو چل نکلا۔ ہر شخص آم کے متعلق اپنی اپنی رائے بیان کرنے لگا۔ مولانا فضلِ حق خیر آبادی نے کہا —— "ارے بھئی صاحب خانہ اور میزبان سے بھی تو دریافت کرو کہ اُس کی آموں کے بارے میں کیا رائے ہے۔ کیوں مرزا صاحب آپ کے خیال میں آم کیسا ہونا چاہیئے؟"

مرزا چند لمحے سوچتے رہے اور پھر اپنے مخصوص انداز میں بولے۔

"صاحب میرے نزدیک تو آم میں صرف دو خوبیاں ہونی چاہئیں —— ایک تو وہ میٹھے ہوں، دوسرے بہت ہوں۔"

حاضرینِ محفل یہ جواب سُن کر بہت محظوظ ہوئے۔

اسی طرح حکیم رضی الدین خاں سے ایک واقعہ منسوب ہے۔ حکیم صاحب مرزا غالبؔ کے خاص دوستوں میں سے تھے اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اُنھیں آم قطعی مرغوب نہ تھے۔ ایک دن وہ مرزا کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آموں کا موسم تھا اور گلی میں آموں کے چھلکے پڑے ہوئے تھے۔ اتفاق کی بات اُس گلی سے ایک گدھے کا گذر ہوا۔ اُس نے رُک کر آموں کے چھلکے سونگھے اور پھر آگے بڑھ گیا۔ یہ دیکھ کر حکیم صاحب کی باچھیں کھل گئیں اور اُنھوں نے مرزا غالبؔ کو مخاطب کر کے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

"دیکھا بھئی مرزا۔ تم آموں کی بڑی تعریف کرتے تھے مگر آم ایسی چیز ہے کہ اُسے گدھے بھی نہیں کھاتے۔" مرزا غالبؔ نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"بجا فرمایا حکیم صاحب۔ بلاشک گدھے آم نہیں کھاتے"

حکیم صاحب یہ سُن کر جھینپ گئے۔ بیچارے کرتے بھی کیا۔ اُلٹی چوٹ ہو گئی تھی۔ ایسی ہی چوٹ غالبؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ پر بھی کی تھی۔ لیکن اُس چوٹ میں ادب ملحوظِ خاطر رکھا تھا۔ ویسا ہی آموں کا موسم تھا اور شہنشاہ ظفرؔ اپنے چند مصاحبین کے ساتھ حیات بخش باغ میں چہل قدمی فرما رہے تھے۔ آموں کے درخت پھلوں کے بوجھ سے زمین کی طرف جھکے چلے آ رہے تھے۔ مرزا غالبؔ بھی شاہ کے ہمراہ تھے اور بار بار آموں کو بہت ہی توجہ سے نزدیک جا کر دیکھتے جاتے تھے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کو بہت حیرت ہوئی۔ آخر کار اُنھوں نے دریافت کر ہی لیا۔

"اماں مرزا —— تم اتنے غور سے آموں کو کیوں دیکھ رہے ہو۔ کیا پہلے کبھی آموں کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا"

مرزا نے جواب دیا۔ "پیرو مُرشد! آم تو بہت دیکھے ہیں۔ مگر اس وقت تو یہ غلام یہ دیکھ رہا ہے کہ کسی بزرگ نے جو یہ شعر کہا ہے کہ ؎

بر سرِ ہر دانہ بنوشتہ عیاں ✱ کایں فلاں ابنِ فلاں ابنِ فلاں

اسی لیے پیر و مرشد میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ میرا یا میرے باپ دادا کا نام بھی ان پر کہیں لکھا ہے یا نہیں ؟

بہادر شاہ ظفر یہ سُن کر مسکرائے اور غالب کے جانے کے بعد اُنھوں نے بہترین آموں کی ایک بہنگی بھروا کر مرزا کے گھر بھجوادی۔

ایسے ہی مرزا کے کسی عقیدت مند نے ایک بار اُنھیں عمدہ عمدہ آموں کا ایک ٹوکرا بطور تحفہ بھیجا۔ مرزا وہ ٹوکرا کھولنے لگے تو کسی نے کہا۔

"یقیناً اس میں شراب ہی ہوگی ۔۔۔"

ٹوکرا اس عرصہ میں کھل چکا تھا۔ غالب نے اُسے دیکھ کر فرمایا۔

"جی نہیں یہ لطفِ خاص نہیں، فیض عام ہے۔ یعنی حضرت یہ شراب نہیں آم ہے۔"

اپنے عزیز دوست علائی کے نام ایک منظوم خط میں بھی اُنھوں نے آم کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

خوشی تو ہے آنے کی برسات کے ؛ پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سرِ آغازِ موسم میں اندھے ہیں ہم ؛ کہ دلی کو چھوڑیں لوہارو کو جائیں

اب آخر میں آموں کی تعریف میں اُن کا ایک قصیدہ بھی پڑھ لیجئے۔

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز ؛ کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز
خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا ؛ شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے؛ نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے ؛ خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں ہے؛ ثمر و شاخ، گوئے و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں ؛ آئے یہ گوئے اور یہ میداں
آم کے آگے پیش جاوے خاک ؛ پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور ؛ بادۂ ناب بن گیا انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے ؛ شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو تمھیں خبر کیا ہے ؛ آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار ؛ جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار
اور دوڑایئے قیاس کہاں ؛ جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی ؛ کوہکن باوجودِ غمگینی
جان دینے میں اس کو یکتا جان ؛ پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر ؛ کہ دواخانۂ ازل میں مگر
آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام ؛ شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے ؛ باغبانوں نے باغِ جنت سے
انگبیں کے بہ حکمِ رب الناس ؛ بھر کے بھیجے ہیں سر بہ مہر گلاس
یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات ؛ مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل ؛ ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل
تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس ؛ رنگ کا زرد پر کہاں بو باس
آم کو دیکھتا، اگر اک بار ؛ پھینک دیتا طلائے دست افشار
رونقِ کارگاہِ برگ و نوا ؛ نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہروِ راہِ خلد کا توشہ ؛ طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ
صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم ؛ ناز پروردۂ بہار ہے آم
خاص وہ آم، جو نہ ارزاں ہو ؛ نو برِ نخلِ باغِ سلطاں ہو
وہ کہ ہے والیٔ ولایتِ عہد ؛ عدل سے اُس کے ہے حمایتِ عہد
فخرِ دیں، عزِ شان و جاہ و جلال ؛ زینتِ طینت و جمالِ کمال
کار فرمائے دین و دولت و بخت ؛ چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت
سایہ اُس کا ہُما کا سایہ ہے ؛ خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے
اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور ؛ جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور
اس خداوندِ بندہ پرور کو ؛ وارثِ گنج و تخت و افسر کو
شاد و دل شاد و شادماں رکھیو!
اور غالب پہ مہرباں رکھیو!

ذہنِ غالب کا فانوسِ خیال

پروفیسر تنویر احمد علوی (پی۔ ایچ۔ ڈی)

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے ٭ سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

غالب کا ذہن ایک بت تراش کا ذہن تھا جو اپنے نگار خانۂ فکر و خیال میں ہمہ وقت اپنے حسین پیکروں کی تشکیل و تزئین میں مصروف رہتا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اُس کے دیوان کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

مگر اس کی دنیا کے یہ تخیلی پیکر دیر و حرم کے طاق و محراب میں سجے ہوئے بُت نہیں تھے بلکہ اس کے احساس و ادراک کی جلوہ گاہوں کے وہ اصنام ہیں جو ہمیشہ خوشبوؤں کی طرح متحرک اور رنگوں کی طرح رقص فرما رہتے ہیں اسی لیے اس کے یہاں زندگی کی کوئی آخری منزل نہیں ہے جہاں پہنچ کر رقصِ دوام کا یہ سلسلہ ٹوٹ جائے ؎

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

دیر و حرم اس کے لیے آئینۂ تکرارِ تمنا ہیں مگر اس کے آستانوں پر سجدہ ریز ہو جانا واماندگیِ شوق کی بہانہ تراشی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ محبوب کو بھی وہ ہمیشہ کے لیے اپنے آغوشِ تمنا کی زینت بنانا نہیں چاہتا اس لیے کہ اس کی جدائی اور اُس کے وصال کی لذتیں الگ الگ ہیں۔ "وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد" غالب کے یہاں تخیل و تفکر کی وہ انتہائی نازک

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے ؎ رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

تصویریں بھی ملتی ہیں جنہیں صرف "عکسِ خیالِ بلند" کہا جا سکتا ہے مگر وہاں پہنچکر بھی اس کے احساس پر تھکن طاری نہیں ہوتی بلکہ قلبِ ہستی اور رگِ حیات کی طرح اس کی حرکت جاری رہتی ہے۔

نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

اس کے یہاں موجوں کی مسلسل روانی اور ساحل کی تشنہ لبی زندگی کے اس ازلی و ابدی تجسس اور احساسِ نا تمامی کی علامت ہے جس کے ساتھ کاروانِ حیات آگے بڑھتا ہے اور ذہنِ انسانی خوب سے خوب تر کی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے۔ یہ ایک عجیب اور نہایت دلچسپ حقیقت ہے کہ گو حُسن فقط حُسنِ نظر کا نام ہو تو شعلہ میں بھی وہی گل پیرہنی موجود ہے جو پھول

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

کا مقسوم ازلی ہے اور اگر ایک مرکز خیال سے وابستگی ذہن انسانی کو رشتہ پیمانہ کرے تو کار آذر بھی وہی ہے جسے بُت شکنی کہا جاتا ہے، بُت شکنی اور بُت گری دونوں ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں اور فکر انسانی اسی حلقۂ شام و سحر کے مابین اپنی تخلیقی توانائیوں کے احساس کے ساتھ سنگتراشی میں مصروف رہتا ہے۔

ہر چند سبک دست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

غالب کا ذہن تخریب اور تعمیر کو دو الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹتا بلکہ انھیں ایک دوسرے کا عکس سمجھتا ہے۔

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولا برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

ان کے نزدیک خونِ گرم کی گردش زندگی کا رقص ہے یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ غالب نے اپنی بیشتر تشبیہیں اور تمثیلیں "آگ" سے لی ہیں۔ وہ شعلہ کی روشنی سے زیادہ اس کی رقصانی پر جان دیتا ہے۔

آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے
سرگرم نالہ ہائے شرربار دیکھ کر

اس کے یہاں خون بھی وہی ہے اور شعلہ بھی وہی اس لیے کہ دونوں زندگی کے "رقص" کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

جُوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہوگئیں

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

اس نے "رقص شرر" کو زندگی کی علامت قرار دیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ زندگی کو آنی و فانی سمجھتا ہے بلکہ یہ ہیں کہ وہ اس کی سیماب وشی اور برق نفسی کا قائل ہے اور سکون کو زندگی کی نفی تصور کرتا ہے۔ جنت کے تصور سے اُسے اسی لیے کوئی خاص دلچسپی نہیں کہ وہاں اُکتا دینے والی یکسانیت اور نہ ختم ہونے والا سکون میسر آئے گا، فردوس میں "روزنِ در" اگر نہیں تو "نظر بازی" اور "لطف دیدار" کہاں وہ ذوق نظر کے مقابلہ میں تسکین قلب کو قربان کرنے کے لیے تیار ہے یہ "ذوقِ نظر" اس کے یہاں رجائیت اور زندگی کی علامت ہے۔

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حُورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

غالب کا محبوب اُس کی آرزوئے حیات کا تخیلی پیکر اور اس

کی تمنائے شباب کا عکس جمیل ہے اسی لیے اُس کی ہر بات بلائے جاں ہے ۔

عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

غالب کے یہاں واردات عشق کا بیان نفسیات عشق میں بدل گیا ہے ۔

مگر اُس کے نفسیاتی واردات میں بھی اُس کی زندگی اور ذہن کی وہی بے چین کیفیت موجود ہے ۔

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا
احباب چارہ سازئ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں نہیں آتا ہے وہ گھر کے لیے
نہ برق میں یہ کرشمہ نہ شعلہ میں یہ ادا
کوئی بتلائے کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

غالب عشق اس لیے کرتے ہیں کہ بے عشق کے زندگی نہیں کٹ سکتی عشق ہی زندگی کو لذتِ آزار سے آشنا کرتا ہے جس کے بغیر زندگی کا کوئی مفہوم نہیں یہاں رسائی سے زیادہ نارسائی میں لطف ہے جو توسن ادراک کے لیے "مہمیز" کا کام دیتی رہتی ہے ۔

عشق مُجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
جادۂ غیر از نگہہ دیدۂ تصویر نہیں

غالب زندگی سے اس لیے محبت نہیں کرتے کہ اس کو دوام میسر ہے بلکہ اس لیے کہ وہ آتی ہے اور یہی ایک آن "دو نشاط کار" کی صورت میں اس کے ذوقِ حیات کو غیر فانی بنا دیتی ہے ۔

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

ہوس کو نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

وہ جادۂ راہ فنا کو بھی عالم کے اجزائے پریشاں کی شیرازہ بندی کہتا ہے یعنی زندگی کے لمحات و ثانیات ریگِ رواں کے ذرات کی طرح فطرت کے غیر مرئی تقاضوں کے تحت اپنا مرکز و محور بدلتے رہتے ہیں ۔

غالب کے یہاں اسی لیے محبوب کے ساتھ وفاداری کا تصور وابستہ نہیں ۔

ہاں وہ نہیں وفا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جسکو ہو جان و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

تاب لاتے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

برق گرتی ہے تو اُن کے دل کی دنیا کو غم کے سیہ خانے میں نہیں بدلنے دیتی بلکہ غم حیات کی بجھی ہوئی شمع کو روشن کردیتی ہے

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

غالب کی فکر ایک ایسی اندرونی تحریک سے عبارت ہے جسکی موجِ رواں کبھی آسودہ نہیں ہوتی ان کی طبیعت اگر کبھی رکتی بھی ہے تو اس لیے کہ زیادہ رواں ہو۔ اُن کا ذہن ہمہ وقت متحرک رہتا ہے ان کا دل "ایک شہر آرزو" ہے جسکے ہنگاموں میں کبھی سکون کی نیند طاری نہیں ہوتی۔ ایک زخم ہزار زخموں کو پیدا کرتا ہے۔

قطرہ قطرہ اک ہیولا ہے نئے ناسور کا
خوں بھی ذوقِ زخم سے فارغ مرے تن میں نہیں

اور ایک خیال ہزار خیالوں کو جنم دیتا ہے۔

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیِ نیرنگ یک بت خانہ ہم

غالب کا ذہن ہمہ وقت جن تصورات کو تصویروں میں بدلتا رہتا ہے وہ ہر تصویر کی طرح آزادی میں بھی بے پروبالی کی شکوہ سنج نہیں ہوتیں اُن کی صفت تو نسیم صبا کی آزادی ہے

آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل

دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

گر نہیں نگہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

اس کا سینہ "جویائے زخم کاری" رہتا ہے اس لیے کہ احساسِ حیات میں تب تک "تیر نیم کش" کی سی خلش نہ ہو انسان زندگی کی لذتوں سے بے خبر رہتا ہے۔

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

غالب کے نکتہ رو خیال کی زندگی کا بڑے سے بڑا حادثہ بھی اُسے سانس روک لینے پر آمادہ نہیں کرتا۔

کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

بوئے گل نالۂ دل دُودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

انھوں نے کبھی کبھی یہ بھی چاہا ہے کہ ان کو سکون میسر آئے اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ گردش مدام سے گھبرا گئے ہیں اور یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

مگر سچ یہ ہے کہ وہ جس فرصت و فراغت کے خواہاں ہیں وہ کسی کے صدمۂ جدائی میں دل کو خون کرنے کی فرصت ہے تاکہ وہ جی کھول کر رو سکیں اور کسی کی یاد کو اپنی چشمِ خوں فشاں کے لعل و گوہر کا بیش بہا پیش کر سکیں۔

دل جگر تشنۂ فریاد آیا	پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا	دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
کیوں ترا راہ گذر یاد آیا	زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی

یا پھر وہ ان لمحوں کو فرصت کار و بار شوق کی تمنا کا اظہار سمجھتے ہیں۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

اس تصورِ جاناں کے مترنم پیکروں کا نگار خانہ اسی زمین غزل میں سجایا گیا ہے۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
سامانِ صد ہزار گلستاں کیے ہوئے
ڈھونڈے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے

تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
یہ کیا، کہ، تم کہا اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

قوسِ قزح کے اس رنگین دائرے میں ہر تصویر نامانوس خیال کے پیکروں کی طرح دعوت نظر دیتی ہوئی آتی ہے یہاں تک کہ یہ خیال آگے بڑھتا ہے تو ایک نیا صنم کدہ نظر کے سامنے آتا ہے۔

پھر دل طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

مگر غالب کے افکار کا سجایا ہوا یہ صنم کدہ کبھی ویران نظر نہیں

آتا۔ اس صنم کدہ کا ہر بت بلکہ ہر نقش سراپا رقص ہے ہر

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بت کدہ کا در کھلا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو — موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر — اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا
تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر — بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

غالب کے یہاں کوائفِ عشق کی تصویریں ہوں یا لمحاتِ وصال کے مرقعے ہوں حرکت و اضطراب ان کا نمایاں وصف ہے۔

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ — یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

شبِ فراق میں یہ اضطرار و اضطراب اور زیادہ شدت اختیار کر جاتا ہے۔

شب کو برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا
واں خود آرائی کو موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا
یاں سرِ پُرشور بے خوابی سے تھا دیوار جُو
واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا
جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جُو
رگریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا
فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

نیند اُسکی ہے دماغ اُسکا ہے راتیں اُسکی ہیں
تیری زلفیں جسکے شانوں پر پریشاں ہوگئیں

غالب کے اُن ذہنی پیکروں اور تصویری مُرقعوں میں جو اپنے اندر برق کی سی بے تابی شعلے کی سی لپک، پھولوں جیسا رنگ اور ساز کا سا آہنگ رکھتے ہیں، سب سے زیادہ حسین و دل آویز مُرقع اُن کے اس قطعہ میں ملتا ہے۔ جو اُردو کا بہترین شعری مُرقع ہے اور جسکے آئینۂ خیال میں ہم ایک بار پھر مغل دور کی بہارِ رفتہ کی تصویرِ گذراں دیکھ سکتے ہیں۔

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
لُطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبحدم جو دیکھئے آکر تو بزم میں
نے وہ سرود و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

ایک عظیم نثار جسے دنیا شاعر سمجھتی ہے

(محمد عبدالقادر احقر عزیزی)

میرزا اسداللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ المخاطب بہ نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ، متخلص بہ اسد بحیثیت ایک شاعر عام لوگوں کے سامنے ہیں لیکن ایک نثار کی حیثیت سے عام لوگوں سے پوشیدہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فارسی اور اردو کے بے مثل نثار تھے۔ ان کی اردو نثر کی تصانیف زیادہ تر خطوط اور رقعات ہیں چند تقریظیں اور دیباچے ہیں اور تین مختصر رسالے یعنی "لطائف غیبی"، "تیغ تیز" اور "نامۂ غالب" ہیں۔ یہ سب برہان قاطع کے طرفداروں کے جواب میں ہیں۔ اس کے علاوہ چند جزو نا تمام بھی ہیں جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنے شروع کیے تھے مگر ان سب میں وہ خطوط جو اردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی کے نام سے مشہور ہیں نیز چند تقریظیں جو کتابوں پر لکھی ہیں، نثر اردو کا بہترین نمونہ ہیں۔ اردوئے معلیٰ دو حصوں

نثر کی ایک خاص بنیاد قائم ہوئی، مگر جہاں تک خیال ہے کوئی ان کی پوری تقلید میں کامیاب نہ ہوا۔ یوں تو بہت سی انشا اور رقعات کی کتابیں موجود ہیں اور اکثر مشاہیر کے مکاتیب بھی شائع ہو چکے ہیں لیکن ان کا رنگ مرزا کے رنگ سے علیحدہ ہے ان میں کسی قسم کا تصنع، خشونت و خشکی مطلق نہیں۔ عبارت میں سلاست اور روانی بھی علیحدہ ہے۔ بس قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں اور مضامین کی کثرت اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ ایک دریائے مضامین امڈا چلا آتا ہے۔ ایک خاص صنعت ہے کہ عبارت حد درجہ کی بے تکلف اور روزمرہ کے استعمال کی ہے۔ مگر ابتذال و سوقیت مطلق نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ایک ادبی شان علیحدہ ہے۔ مرزا اکثر ایسے خیالات کا جن سے ان کا مکتوب الیہ موافق بھی نہ ہو اس جسارت، بے باکی اور صفائی سے

میں منقسم ہے پہلے حصہ میں وہ خطوط ہیں جن کی عبارت نہایت ہے جس سے طالب علم مستفید ہوتے ہیں، دوسرا حصہ وہ ہے جس میں مشکل الفاظ کے مطالب اور ان کی تحقیق شامل ہے، نیز چند تقریظیں ہیں، جس سے سخنور فیضیاب ہوتے ہیں۔

اردوئے معلیٰ :۔ ۱۸۵۰ء تک مرزا فارسی ہی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ جیسا کہ ان کے خطوط سے ظاہر ہے۔ جو پنج آہنگ میں پوشیدہ ہیں نیز بعض جگہ اردوئے معلیٰ میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ اس کے بعد مرزا نے اردو میں خط لکھنا شروع کیا۔ اس کا رنگ بالکل مخصوص ہے اور انہی پر اردو

ظاہر کرتے ہیں کہ گویا وہ جان رہے ہیں کہ ان کی تحریر کا زور اور ان کا اندازِ بیان مخالف کی زبان بند کر دے گا۔ ان کی تحریر میں بالکل باتوں کا مزہ آتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اور بعض خطوط تو فی الواقع مکالمہ کی صورت میں لکھے گئے ہیں۔ جس میں مکتوب الیہ کو غائب سمجھ لیا ہے جس سے مکتوب الیہ دور معلوم ہوتا ہے۔ مرزا نے اپنے خطوط میں علاوہ ایک طرزِ خاص اختیار کرنے کے یہ جدت بھی کی ہے کہ القاب و آداب کا فرسودہ طریقہ نیز بہت سی اور باتیں جو عموماً خط میں لکھی جاتی ہیں لیکن درحقیقت فضول اور بے کار ہیں، سب کو

چھوڑ دیا۔

ہیچ آہنگ میں لکھتے ہیں کہ خطوط نویسی کا میرا یہ طریقہ ہے کہ جب لکھنے کو قلم اٹھاتا ہوں تو مکتوب الیہ کو ایسے الفاظ سے پکارتا ہوں جو اس کی حالت کے موافق ہوتا ہے اور اس کے بعد ہی مطلب شروع کر دیتا ہوں۔ القاب و آداب کا پرانا طریقہ اور شکر و شکوہ شادی و غم کا قدیم روّیہ میں نے بالکل ترک کر دیا ہے۔ مثلاً نمونہ ملاحظہ ہو!

"ہا ہا ہا! میرا پیارا مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو یہ رام پور ہے۔ دارالسرور ہے جو لطف یہاں ہے اور کہاں ہے۔ آؤ میاں سیّد زادہ آزادہ دلی کے عاشقِ دلدادہ ڈھئے ہوئے اُردو بازار کے رہنے، حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے" الخ

دوسرا نمونہ:۔ "برخوردار نورِ چشم مہدی کو بعد دعائے حیات و صحت کے معلوم ہو بھائی تم نے بخار کو کیوں آنے دیا" الخ

مرزا کے وہ خطوط جو بنام میر مہدی ہیں، ور مکالمہ کی شکل میں لکھے گئے ہیں معجز نما معلوم ہوتے ہیں اور اس سے تحریر کی خصوصیات کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ القاب و آداب کا غائب ہونا۔ فرضی مکالمے سے خط کا آغاز ہونا، عبارت کی سادگی، بے تکلفی مذاق کے پیرایہ میں دوستانہ نصیحتیں کرنا، جمہوریت پسندی کے برخلاف پرائیویٹ خط میں ملکۂ انگلستان کے پہلے جناب لکھنا جس سے ان کی حد درجہ قدامت پسندی اور تہذیب کا پتہ چلتا ہے جس سے خطوط نویسی پُرانے تصنّع اور بے موقع اظہارِ علمیت سے آزاد ہو کر نہایت شیریں اور دلچسپ ہو گئی۔ ہر چند یہ اختراع ان کے معاصرین کو پسند نہ آیا۔ مگر جوں جوں زمانہ بدلتا گیا، اس کی اہمیت کا صحیح احساس ہوا اور ہر طرف اس کے متبعین پیدا ہو گئے، مولانا حالی، سر سید، ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد اور دوسرے اہل قلم امیر مینائی وغیرہ ہم نے بھی عبارت کی سادگی کو پسند کیا اور اپنے اپنے طریق پر نثریں لکھیں۔ مگر حق یہ ہے کہ مرزا کی سادگی، دل کشی، شوخی و ظرافت، جذبات نگاری اور

اظہار مافی الضمیر میں کوئی ہم پلّہ نہ ہو سکا ان رقعات کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اُن کے حالاتِ زندگی کے آئینہ دار ہیں

نامہ غالب

بخدمت مشفقی مکرمی مرزا رحیم بیگ صاحب نورا مدہ طلب با اسرار و جینہ
بالا فزا سنی جند گفتہ می شود سـہ نہ در شعل پارسی و دری + ہمین بندہ ای
سادہ و رستہ ای + جنبلج توحید مین فن پاسوی امہ دستوری تحکو سحر زیرین
حذف نہ و اند سنفورہی مزم مقابلہ نہین فقط مجادلہ نہین تیر تا منز و سنانہ
حکایت ہی خاتمہ مین ایک شکایت ہی شکوہ و ... و مندانہ منانی شیوہ ادب نہین
ستیزہ اظہار ... دل مرادی کوئی بات نواب طلب مین اب اسند ہوں
آپ کا کر آپ نی منشی سعادت علی کی طرح آدہا نام میرا نہ لکھا آپ کی حسن ظن
کی مطابق تحکو معشوق میری ... نہ لکھا مگر ایک جگہ یہ الفاظ کہ غالب
غالب باکدام جرس درجوال شدہ ام بہم گئے یا اور دو چار جگہ کلمہ
تو مین رقم سے گئے جنی ابی للف ہے او حسن عقیدت سی جیلی نفرت کا
معلوم ہوں ابی دسین کیا کہ حضرت بی محمد حسین دکنی جانب بر ان کو
موافق میری قول کی نومس یقین کیا یا خرس درجوال شدن عبارت ہی
صحت ہی خواہی ... افسوس کیوں اصل ہو خواہی محبت ہی تحکو اوسکا قریب
بسبیل آموزش ہی تحکو اوسکا ڈر اندرہی آمیزش ہی یا دوسری فقیری کو
سن یہ نہ رائی تحکو بی تکلف میری ضمیر مین آئی کہ فرس کی مدد دینی ہے
کرفت حاصل ہوئی اور ... کوفت باعث ... دل ہوئی تشنت در ...
جہنا ہی جلاتا ہی آہی وای کرتا ہی مل بجاتا ہی جیسا کہ سعدی ... دستان
کی اوس حکایت مین جسکا پہلا مصرع یہ ہی سـہ تنہے زنت فکرت
میں سو ختم + فرماتا ہی سـہ کرنا چار فریاد خیزد زمرد + جناب اصحاب

غالب کے ایک خط کا عکس ——

پشت کا حصہ سامنے والے صفحہ پر ملاحظہ کیجئے

اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے غم و الم اُنھیں ہمیشہ ستاتے رہے اور مرزا نے بلند حوصلگی سے مصائب برداشت کیے اور ہنسی میں ٹال گئے۔ ان تحریروں کا مزہ وہی پا سکتے ہیں جو مرزا اور مکتوب الیہم کے ذاتی معاملات سے بخوبی واقف ہوں۔ اگر کوئی ان کے مکتوبات کو تاریخ وار سلسلہ وار جمع کرے اور اُن کے وہ حصے جو حالات زندگی سے متعلق ہیں، علیحدہ کرے تو مرزا کی ایک خود نوشت سوانح عمری مرتب ہوجائے۔ یہ خطوط انکی زندگی اور جزئیات زندگی سے متعلق ہیں۔ ان کی حیات، احباب، اور معاصرین سے تعلقات، ان کے نظریات، اور قدیم شعراء کے متعلق خیالات سب بخوبی اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ بعض مکتوبات سے پتہ چلتا ہے کہ خط سے مقصود مکتوب الیہ کو خوش کرنا ہے اور اس کا غم غلط کرنا ہے۔ ان کا مذاق ظرافت سب سے نرالا ہے۔ اُردو نثر میں کوئی اس کا جواب نہیں۔ اہل یورپ میں بھی اس قسم کی ظرافت مفقود ہے۔ فرنچ شاعر والٹر اور انگریزی نثار ڈین سوئفٹ اپنے اپنے طرز میں خاص رنگ ظرافت رکھتے ہیں۔ مگر مرزا ان سب سے علیحدہ ہیں۔ والٹر کی طرح ان میں نقالی اور سوئفٹ کی طرح تیزی اور دل آزاری نہیں ہے۔ ان کی ظرافت اور نزاکت کا پرتو ایڈیسن میں کچھ کچھ پایا جاتا ہے۔ مرزا کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اُنھوں نے نثر اُردو کو خشکی اور بد مزگی کے الزام سے بچا لیا۔

مرزا کا قدیم رنگ یعنی مقفیٰ و مسجع عبارت :- جیسا کہ بنام میر مہدی لکھے گئے خط میں موجود ہے۔ مرزا کا یہ قدیم رنگ صاف نمایاں ہے۔ مثال کے طور نمونہ ملاحظہ ہو :-

”یہ رام پور ہے، دار السرور ہے، سید زادہ آزادہ، دلّی کے عاشق دلدادہ، ڈھے ہوئے اُردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے“ اس خط میں رام پور اور دار السرور آزادہ، دلدادہ، کہنے، رہنے یہ تمام الفاظ ہم قافیہ ہیں۔ مرزا ہر چند خطوط میں سادگی اور سلاست عبارت کے قائل ہیں مگر رواجِ زمانہ کے موافق احباب کی کتابوں پر تقریظیں اُسی پُرانے انداز میں لکھتے ہیں۔ اس کی وجہ میں مرزا معذور ہیں۔ جو لوگ تقریظ اور دیباچے کی فرمائش کرنے والے تھے وہ بغیر ان تکلفات کے خوش ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانے میں ریویو کا نکلا ہے۔ اس کو اب بھی لوگ کم پسند کرتے ہیں اور مرزا کے وقت میں تو اس کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اس کا صحیح اندازہ مرزا کی دو تقریظوں سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ ایک تو وہ جو مرزا رجب علی بیگ سرور کی گلزار سرور کی تقریظ اور دوسرے مفتی میر لعل کی کتاب سراج المعرفت کی تقریظ، اس سے مقفیٰ اور مسجع عبارت کا صحیح اندازہ مل سکتا ہے۔

مرزا کی نثر میں فارسی ترکیبیں:۔ مرزا کے رقعات میں فارسی ترکیبیں، محاورات، فارسی کی خوشنما تراشی، اور عمدہ تراکیب پائی جاتی ہیں، بعض فقرے کم استعداد ہندستانیوں کے ذہن میں نہیں سماتے اور لوگ جدت کو نہ سمجھیں تو اس میں مرزا کا قصور نہیں، یہ اپنی کم علمی کا قصور ہے۔ مثلاً چند ترکیبیں بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:۔

"کیا خون جگر گن اتفاق ہے۔ اب در رنگ ورزی کی تقصیر معاف فرمایئے۔ بس چاہیئے کو دل کی آرامش کا ترک کرنا۔ اور خواہی نخواہی بابو صاحب کے ہمراہ رہنا۔ یہ مرتبہ میری نازش کے فوق ہے۔ سرمایۂ نازشِ قلمرو ہندوستان ہوں"۔

اس میں خونِ جگر گن، در رنگ ورزی، آرامش، خواہی نخواہی، ارزش، سرمایہ نازشِ قلمرو، فارسی ترکیبیں ہیں۔ کتنی بے باکی سے مستعمل ہیں۔

فارسی محاورات کا اردو ترجمہ:۔ بعض بعض جگہوں پر مرزا نے فارسی محاورات کا بے ساختہ اور سلیس ترجمہ بھی کیا ہے، جیسا کہ دوسرے اساتذہ کے کلام میں موجود ہیں۔ مثلاً نمونہ ملاحظہ ہو۔

"اس قدر عذر چاہتے ہو"۔ یہ جملہ خاص فارسی کا ترجمہ ہے جیسے فارسی کے مرکب مصدر عذر خواستن سے بنایا گیا ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں عذر کرنا یا معذرت کرنی مستعمل ہے جیسے مرزا نے عذر چاہنا ترجمہ کیا ہے۔

مرزا کے خط میں اصلاحی پہلو:۔ مرزا کی تقریظیں نثاری کے عمدہ ترین نمونے ہیں۔ اظہار خیال میں بے باکی اور ناصحانہ انداز ہر وقت موجود رہتا ہے اور ضرورتاً ڈانٹ ڈپٹ بھی کر جاتے ہیں۔ جس کا اندازہ مرزا کے ان خطوط سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھے ہیں، لکھتے ہیں کہ

"مرزا تفتہ یہ غلطی تمہارے کلام میں کبھی نہیں دیکھی تھی کہ شعر ناموزوں ہو۔ بڑی قباحت یہ کہ اعم بہ تشدید لفظ عربی ہے "دیگر نتواں گفت آنکس را کہ اعم است" مگر بحر اور ہو جاتی ہے۔ مانا کہ فارسی نویسانِ عجم نے یوں بھی لکھا ہو۔ کاف کے اسقاط کی کیا توجیہہ کروگے اور پھر اس صورت میں بھی بحر بدل جاتی ہے۔ ناچار اس شعر کو نکال دو۔ ہم نے تمہیں قصائد لکھنے کو کہا تھا۔ اب ہم منع کرتے ہیں کہ عاشقانہ قصائد نہ لکھا کرو۔ مدح بشرطِ ضرورت لکھو مگر بفکر و غور"۔ غالب

دوسرا نمونہ:۔ صاحب کشیدن کی جگہ در کشیدن اور برکشیدن، بلکہ برکشیدن کی جگہ درکشیدن نہ چاہیئے۔ برآمدن اور درآمدن کا استعمال بعض متاخرین نے عام کر دیا ہے۔ یعنی درآید سے برآید کے معنی لیے ہیں لیکن در

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

آداب بجا لاتا ہوں غزلوں کے مسودات کو صاف کر کر حضور میں بھیجتا ہوں مسودات اپنے پاس
رہنے دیتا ہوں اس نظر سے کہ اگر احیاناً ڈاک میں لفافہ تلف ہو جائے تو میں پھر ان کو صاف
کر کر بھیج دوں ورنہ موقع حک و اصلاح مجھے کیا یاد رہیگا میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسم اور
نام اپنی تخلص رہے ناظم عالی انور شوکت نیسان انہیں سے جو پسند آئے وہ رہنے
دیجئے مگر یہ نہیں کہ خواہی نخواہی آپ ایسا ہی کریں اگر وہی تخلص منظور ہو تو بہت مبارک
زیادہ حد ادب تم سلامت رہو قیامت تک عنایت کا طالب غالب روز یکشنبہ ۱۳ فروری ۱۸۵۷

کشیدن اور ہے اور برکشیدن اور" الخ

تیسرا نمونہ :۔ حضرت اس قصیدہ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے کیا کیا شعر نکالے ہیں لیکن افسوس! بے محل اور بے جا ہے۔ اس مدح اور اس ممدوح کا بعینہ وہ حال ہے کہ مزبلہ پر سیب یا بہی کا درخت اُگ آئے، خدا تم کو سلامت رکھے دکان بے رونق کے خریدار۔

مرزا کے خط میں لفظی تحقیق کا نمونہ :۔ مرزا بنام میر مہدی تحریر کرتے ہیں جس میں لفظ فہمائش کی تحقیق اس طرح بیان کرتے ہیں :۔ فہمائش "امر کے صیغے کے آگے شین آتا ہے تو وہ امر معنی مصدری دیتا ہے اس کو حاصل مصدر کہتے ہیں، سوختن مصدر، مضارع سوزد، امر سوز، سوزش حاصل بالمصدر۔ اسی طرح ہیں خواہش، کاہش، گزارش، آرائش، الخ

دوسرا نمونہ :۔ "تذکیر و تانیث کا کوئی قاعدہ کلیہ منضبط نہیں کہ جس پر حکم کیا جائے جو جس کے کانوں کو لگے جس کو جس کا دل قبول کرے اس طرح کہے رتھ میرے نزدیک مذکر ہے یعنی رتھ آیا لیکن جمع میں کیا کروں گا، ناچار مؤنث بولنا پڑے گا۔ یعنی رتھیں آئیں، خبر مؤنث ہے یہ اتفاق، مگر کاغذ اخبار اس کو خود سمجھ لو کہ تمہارا دل کیا قبول کرتا ہے۔ میں تو مذکر کہوں گا یعنی اخبار آیا۔ بُلبل میرے نزدیک مؤنث ہے جمع اس کی بُلبلیں، طوطی بولتا ہے، بُلبل بولتی ہے۔ بھائی اس امر میں مفتی اور مجتہد بن نہیں سکتا اپنا عذر یہ لکھتا ہوں جو چاہے مانے جو چاہے نہ مانے"۔ نجات کا طالب غالب

مندرجہ بالا دلائل سے صاف واضح ہے کہ مرزا غالب ایک عظیم نثار تھے۔ جنہوں نے صرف نثر نگاری ہی نہیں کی بلکہ اس شعبے میں نئے طرز کا آغاز کیا۔ مرزا ایک طرزِ نو کے موجد ہیں، واقعی مرزا لکھتے تھے کافی محنت سے، اور اس سے اُن کی طبیعت کبھی نہیں اُکتائی۔ مرزا خط لکھنا خوب جانتے ہیں، اور دوسروں کو تاکید بھی کرتے تھے اور اسی خط و کتابت کی کثرت نے اُنھیں اسم با مسمیٰ ثابت کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اُنھیں شعراءِ عظام کی صف میں لا کھڑا کیا جائے تو غالب رہیں گے۔ اور اگر نثر نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا جائے تو بلاشبہ اُن میں بھی غالب رہیں گے۔ دنیا مرزا کو ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن وہ درحقیقت ایک عظیم نثار بھی تھے ★

ہندوستان کی تعمیر و ترقی دوسرے ملکوں کے ساتھ ہمارے باہمی تعلقات پر بہت کچھ منحصر ہے۔ یہ ملک ایک وسیع ملک ہے۔ یہ دنیا میں برصغیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ملک ماضی کی شاندار روایات کا حامل ہے۔ یہ قدیم ترین تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا جب اس کو سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا۔ کولمبس اس سونے کی چڑیا کی تلاش میں گھر سے نکلا تو اس نے ایک نیا براعظم دریافت کر لیا۔ یورپ کی قوموں نے اپنی تہذیب و تمدن کو ہندوستان کی بے شمار دولت سے سنوارا اور نکھارا ہے۔ یہ ایشیا کا پہلا ملک ہے جس نے غلامی کی زنجیریں کاٹ کر ایشیائی و افریقی ملکوں کو آزادی و خود مختاری کا راستہ دکھلایا اور جدوجہد آزادی کی شاندار روایات کو قائم کیا۔ ہندوستان کے آزاد ہوتے ہی ایشیا اور افریقہ کے ملکوں سے غلامی اور سامراجی نظام کا خاتمہ ہونے لگا۔ آزادی کی دیوی چاروں طرف مسکرانے لگی۔ اور دولت انگلشیہ کی وسیع و عریض سلطنت سمٹ کر اپنے خول میں سمانے لگی۔ اس طرح عالمگیر جدوجہد آزادی کی تاریخ میں ہندوستان کو پیش رو کا درجہ حاصل ہوا۔ ہندوستان نے عالمگیر رہنمائی کی شمعیں روشن کیں۔ اور شاید اسی لئے جب یہ ملک آزاد ہوا تو ایشیائی اور افریقی دنیا امید و یقین بھری نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی ہندوستان اس کی تمناؤں آرزوؤں اور توقعات کا مرکز بن گیا تھا۔ غریبی پسماندگی اور غلامی کے درد سے کراہتی ہوئی یہ دنیا ہندوستان کو اپنا نجات دہندہ تصور کر رہی تھی۔ نہرو کی حسین شخصیت اور گاندھی جی کا امن و آشتی کا پیغام تاریکی میں اجالے کی کرن بنکر جگمگا رہے تھے۔ ہندوستان کے لئے یہ سنہری موقع تھا کہ وہ اس مجبور و کمزور دنیا کو رہنمائی کے چراغ دکھلاتا۔ یگانگت۔ دوستی اور محبت کے مضبوط رشتے استوار کرتا۔ ان ملکوں کو اپنے قریب لاکر اپنی سیاسی اور معاشی پوزیشن مضبوط کرتا۔ مگر یہ اس ملک کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ ایسا نہیں ہو سکا۔ ہندوستان

کی عظمت کا جو خواب دنیا دیکھ رہی تھی وہ شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔ ہندوستان عظیم طاقتوں کی سیاست میں الجھ کر اپنے اصل مشن کو فراموش کر بیٹھا۔ وہ پچھلے بیس سال سے پڑوسی اور چھوٹے ملکوں کو نظر انداز کر کے بڑی طاقتوں کی رسہ کشی میں اپنی ٹانگ پھنسانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ جے پرکاش نارائن نے ہما کے لئے اپنے انٹرویو میں اس پالیسی پر اپنے افسوس کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا ہندوستان نے غیر جانبداری کی پالیسی پر غیر جانبداری سے عمل نہیں کیا ہے۔ ہندوستان نے اپنے دوست کم بنائے ہیں۔ اور پچھلے ماہ اشوک مہتہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بھی حکومت کی بین الاقوامی پالیسی پر سخت نکتہ چینی کی تھی انہوں نے اس بات پر غم کا اظہار کیا تھا کہ ہندوستان نے افریقی ایشیائی ملکوں کے ساتھ تجارتی اور ثقافتی تعلقات قائم کرنے پر بہت کم زور دیا ہے۔ آج آزادی کے بیس بائیس سال گزرنے کے بعد حکومت بھی اپنی بین الاقوامی پالیسی پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو رہی ہے۔ حکومت کی بین الاقوامی پالیسی نے نیا موڑ لیا ہے۔ اب ہم چھوٹے اور پڑوسی ملکوں سے قریب آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شہنشاہ اور شاہ بانو ایران کا حالیہ دورۂ ہند اس کی ایک مثال ہے۔ ابھی نائب وزیر اعظم نے کچھ پڑوسی ملکوں کا دورہ بھی کیا ہے۔ بیشک یہ ایک مبارک قدم ہے جو ہندوستان کی تعمیر و ترقی کا ضامن ہے۔

ہندوستان کے بین الاقوامی تعلقات کی تاریخ میں متحدہ عرب جمہوریہ ایک ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ متحدہ عرب جمہوریہ جسے مصر بھی کہتے ہیں ہندوستان کا سب سے بڑا دوست ہے اس کے ساتھ سیاسی دوستی کا آغاز تو نہرو کے دور سے ہوا تھا جب یوگوسلاویہ، مصر اور ہندوستان نے مشترکہ طور پر غیر جانبداری کی پالیسی پر عمل کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اور جب ہی سے اس دوستی کی دیواریں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہیں۔

ہز ایکسیلنسی محمد امین حلمی ثانی نے انٹرویو کے دوران میرے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا، ہندوستان اور مصر کی دوستی، تعلقات باہمی محبت و یگانگت اور خوشگواریت کی اس انتہائی منزل پر پہونچ گئے ہیں جہاں سے انہیں آگے بڑھانا مشکل ہے۔ ایک سفیر کی حیثیت سے انہیں تعلقات کو قائم رکھ سکوں تو سمجھوں گا میں نے اپنے فرض کا حق ادا کر دیا ہے۔"

مگر محمد امین حلمی سے صرف ہند و مصر دوستی پر ہی بات چیت کرنا میری ملاقات کا مقصد نہیں تھا۔ میں اس ملک کے نمائندے سے ملنا چاہتا تھا جس کی سرزمین کو نیل کی موجیں سیراب کرتی ہیں۔ وہ ملک جس کی تہذیب ہندوستان و چین سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ وہ ملک جو اپنی گود میں انقلابوں کو پروان چڑھاتا رہا ہے میں جمال عبدالناصر کے ملک کے نمائندے سے ملنا چاہتا تھا۔ میں اس حسین اور قدیم ملک کے ماضی کی شاندار یادوں کو ھُما کے پروں میں سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ جس کی وادی میں علم و تمدن کی پہلی شمع روشن ہوئی تھی۔ جہاں سے خدا کے برگزیدہ پیغمبروں نے جہالت کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی دنیا کو حق و صداقت کا پیغام سنایا تھا۔ جہاں حق و باطل کے بے شمار معرکے ہو چکے ہیں جہاں دور فراعنہ کی بے پناہ مادی ترقی کے لازوال نقوش اہرام مصر کی شکل میں بیسویں صدی کی سائنسی و فنی ترقی کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اور جہاں باطل کی آندھیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کے حق و صداقت کے چراغ کو گل کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

محمد امین حلمی سفیر مصر نے ملاقات کے دوران بڑی دلچسپ بات کہی تھی، میرے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا تھا۔ "کچھ ملکوں کی تاریخ صرف کتابوں میں بند ہے۔ اور اس تک پہنچنے کے لئے کتابیں پڑھی جاتی ہیں۔ مگر ہم مصری کتابوں میں اپنی تاریخ نہیں ڈھونڈتے ہیں۔ ہم اپنی تاریخ کے درمیان رہتے ہیں

ہم اسے دن رات محسوس کرتے ہیں۔ ہماری تاریخ ہماری روزانہ کی زندگی کا جز بن چکی ہے۔ یہ ہمارے خون میں سما چکی ہے۔ وادی مصر کا ہر ذرہ اپنے اندر ایک تاریخ رکھتا ہے۔ اس کے چپے چپے پر تاریخ کے نقوش بکھرے پڑے ہیں۔ اس کی بے شمار تاریخی یادگاریں ہیں جو ہر وقت ہمارے ماضی کی یاد دلاتی رہتی ہیں اور اس کی عظمت کو دلوں میں تازہ کرتی رہتی ہیں۔"

نیل اور فراعنہ و قلوپطرہ کی اس سرزمین نے زمانہ کے بیشمار اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ یہ دیش مختلف قوموں اور تہذیبوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ یونانیوں نے اس کو اپنی جولانگاہ بنا لیا۔ عربوں اور ترکوں نے یہاں اپنی تہذیب کے گہرے نقوش چھوڑے اور پھر انگریز اور فرانسیسی آئے۔ ہر ابھرتی ہوئی قوم کے لئے مصر توجہ کا مرکز رہا ہے۔ کوئی فاتح کوئی غازی ایسا نہیں تھا جس نے اپنے گھوڑے کی ٹاپوں سے اس کی سرزمین کو نہ روندا ہو۔ کسی بھی ملک کا جغرافیہ اس کی تاریخ پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مصر کی جغرافیائی پوزیشن ایسی ہے کہ کوئی بھی طوفان چاہے وہ مغرب سے اٹھے یا مشرق سے وہ اس کی زد سے بچ نہیں سکتا۔ بحر روم کے ساحل پر واقع یہ دیش مشرق اور مغرب کو ملانے کی کڑی کا کام دیتا ہے۔ اسی لئے اس کی تاریخ اس قدر رنگا رنگ ہے۔ اس قدر بوقلموں ہے۔ جمال عبد الناصر کی رہنمائی میں ایک نیا مصر جنم لے رہا ہے۔ ۲۳ جولائی کے انقلاب نے اس کو ترقی و خوشحالی کی راہوں پر ڈال دیا ہے۔ جب میں ۲۸۔ اے پرتھوی راج روڈ پر واقع سفیر مصر کی رہائش گاہ پر انٹرویو لینے گیا تو عربوں کے عظیم ہیرو ناصر کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ "کسی بھی قوم کو دو انقلابات سے گذرنا پڑتا ہے۔ ایک سیاسی انقلاب جس کے ذریعہ یہ قوم آزادی و خود مختاری حاصل کرتی ہے۔ دوسرا سماجی انقلاب جس میں سماج کے مختلف طبقے انصاف اور مستحکم صورت حال کے لئے جد و جہد کرتے ہیں۔ جہاں تک ہماری قوم کا تعلق ہے وہ یک ساتھ دونوں انقلابوں سے گذر رہی ہے۔ اسی کے ساتھ ہم اس سرزمین پر ایک عظیم تجربہ آزما رہے ہیں۔"

جب میں محمد امین حلمی کے بنگلہ پر پہونچا تو وہ اپنے وسیع اور خوبصورت ڈرائنگ روم میں اپنے پریس اتاشی محمد الشفکی کے ساتھ بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ ہز ایکسیلنسی ایک پر وقار اور حسین شخصیت کے مالک ہیں۔ اور کوئی بھی ان کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بڑی بڑی مونچھیں۔ بارعب چہرہ۔ اور سوٹ میں ملبوس وہ ایک فوجی افسر معلوم ہو رہے تھے۔ نہایت گرمجوشی سے میرا استقبال کیا گیا۔ اور چند ہی منٹ بعد میں ڈرائنگ روم کی خاموش اور پرسکون فضا میں اپنے انٹرویو کا آغاز کر رہا تھا۔ چند منٹ کی گفتگو میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا محمد امین حلمی کس ٹائپ کی شخصیت ہیں۔ انہوں نے اپنے خیالات۔ انداز گفتگو۔ زبان کی روانی، جوش و جذبہ اور بے تکلفی سے میرے دل پر اپنی شخصیت کی گہری چھاپ لگا دی۔ ان کے یہاں تقیم اور بناوٹ کا شائبہ بھی نہیں تھا وہ شاید صرف اور سیدھی بات کہنے کے عادی ہیں۔ اور مجھے جلدی ہی معلوم ہو گیا ان کے یہاں یہ صفلت کیوں پائی جاتی ہیں جب نہوں نے مجھے اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتلایا "میں دراصل ڈپلومیٹ سے زیادہ ایک سپاہی ہوں۔ سپہ گری ہمارا خاندانی پیشہ ہے۔ چار نسلوں سے ہم فوجی زندگی سے وابستہ رہے ہیں۔ اور اب میرا بیٹا پانچویں پشت میں ہے۔ وہ بھی فوج میں ہے۔ میں ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے میں اقوام متحدہ میں اپنے ملک کا سفیر تھا۔ ہندوستان میں پہلی بار آیا ہوں میری تعلیم فوجی کالجوں میں ہوئی ہے۔ ۱۹۵۶ء میں نہر سویز پر جب اسرائیل۔ برطانیہ اور فرانس نے متحدہ حملہ کیا میں مشرقی کمان کا چیف آف اسٹاف تھا۔ میں نے ذاتی طور پر اس جنگ میں حصہ لیا ہے میں فلسطینی امور کا ڈائرکٹر بھی رہ چکا ہوں۔ یو این۔ او میں متحدہ عرب جمہوریہ کے فوجی مشن کا چیف تھا۔ اسکے علاوہ

مختلف فوجی مشنوں سے وابستہ رہا ہوں ۔"

جب ان سے ہندوستانی تاریخ اور کلچر کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا: "میں ہندوستان پہلی بار آیا ہوں اور مجھے آئے ہوئے زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا ہے۔ اس لئے اس سلسلہ میں میرا زیادہ گہرا مطالعہ نہیں ہے ۔"

میرا اگلا سوال ۲۳ جولائی کے انقلاب مصر کے بارے میں تھا۔ میں نے پوچھا: "اس انقلاب سے عوام کی حالت کس حد تک درست ہوئی ؟" اس سوال کے جواب میں انہوں نے فرمایا: "انقلاب سے پہلے مصر میں ایک طرح کا زمینداری نظام تھا۔ زیادہ تر آبادی فلاحین (کسانوں) پر مشتمل تھی۔ وہ بے علمی اور افلاس میں اپنی زندگی گذارتے تھے۔ وہ زمیندار کے رحم و کرم پر تھے۔ ان کی اپنی کوئی زمین نہ تھی۔ انقلاب سے پہلے ان فلاحین کو زمیندار کے ساتھ معاہدہ لکھنا پڑتا تھا۔ ان سے کورے کاغذ پر دستخط کرائے جاتے تھے۔ جب وہ زمیندار کو پیداوار کا مقررہ حصہ نہیں دے پاتے تھے تو عدالت کے ذریعہ ان کی زمین قرق کرالی جاتی تھی۔ اور زمیندار قابض ہو جاتا تھا۔ انقلاب سے پہلے بھی پارلیمنٹ تھی، مگر اس پر بھی زمینداروں کا قبضہ تھا۔ زمیندار جو چاہتا قانون پاس کرا لیتا تھا۔ زمینداروں کا یہ ۵ فیصد طبقہ تھا جو کسانوں اور مزدوروں کی محنت پر عیش کی زندگی گذارتا تھا۔ انقلاب کے بعد اس صورت حال کا خاتمہ ہو گیا۔ اب ہر کسان اپنی زمین کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ مصر میں انقلاب کے بعد ہر شعبہ زندگی میں ترقی ہوئی ہے۔ اب ملک کی دولت سے عوام کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ مصر صنعتی انقلاب کی طرف تیزی سے گامزن ہے۔"

مصر میں مسلم پرسنل لا کے بارے میں سفیر محترم نے فرمایا: "ہم نے کچھ جزئی تبدیلیاں کی ہیں۔ تعدد ازدواج پر پابندی تو نہیں لگائی ہے مگر اسے مشکل ضرور بنا دیا ہے۔ مثلاً اگر ایک باپ کے دو بیٹے ہیں ان میں سے ایک بیٹا اپنی اولاد چھوڑ کر مر جاتا ہے۔ تو اس کو دادا کی جائیداد میں سے حصہ نہیں ملتا ہے۔ اب قانون بنا دیا گیا ہے کہ مرحوم بیٹے کی اولاد بھی دادا کی جائیداد کی حقدار ہوگی۔"

انہوں نے مزید فرمایا: "مصر میں اسلام اور مغربی تہذیب دونوں کے گہرے اثرات ہیں۔ وہاں نائٹ کلب کی زندگی بھی ہے اور مسجدوں میں بھی چہل پہل رہتی ہے۔ بنیادی طور پر مصری مذہبی لوگ ہیں۔"

جب میں نے ان سے اخوان المسلمین کے بارے میں سوال کیا تو وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ کچھ دیر سوچکر بولے، "اخوان المسلمین ایک تشدد پسند جماعت تھی۔ وہ اسلام کی آڑ میں قتل و خونریزی کی تعلیم دیتے تھے۔ اور وہ اسلام سے اس کا جواز پیش کرتے تھے۔ تقدس و تقویٰ اچھی چیزیں ہیں، مگر انہوں نے حکومت کے کاموں میں روڑے اٹکانا شروع کئے وہ شخصی حکومت کو پھر واپس لانا چاہتے تھے۔ اس لئے حکومت نے انپر پابندی لگا دی۔"

محمد امین حلمی اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے جب وہ یہ کہہ رہے تھے تو مجھے صدر ناصر کے ایک انٹرویو کے الفاظ یاد آرہے تھے۔ جب ناصر سے سوال کیا گیا: "کیا آپ عرب اور غیر عرب پر مشتمل ایک وسیع تر اسلامی بلاک میں شامل ہونا پسند کریں گے؟" تو انہوں نے کہا تھا: "میں خود پکا مذہبی آدمی ہوں۔ مگر آپ دیکھیں کہ متحدہ عرب جمہوریہ کے دستور میں کسی بھی مذہب پر زور دینے سے احتراز کیا گیا ہے۔ کیونکہ ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہم عرب پہلے ہیں اور بعد میں کچھ اور۔ ہم محمدؐ اور عیسیٰؑ دونوں پر فخر کرتے ہیں کیونکہ وہ اسی خطہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس طرح عرب عیسائی مغربی ڈھنگ کی قومیت ایک عیسائی بلاک نہیں بنا سکتے اسی طرح مسلمان بھی ایک مسلم بلاک کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ مذہبی دیوانہ پن (FANATICISM) نے جو تباہی مچائی ہے اس سے آپ بھی واقف ہیں اور میں بھی۔ ہمارے یہاں مسلم برادر ہڈ (MUSLIM BROTHERHOOD) (اخوان المسلمین) کی تنظیم تھی جو سامراجیوں کا آلہ کار بن گئی اور

جو مصر میں شخصی حکومت واپس لانا اور اس ملک کو ایک بلاک سے باندھنا چاہتی تھی۔ خدا کی عنایت و مہربانی اور عوام کی مرضی سے ہم نے اس تحریک کو دبا دیا ہے۔ اسی نوعیت کی چیزیں دوسرے ملکوں میں بھی رونما ہو رہی ہیں۔ لیکن ہم دولت عثمانیہ کی شکل میں ایک اسلامی سلطنت کا ذائقہ چکھ چکے ہیں۔"

مجھے حیرانی نہیں ہوئی جب مصر کا ایک ذمہ دار نمائندہ میرے سامنے بیٹھا اپنے ملک کے سربراہ کے خیالات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ سفیر محترم محمد امین حلمی نے مزید کہا۔ "میں مذہب کو ذاتی زندگی کا معاملہ سمجھتا ہوں۔ اس کا تعلق انسان کے دل سے ہے۔ میں اچھا مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ پختہ ہے۔ مگر میں مذہب کو سیاست سے جوڑنے کے حق میں نہیں ہوں۔"

اب میں نے ہز ایکسیلنسی کی توجہ امریکی میگزین لک کے اس شہرہ آفاق انٹرویو کی طرف دلائی جس میں صدر ناصر نے ایک سوال کے جواب میں تسلیم کیا تھا کہ امریکی فوجوں نے پچھلی جون کی جنگ میں اسرائیل کی مدد نہیں کی تھی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کہا۔ "دراصل جنگ کے ابتدائی دور میں تصویر زیادہ صاف نہیں تھی۔ امریکی ہواباز نہر سوئز سے گذرے تھے۔ ان کا جنگی جہاز لبرٹی ہمارے سمندر میں موجود تھا۔ ان سب باتوں نے یہی تاثر دیا کہ امریکی فوجیں اسرائیل کی مدد کر رہی ہیں۔ لیکن جب بعد میں ہم نے امریکی حکومت سے پوچھا تو اس نے انکار کیا۔ ہم نے یقین کر لیا۔ صرف جون کی جنگ کا سوال نہیں ہے۔ امریکہ اور دوسری مغربی طاقتیں اسرائیل کی پشت پناہی پر ہیں اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اسرائیل سرزمین عرب پر سامراجی طاقتوں کی ناجائز اولاد ہے۔"

جون کی عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست کے اسباب پر بولتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "اس شکست کے بہت سے اسباب تھے۔ اس بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے جو اخباروں میں چھپ چکا ہے میں صرف اتنا کہوں گا کہ ہم آخر وقت تک بے خبری میں رہے۔ صدر ناصر نے جونسن سے بات چیت کی۔ زکریا محی الدین کو امریکہ بھیجا گیا۔ روس نے ہمیں اطمینان دلایا۔ مگر حملہ ہوا۔ اڑان سے پہلے ہی ہمارے طیارے تباہ کر دیئے گئے۔ صحرا میں ہوائی چھتری کے بغیر جنگ نہیں لڑی جا سکتی۔ فوج کو کور کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہماری شکست میں ہمارے افسروں کی نااہلی اور باہمی اختلاف کا بھی بڑا دخل ہے۔"

میں نے پوچھا، "کیا وہ دن آئے گا جب عرب اسرائیل کو شکست دے سکیں گے؟" اس سوال پر سفیر موصوف کا چہرہ جوش سے تمتما اٹھا۔ وہ بلند آواز سے بولے۔ "ایک دن وہ ضرور آئے گا۔ اسرائیل سرزمین عرب پر ایک غیر ملکی عنصر ہے۔ وہ اس کی فضاؤں میں پروان نہیں چڑھ سکتا۔ پھر کسی ملک کی تاریخ میں بیس سال زیادہ اہمیت بھی نہیں رکھتے۔ عربوں نے تاریخ کے بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ یہاں یونانی آئے چلے گئے۔ فرانسیسی آئے، انگریز آئے۔ ان سب کا کیا ہوا؟ کیا اب اسرائیل باقی رہ جائے گا؟"

میں اب ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر اسرائیل کی طاقت کا راز کیا ہے۔ کیا وہ اپنے مغربی سامراجی آقاؤں کی پشت پناہی کے بغیر بھی طاقتور بنا رہ سکتا ہے۔ انہوں نے میرے ان سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "اسرائیل کا وجود۔ اس کی تشکیل۔ اس کی فوجی طاقت سب سامراجی طاقتوں کی مرہون منت ہیں۔ اس کی طاقت کا راز بڑی طاقتیں ہیں۔ اور جو کچھ اس نے ترقی کی ہے وہ انہیں کے بل بوتے پر۔ انہیں کے سہارے اس کے حوصلے بڑھتے جا رہے ہیں درحقیقت اسرائیل کو خود بلیک میل کیا جا رہا ہے۔ وہ خود کچھ نہیں ہے۔ اس کو بڑی طاقتوں نے اپنے مقاصد کے لئے آلۂ کار بنایا ہے۔ بڑی طاقتیں عربوں کو ترقی یافتہ نہیں دیکھنا چاہتیں۔"

باقی صفحہ ۲۰۵ پر

سیاہ فام نومسلم

امریکی رہنما کی کہانی

خود اس کی زبانی

الحاج ملک شہباز

تلخیص: سلیم احمد ایم اے

(میلکم ایکس) الحاج ملک شاہباز کچھ ممتاز رہنماؤں کے ساتھ

میلکم ایکس ۱۹۲۵ء میں اماہا (امریکہ) میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ ایک پادری تھا۔ وہ ابھی بچہ ہی تھا کہ اس کے والدین امریکی سفید فام قوم کے ظلم و بربریت کا شکار ہو گئے۔ اپنی تعلیم نامکمل چھوڑ کر وہ نیویارک آیا جہاں اس نے ہارلم میں بیرے کی حیثیت سے نوکری کر لی۔ یہاں پہلی بار وہ گناہوں کی تاریک دنیا سے متعارف ہوا اور اس نے گانجا اور دوسری منشیات کا غیر قانونی کاروبار شروع کر دیا۔ خود بھی کوکین کھانے کا عادی ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے نقب زنی اور ڈاکہ ڈالنا شروع کر دیا۔ وہ نیویارک کا بدنام ترین ڈاکو بن گیا۔ ۱۹۴۶ء میں اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اور دس سال قید باشقت کی سزا کا حکم سنا دیا گیا۔ جب وہ جیل میں تھا تو نیگرو مسلمان لیڈر الیاس محمد سے اس کا رابطہ قائم ہو گیا۔ اسلام کی تعلیم نے اس کے خیالات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور وہ مسلمان ہو گیا جب جیل

سے باہر آیا تو وہ قطعی بدلا ہوا انسان تھا۔ اس نے امریکہ کے کالے لوگوں میں اسلام کی تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ ۱۹۶۵ء میں اسکو قتل کر دیا گیا۔ الحاج ملک شہباز کے نام سے اس کو دفنایا گیا کیونکہ حج کے مقدس سفر کے بعد اس نے اپنا یہی نام رکھ لیا تھا۔ الحاج ملک شہباز کی خود نوشت سوانح حیات اس کی زندگی کی عبرتناک اور سبق آموز کہانی ہے۔ یہ کتاب امریکہ میں تحریک اسلام کی سچی تصویر ہے۔ اس میں ایمان کی گرمی بھی ہے اور واقعات کی صداقت بھی۔ یہ ایک ایسی داستان ہے جس کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر اسلام کی ہمہ گیریت اور اس کی صداقت وعظمت کا گہرا احساس ہمارے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ میلکم ایکس کی اس دلچسپ خود نوشت کتاب سے تلخیص کی دوسری قسط قارئین ہما کی دلچسپی کے لئے پیش کی جا رہی ہے ——— (ادارہ)

ملک شاہباز نے کعبہ شریف اور دوسرے مقدس مقامات کے فوٹو بھی کھینچے

عرب کے شاہ فیصل کے سرکاری مہمان ہونے کا مجھے شرف حاصل کر لینے کے بعد بہت سی شاہی مراعات و آسانیاں حاصل ہو گئیں۔ ایک سرکاری کار اور گائیڈ شوفر کی خدمات چوبیس گھنٹے مجھے حاصل تھیں۔ شوفر گائیڈ مجھے تمام مقامات کی تاریخ اور اہمیت بتلاتا جاتا تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ جذبات کی کس قدر شدت اور سچائی سے میں نے اس زمین کو بار بار چھوا جس پر نہ جانے کتنے پیغمبروں کے مقدس قدم چل چکے تھے۔ امریکہ کا مسلمان یہ فقرہ لوگوں میں تجسس اور دلچسپی پیدا کرنے کے لئے کافی تھا۔ دنیائے اسلام کے رسم و رواج سے اب میں مانوس ہو چلا تھا۔ اب میں ایک ہی پلیٹ سے بے تکلفانہ کھانا کھاتا تھا جس گلاس

سے دوسرے مسلمان بھائی پانی پیتے تھے میں بھی اسی گلاس سے
پینے لگا۔ ایک ہی لوٹے سے منہ ہاتھ دھوتا۔ اور کھلے میدان میں
چٹائی پر سات آٹھ مسلمان بھائیوں کے ساتھ سوتا تھا۔ مسلمان
حاجی بھائیوں کے درمیان لیٹے ہوئے میں نیلے آسمان پر نگاہیں
جمائے سوچا کرتا۔ ایک ہی چٹائی پر امیر و غریب، شاہ و فقیر، کالے
اور گورے سبھی سو رہے ہیں۔ وہ سبھی ایک ہی زبان میں خراٹے
لے رہے ہیں۔

مقدس سرزمین پر میں نے دیکھا کہ ٹھنڈے شربت کی
لاکھوں بوتلیں روزانہ استعمال ہو جاتی ہیں۔ عرب سگریٹ کثرت
سے پیتے ہیں یہاں تک کہ حج کے موقع پر بھی وہ سگریٹ پیتے
رہتے ہیں۔ رسول خدا محمد صلعم کے زمانہ میں تمباکو نوشی کا رواج
نہیں ہوا تھا۔ ورنہ اس پر بھی ضرور پابندی لگادی گئی ہوتی۔
مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تاریخ کا سب سے بڑا حج تھا۔ ترکی
پارلیمنٹ کے قاسم گلگ پاشا نے بڑے فخر سے مجھے بتلایا کہ صرف
ترکی سے پچاس ہزار حاجیوں پر مشتمل چھ سو بسیں حج کیلئے آئی
ہیں۔ میں نے ان کو بتلایا کہ میں اس دن کا انتظار کر رہا ہوں
جب امریکہ سے مسلمانوں کے جہاز بھر کر حج کے لئے آیا کریں گے۔
جہاں کہیں بھی میں گیا مجھ سے ہزاروں سوالات امریکہ کی نسلی
امتیاز کی پالیسی کے بارے میں پوچھے گئے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ
صرف ایک یہی پہلو امریکہ کو دنیا کی نظروں میں کس قدر بدنام
کئے ہوئے ہے۔ میں نے بھی ہر جگہ امریکہ کے سیاہ فاموں کی حالت
کے بارے میں لوگوں کو بتلایا۔ ترجمان کے ذریعہ میں نے اپنے
مشن کی تبلیغ کی۔ میں یروشلم کے مفتی اعظم امین الحسینی سے ملا۔
عرفات کی پہاڑیوں پر ترکی کے قاسم گلگ پاشا سے میرا تعارف ہوا۔
میں نے شریف مکہ شیخ عبداللہ عارف سے بھی بات چیت کی۔
تیونس کے اسد محمد اور ان کے ساتھی احمد ہوریالا نے "امریکہ کا
مسلمان" کے نام سے ایک فلم بنائی۔ جدہ کے پیلیس ہوٹل میں
مختلف ملکوں کی اہم شخصیتوں سے ملنے کا موقع ملا۔ ایک سوڈانی
نے یہ کہتے ہوئے مجھے گلے لگالیا: "تم امریکہ میں کالوں کے کاز
کے لئے لڑ رہے ہو۔" ایک ہندوستانی افسر تو امریکہ میں سیاہ فاموں
کی حالت زار سنکر رو پڑا۔

اس مقدس سرزمین اور افریقہ کے سفر میں مجھے پہلی
بار اندازہ ہوا کہ امریکہ کی سیاہ فام تنظیموں اور ان کے لیڈروں
کی سب سے بڑی غلطی کیا ہے۔ امریکہ کے سیاہ فام لیڈروں کو
امریکہ سے باہر افریقہ اور ایشیا کے ممالک سے اپنا رابطہ قائم
کرنا چاہئے۔ انہیں دور دراز ممالک کا سفر کرنا چاہئے۔ اور اپنے
ذہن اور معلومات کو وسیع بنانا چاہئے۔

آخر مجھے وہ عزت بھی حاصل ہو گئی جس کے لئے میں خدا
سے دعا کر رہا تھا۔ مجھے ہز مجسٹی شاہ فیصل نے اپنے محل میں مدعو
کیا۔ جیسے ہی میں کمرہ میں داخل ہوا۔ دراز قد، خوبصورت شاہ
نے اپنی میز سے اٹھ کر میرا استقبال کیا۔ وہ شاندار لمحہ میں کبھی
فراموش نہیں کر سکتا۔ میرے سامنے دنیا کی ایک عظیم ترین شخصیت
کھڑی تھی۔ اپنے پورے شاہانہ دبدبہ و وقار کے ساتھ۔ مگر کس قدر
انکساری، سادگی اور خلوص لئے ہوئے۔ انہوں نے مجھے اپنے
سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہمارے ترجمان ایک
مصری عرب ڈپٹی چیف آف پروٹوکول محمد عبدالعزیز تھے۔ انکا رنگ
ایک امریکی نیگرو جیسا تھا۔ میں نے لڑکھڑاتی زبان میں شاہ کی
مہربانیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہا۔ مگر انہوں نے قطع کلام کرتے
ہوئے فرمایا: "یہ صرف ایک مسلمان نے اپنے دوسرے مسلمان بھائی
کا فرض میزبانی ادا کیا ہے۔ اور پھر آپ تو امریکہ سے آئے ہوئے
ایک غیر معمولی مسلمان ہیں۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ انہوں نے
میرے لئے جو کچھ کیا ہے بخوشی کیا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی غرض اور
مطلب نہیں ہے۔ جب ہم باتوں میں مصروف تھے تو ایک خادم نے
میز پر دو طرح کی چائے لاکر چن دی۔ شاہ فیصل نے امریکی سیاہ فام

مسلمانوں کے بارے میں مصری ادیبوں کے لکھے ہوئے مضامین پڑھ رکھے تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کہا، "جو کچھ ان ادیبوں نے امریکی اسلام کے بارے میں لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکی سیاہ فام اسلام کا صحیح تصور نہیں رکھتے ہیں۔" میں نے شاہ کو اپنی خدمات کے سلسلہ میں بتلایا اور کہا کہ میں حج کے لئے اسلام کا صحیح نظریہ جاننے کی غرض سے ہی آیا ہوں۔ اس پر انہوں نے خوشی کا اظہار کیا اور کہا: "انگریزی زبان میں اسلام پر کافی لٹریچر موجود ہے۔ اس لئے ناواقفیت کا عذر نہیں چل سکتا۔ اور خلوص سے ماننے والوں کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ غلط راستوں پر پڑ جائیں۔"

اپریل کی آخری تاریخ کو جب میں مقدس سرزمین چھوڑ کر لبنان کے دارالخلافہ بیروت کے لئے روانہ ہوا تو اس پاک سرزمین کی بہت سی یادیں میرے ساتھ تھیں۔ اور یہ یادیں ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گی۔ بیروت میں مجھے امریکن یونیورسٹی آف بیروت کے طلباء کو خطاب کرنا تھا۔ بیروت کی سڑکوں پر لبنانی خواتین کی عریانی میری توجہ کا مرکز بن گئی۔ مقدس سرزمین میں عورتیں کس قدر سادگی اور انکساری کے ساتھ رہتی ہیں۔ مگر یہاں اس کے برعکس معاملہ تھا۔ میں نے یہاں کی عورتوں پر یورپی کلچر کی چھاپ دیکھی۔ کسی بھی ملک کی اخلاقی حالت کا اندازہ کرنا ہو تو وہاں کی عورتوں کے لباس اور اخلاق سے اندازہ کر لو۔ جہاں کہیں بھی روحانی قدروں کا فقدان ہوتا ہے وہاں کی عورتیں اس کا آئینہ ہوتی ہیں۔ امریکی عورتوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان کو دیکھ کر امریکی تہذیب کے دیوالیہ پن کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ بیشک جہاں مادی ترقی اور روحانی قدروں میں توازن قائم ہے وہی جگہ اس دنیا میں جنت ہے۔

میں نے بیروت یونیورسٹی کے طلباء کو خطاب کیا۔ انہیں امریکی سفید فام طلباء بھی تھے۔ انہیں میری سچی باتیں ناگوار گذریں

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ امریکی اخباروں نے میری بیروت والی تقریر کو توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ انہوں نے لکھا کہ میری تقریر سے بیروت میں نسلی فسادات بھڑک اٹھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کوئی انسان جس کا ضمیر ذرا بھی بیدار ہے۔ ایسی غلط بیانی کیسے کر سکتا ہے۔ بیروت سے میں قاہرہ کے لئے روانہ ہوا۔ اور قاہرہ سے نائیجیریا پہونچا۔ لاگوس میں میری ملاقات ابادان یونیورسٹی کے پروفیسر سے ہوئی۔ وہ میرے امریکہ کے دوست تھے۔ انہوں نے میرے اعزاز میں عشائیہ کا انتظام کیا۔ ابادان یونیورسٹی کے ممتاز پروفیسر صاحبان اور بہت سے طالب علم یہاں موجود تھے۔ مجھ سے بہت سے سوالات کئے گئے۔ میں نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ افریقہ کی آزاد قوموں کو چاہئے کہ وہ ایفرو امریکی (نیگرو مسئلہ) معاملہ کو یو این۔ او میں لیجائیں جسطرح امریکہ کے یہودی تمام دنیا کے دوسرے یہودیوں کیساتھ معاشی، سماجی اور سیاسی رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں اسی طرح ایفرو امریکن دنیا کے دوسرے افریقیوں کیساتھ اتحاد کی زنجیر میں بندھ جائیں ہم نیگرو جسمانی طور پر امریکہ میں رہتے ہیں مگر ہماری منزل ہے کہ ہم واپس افریقہ کی سرزمین پر آئیں اور اپنے بھائیوں کے ساتھ ملکر پان افریقی رشتہ میں بندھ جائیں۔ بعد میں جب میں طلباء کی یونین میں مدعو کیا گیا تو ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا۔ ایک طالب علم اٹھا اس نے مجھ پر اور امریکی نیگروؤں پر حملے شروع کر دیئے طلباء میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ خاموش رہو۔ خاموش۔ شرم شرم کی آوازیں بلند ہوئیں۔ اور بہت سے طلباء اس نوجوان پر ٹوٹ پڑے۔ وہ ہال سے نکل کر بھاگا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس نوجوان نے کسی سفید فام لڑکی سے شادی کی تھی۔ اور وہ کسی امریکی فرم میں اچھی ملازمت کے لئے امیدوار تھا۔ تب میری سمجھ میں آیا بیچارے نوجوان کی پریشانی کیا تھی؟ نائیجیریا میں میں نے کئی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگرام دیئے۔

گھانا کے دارالخلافہ عکرہ میں میرا شاندار استقبال ہوا۔

الحاج ملک شاہباز ــــــــــــــ اور نسلی جھگڑوں کا ایک منظر

گھانا ایک خوبصورت اور قدرتی وسائل سے مالا مال ملک ہے۔ یہاں بہت سے سفید فام لوگ بھی رہتے ہیں۔ پہلے وہ یہاں کے حکمراں تھے اب وہ یہاں کے قدرتی وسائل اور دولت کو سمیٹنے آئے ہیں۔ ہوٹل میں میرے قیام کے تمام مصارف گھانا پریس نے اٹھائے۔ گھانا کی سیاحت کے دوران میں نے محسوس کیا، کاش ہر امریکی سیاہ فام میری آنکھوں سے دیکھ سکتا۔ میرے کانوں سے سن سکتا اور میرے جذبات سے محسوس کر سکتا۔ تب اسے معلوم ہوتا کہ گھانا میں امریکی سیاہ فام بھائیوں کا کس قدر احترام ہے۔

میں نے یہاں بہت سی پریس کانفرنسوں کو خطاب کیا۔ گھانا کی پارلیمنٹ میں مدعو کیا گیا۔ اور گھانا کے وزیر اعظم نکرومہ سے ملاقات کی۔ یہاں افریقی اور ایشیائی ملکوں کے سفراء نے میرا بڑا اعزاز کیا۔ چین کے سفیر نے میرے اعزاز میں ڈنر کا انتظام کیا۔ الجیریا کے سفیر کے انقلابی نظریات نے مجھے بہت متاثر کیا۔ سفیر کیوبا کے یہاں دی گئی پارٹی کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ گھانا کی میلکم ایکس کمیٹی نے میری سیاحت کے تمام انتظامات کئے تھے۔ مجھے گھانا یونیورسٹی نے اعزازی ڈگری عطا کی۔ ان تمام خوبصورت

(میلکم ایکس) الحاج ملک شاہباز ایک پوسٹر کے ساتھ گوروں کے خلاف مظاہرہ کرتے ہوئے

یادوں کو لئے میں عکرہ سے روانہ ہوا۔ امریکہ پہونچنے سے پہلے میں لائبریا۔ سینیگال۔ اور مراکش بھی گیا۔

آخر کار ۲۱ مئی کو سوا چار بجے پین امریکن جیٹ مجھے لیکر نیویارک کے کینیڈی ایئرپورٹ پر اترا۔ کسٹم سے باہر آتے ہی پچاس ساٹھ نامہ نگاروں اور فوٹوگرافروں نے میرا استقبال کیا۔ مگر وہ ایک "ولین" سے ملنے آئے تھے ہیرو سے نہیں۔ میرے امریکہ کی سرزمین پر اترتے ہی اخباروں اور رسالوں میں مضمون پر مضمون چھپنے شروع ہوئے۔ ان مضمونوں میں مجھے تشدد اور بغاوت کا علمبردار کہا گیا تھا۔ ایک بہت بڑی کانفرنس ہوئی جس میں ہر لمحہ کیمرہ بلب چمک رہے تھے۔ سوالوں کی بوچھار تھی "مسٹر ایکس ان خونی بھائیوں" (BLOOD BROTHERS) کے بارے میں بتلایئے جن کو آپ خونریزی پر آمادہ کرتے ہیں" "مسٹر ایکس آپ نے جو مشورہ دیا ہے کہ نیگروؤں کو مسلح کلب بنانے چاہئیں۔ اس کے بارے میں آپ کا خیال ہے؟" "آپ کیوں سفید فام لوگوں کی جان کے دشمن ہیں؟"

میں نے تمام سوالوں کے جواب دیئے۔ میں جانتا تھا کہ

میں امریکہ واپس آگیا ہوں۔ یہ سفید فام لوگوں کے سوالات تھے جو ہر بہانے کے لئے مجھے قربانی کا بکرا بنانا چاہتے تھے نیویارک کے سفید فام دن رات معصوم اور بے گناہ نیگروؤں پر ظلم کرتے ہیں۔ اس کے لئے کہا جاتا ہے یہ سماجی مسئلہ ہے۔ جب کسی نیگرو کو قتل کر دیا جاتا ہے تو کہتے ہیں "حالات جلد ہی بہتر ہو جائینگے" اگر کسی طرح کسی سفید فام کی موت ہو جاتی ہے تو ان کے لئے کسی کالے کی تلاش ہوتی ہے تاکہ اسے پھانسی پر چڑھایا جا سکے۔ جب سفید فام اپنے گھروں پر بندوقیں رکھتے ہیں تو دستور نے ان کو اپنی حفاظت کا حق دیا ہے۔ لیکن جب سیاہ فام اسلحہ کی بات کرتا ہے تو اسے خطرناک علامت سمجھا جاتا ہے میں نے پریس کانفرنس کو بتلایا: "امریکی سیاہ فام کو چاہئے کہ وہ اس طرز فکر کو چھوڑے جو اسے گوروں نے سکھایا ہے۔ گوروں کا فلسفہ یہ ہے کہ سیاہ فام قدرتی طور پر غلام ہیں اور ان کو غلام رہنا چاہئے امریکی نیگرو کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ امریکہ کو یو۔ این۔ او کے کٹہرے میں کھڑا کرے۔ یہ ان کا جائز اور مضبوط کیس ہے! انگولا اور جنوبی افریقہ کا معاملہ جب یو۔ این۔ او میں پیش ہو سکتا ہے۔ تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ امریکہ اس ظلم و بربریت کے لئے جوابدہی سے بچا رہے" میں نے اس کانفرنس میں بڑی طویل تقریر کی۔ اپنے سفر کے تاثرات بتائے اور مختلف سوالوں کے جوابات دیئے۔ اس روز تمام رات میرے ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی رہی مختلف شہروں کے میرے مسلمان بھائی اور بہنیں مجھے ان بیانات کے لئے مبارکباد دے رہے تھے جو انہوں نے ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر سنے تھے۔

اگلے دن میں اپنی کار میں جا رہا تھا۔ ریڈ لائٹ پر میری کار رک گئی۔ ایک دوسری کار میرے برابر آکر رکی۔ اس میں ایک سفید فام بیٹھا تھا "مسٹر میلکم ایکس" اس نے مجھے مخاطب کیا۔ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے کار سے مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا مسکراتے ہوئے بولا: "کیا آپ ایک سفید فام سے ہاتھ ملانا پسند کریں گے؟" ذرا تصور کیجئے! جونہی ہری بتی ہو گئی۔ میں نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا: "میں انسانوں سے ہاتھ ملانا پسند کرتا ہوں۔ کیا آپ انسان ہیں؟"

امریکہ میں اسلامی تحریک۔ دو واقعات امریکی مسلمانوں کی تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ پہلا واقعہ ایک نیگرو صحافی کا امریکی مسلمانوں کے بارے میں ایک فلم بنانے کا ارادہ کرنا کیمرہ مینوں نے نیویارک۔ واشنگٹن اور شکاگو میں ہماری مسجدوں کے قریب سین فلمانا شروع کئے۔ مسٹر محمد کی تقریریں ریکارڈ کی گئیں۔ میری آواز بھی ریکارڈ ہوئی دوسرا اہم واقعہ بوسٹن یونیورسٹی کے ایک نیگرو اسکالر لنکن کا ہے اس نے اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے امریکی مسلمانوں کا موضوع انتخاب کیا۔ اس نوجوان کو امریکی مسلمانوں کے بارے میں مقالہ لکھنے کا خیال اس وقت آیا جب اس نے اپنے ایک طالب علم کے مضمون میں یہ پیراگراف پڑھا: "عیسائی مذہب امریکی نیگروؤں کے وقار اور برابری کی تمنا کو پورا نہیں کرتا ہے۔ بلکہ بجائے ممد و معاون بننے کے رکاوٹ بنتا ہے۔ بجائے صاف گوئی کے پہلو کرتا ہے۔ اس نے اپنے ماننے والوں کو رنگ کی بنیاد پر تقسیم کیا ہوا ہے۔ اگرچہ اس کا اعلان ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی عالمی برادری کے مشن کا علمبردار ہے۔ عیسائیت کا پیغام محبت صرف سفید فام کے اپنے لئے ہے لیکن جو انسان سفید فام نہیں ہے اسلام اس کے لئے مساوات اور انصاف کی شمع ہے۔ وہ ایسی دنیا تعمیر کرتا ہے جس میں کوئی امتیاز نہیں"

ان دونوں واقعات نے امریکی مسلمانوں کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ یہ واقعی بڑی اہم خبریں تھیں۔ امریکی مسلمان اب امید کرنے لگا تھا کہ سفید فام کے بنائے ہوئے ذرائع رسل و رسائل سے وہ اسلام کو ترقی دے گا۔ اور سفید فام شیطان کے

خلاف اس مشین کو استعمال کرے گا۔ میں نے اخباروں کے ذریعہ اسلام کے پیغام کو دوسرے نیگرو بھائیوں تک پہونچایا۔ میں کئی سال تک امریکہ کے کئی اخباروں میں اسلام اور نیشن آف اسلام کے بارے میں لکھتا رہا۔ پھر میں نے خود اپنا اخبار نکالنا شروع کیا۔ میں نے اس اخبار کا نام "محمد کا پیغام" رکھا۔ اس طرح اسلام کی تبلیغ کا کام تیزی سے بڑھنے لگا۔

۱۹۵۹ء کے آخر میں فلم کو ٹیلی ویژن پر دکھلایا گیا۔ اس فلم کا نام "نفرت جس نے نفرت پیدا کی" رکھا گیا تھا۔ گوروں کے لئے یہ فلم زبردست ذہنی کوفت تھی۔ بڑی خوبصورتی سے اس فلم کو فلمایا گیا تھا۔ اس میں مساجد کے مناظر تھے۔ کالے لوگوں کو مسجدوں میں عبادت کرتے۔ دفتروں میں کام کرتے۔ لیڈروں کو تقریر کرتے۔ مسلمان عورتوں کو گھروں میں کام کرتے دکھلایا گیا تھا۔ اس فلم کے خلاف گوروں کا ردعمل بڑا سخت تھا۔ ان کے اخباروں میں اس کے خلاف پروپیگنڈہ کیا گیا۔ گوروں کی یہ نفسیات بن چکی ہے کہ وہ اپنے خلاف تنقید برداشت نہیں کر سکتا۔ دور غلامی سے ہی امریکی سفید فام کی یہ پالیسی رہی ہے کہ وہ چند کالوں کو اپنا آلۂ کار بناتا ہے۔ یہ مٹھی بھر نیگرو اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں ان کی حالت عام نیگروؤں سے کچھ بہتر ہوتی ہے۔ کیونکہ سفید فام اپنی میز سے روٹی کے کچھ زائد ٹکڑے ان کے سامنے پھینک دیتا ہے۔ اس لئے نیگرو کا یہ غلام طبقہ سفید فاموں کی شان میں ہمیشہ قصیدے پڑھتا رہا ہے۔ اور سفید فام انہیں ہمارے خلاف استعمال کرتے رہتے ہیں"۔ کسی طرح بھی یہ کالے مسلمان نیگرو عوام کی نمائندگی نہیں کرتے ہیں"۔ یہ غلام اپنے آقا کو یقین دہانی کراتا رہتا ہے۔

یہ دور بڑا ہنگامی گذرا۔ میرے گھر کے فون کی گھنٹی ہر وقت بجتی رہتی تھی۔ میں اور میری بیٹی جواب دیتے دیتے تھک جاتے تھے۔ ان تمام کالوں کا رخ میری طرف ہوتا تھا۔ نیویارک پریس کا بڑا مرکز ہے اور میں ـــــ نیویارک میں الیاس محمد کے نائب کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ ٹیلیفون کالیں دور دراز شہروں یہاں تک کہ لندن۔ اسٹاک ہوم اور پیرس تک سے آتی تھیں۔ ان میں مجھے گالیوں سے نوازا جاتا تھا۔ مجھ سے سوالات پوچھے جاتے تھے میں بھی جواب میں آگ اگلتا تھا: "ہم نفرت کی تعلیم کیوں دیتے ہیں؟ اگر سفید فام کالے سے پوچھتا ہے کہ کیا وہ اس سے نفرت کرتا ہے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے زنا بالجبر کرنے والا اس مظلوم و مجبور عورت سے پوچھے، کیا تم مجھ سے نفرت کرتی ہو؟۔ بھیڑیا بھیڑ سے پوچھے "کیا تم مجھ سے نفرت کرتی ہو"؟۔ سفید فام اخلاقی طور پر یہ سوال پوچھنے کا مجاز نہیں ہے۔ میرے آباؤ اجداد سانپ کے کاٹے ہوئے ہیں۔ میں بھی سانپ کا ڈسا ہوا ہوں۔ اگر آج میں اپنی آئندہ نسلوں کو سانپ سے ہوشیار کرتا ہوں تو مجھے نفرت پھیلانے کا مجرم گردانا جاتا ہے"۔ مجھ سے سوال پوچھا جاتا ہے؟ "مسٹر ایکس مسلمان، نوجوانوں کو کریٹ اور جوڈو جیسے دفاعی کھیلوں کی تربیت کیوں دی جاتی ہے؟" سفید فام مسلمانوں کی تربیت سے خوفزدہ ہو اٹھتا ہے۔ جب کالا آدمی جوڈو سیکھتا ہے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ سفید فام اسکولوں کے بچے جوڈو سیکھتے ہیں تو کوئی بات نہیں ہے۔ تمام اسکولوں میں کھیل عام ہیں۔ جب تک سفید فام اسے سیکھتے ہیں۔ بہت اچھا ہے۔ خوب ہے لیکن یہی کھیل جب سیاہ فام سیکھتا ہے تو خطرہ ہے۔ تشدد اور دہشت ہے۔ ہم پر شورش پسند اور فتنہ پرور ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ تاریخ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ یونان میں سقراط کو اسی شورش پسندی کے الزام میں زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ حضرت عیسیٰ کو صلیب پر چڑھا دیا گیا۔ گاندھی جی کے بارے میں کیا کہا جائے گا۔ وہ آدمی جسے چرچل نے "ننگے فقیر" کا نام دیا تھا۔ برطانوی جیل میں اس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ مگر پورا برصغیر اس کے پیچھے تھا۔ گیلیلیو کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہ آخر وقت تک یہی کہتا رہا "زمین بیشک گردش کرتی ہے"۔ آج جو اسلام کے نام لیوا ہیں۔ ان کے ساتھ بھی وہی

ملک شاہباز (میلکم ایکس) ایک عربی اسکول میں عربی کی تعلیم حاصل کررہے ہیں

برتاؤ ہو رہا ہے۔

ہماری ماس ریلیز (MASS RALLIES) ابتدا سے ہی بڑی کامیاب رہی ہیں۔ ملک کے دور دراز حصوں سے نیگرو ان ریلیز میں شامل ہونے کے لئے آتے ہیں۔ مسٹر محمد اپنے ذاتی جیٹ ہوائی جہاز سے آکر ان جلسے جلوسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ ہوائی اڈے سے ریلی ہال تک پولیس کی حفاظت میں ان کی پارٹی چلتی ہے۔ امریکہ نے اس سے پہلے کبھی کالے لوگوں کے ایسے شاندار جلسے نہیں دیکھے تھے۔ دس پندرہ ہزار سیاہ فاموں کے یہ اجتماع دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان جلسوں میں سفید فاموں کو داخلہ کی اجازت نہیں ہوتی۔ ہماری مسلمان بہنیں جلسہ ہال میں داخل ہونے والوں کی اچھی طرح تلاشی لیتی ہیں۔ سگریٹ پینے پر بھی پابندی ہوتی ہے۔ ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے۔ ان سے آگے سفید لباس میں ملبوس مسلمان بہنیں سیٹوں پر بیٹھتی ہیں۔ ان نیگروؤں کو بھی ..رعو کیا جاتا جو ہمارے خلاف بولتے ہیں۔ ایک طرف نیگرو پریس کے نمائندوں اور فوٹوگرافروں کی فوج ہوتی ہے۔ اسٹیج پر ایک بڑی کرسی کے پیچھے ہم نائبوں کی کرسیاں ہوتیں۔ بڑی کرسی مسٹر ایلیاس محمد کے لئے مخصوص ہوتی۔ ہم اپنی کرسیوں پر بیٹھے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو السلام علیکم و علیکم السلام کرتے۔ مسٹر محمد کے

امریکہ کی
مسلمان بہنیں
جو
امریکہ جیسی
عریاں سوسائٹی
میں
عزت نفس
پاکیزگی اور
شرافت کا
اعلیٰ معیار
قائم کئے
ہوئے ہیں

ہال میں داخل ہوتے ہی مکمل خاموشی چھا جاتی۔ ایسے ہی ایک جلسہ میں مسٹر محمد نے شرکت کی۔

جب وہ ہال میں داخل ہوئے تو قرآن انکے ہاتھ میں تھا السلام علیکم سے لوگوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ وہ اسٹیج پر بیٹھے اسلام کے خصوصی عہدہ داروں سے بغلگیر ہوئے۔ انہیں دیکھ کر بہت سوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں تو آنسو ضبط نہ کر سکا میں ایک سزا یافتہ مجرم تھا۔ انہوں نے مجھے گناہ آلود زندگی سے نجات دلائی تھی۔ مجھے انہوں نے اپنے گھر میں اپنے بچہ کی طرح تربیت دی تھی۔ اس جلسہ میں پہلے بہن فاطمہ نے ان کاموں پر روشنی ڈالی جو نیشن آف اسلام کے لئے بہنوں نے کئے تھے۔ اس کے بعد میں نے اسلام کا تعارف کرایا۔ اور پھر مسٹر الیاس محمد جلسہ کو خطاب کرنے کھڑے ہوئے۔

"السلامُ علیکم" انہوں نے سامعین کو مخاطب کیا۔ پورا ہال وعلیکم السلام کی شیریں آواز سے گونج اٹھا۔ مجمع پر سناٹا چھا گیا محمد کے الفاظ ایک دو دھاری تلوار کی طرح اپنا کام کرنے لگے۔

"آپ میں سے بہت سوں کی طرح میں کالج کی کوئی ڈگری نہیں رکھتا ہوں لیکن تاریخ ڈگریوں کی کوئی پروا نہیں کرتی ہے۔ بچپن سے سفید فاموں نے تمہارے دلوں میں خوف جا گزیں

کر رکھا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا دشمن خوف ہوتا ہے۔ آپ میں سے زیادہ تر سچائی کو سنتے ہوئے ڈرتے ہیں کیونکہ آپ کی پرورش ہی خوف و ہراس میں ہوئی ہے، تمہارا آقا جو تمہیں یہاں لایا تھا اس نے تمہارے ماضی کو تم سے چھین لیا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ تم کس قبیلہ اور کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ تم اپنے ابتدائی اور سچے کلچر کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ تمہیں جو کچھ سفید فام نے دے دیا ہے بس تم وہی جانتے ہو۔ سفید فام جو تمہارا آقا ہے تم سمجھتے ہو کہ عیسائی مذہب دنیا کا سب سے سچا مذہب ہے۔ یہ تمہاری جہالت کی انتہا ہے۔ تمہیں تمہارے سفید فام آقا نے جو سکھا دیا ہے بس تم اسی کو سچائی جانتے ہو۔ اور اس نے تمہیں وہی بتلایا ہے جو صرف اس کے مفاد میں ہے۔ اس نے تمہیں بتلایا کہ تم مجبور رہو بس مطعون نیگرو رہو۔ اگرچہ تم نیگرو نہیں ہو۔ یہ نام سفید فام نے تم پر ٹھونسا ہے۔ تم اس ایشیائی قوم کی نسل سے ہو جس کو شہباز کہا جاتا تھا؟

جب محمد ذرا خاموش ہوئے تو پورا ہال اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا۔ تم نے سفید فام کی زمینوں میں ہل چلایا ہے تم نے اس کا کھانا بنایا ہے۔ اس کے کپڑے دھوئے ہیں۔ اس کے بیوی بچوں کی دیکھ بھال کی ہے بعض حالات میں تم نے انہیں اپنی چھاتیوں سے دودھ بھی پلایا ہے۔ تم ان سے زیادہ بہتر عیسائی ہو۔ تم نے اس ملک کو دنیا کا ترقی یافتہ اور امیر ترین ملک بنانے میں اپنا خون پسینہ بہایا ہے۔ اور یہ ملک آج اپنے دشمنوں تک کو کروڑوں ڈالر تقسیم کر دیتا ہے۔ مگر ہماری کمائی سے ہمیں ہی کچھ نہیں ملتا اس لئے ہم کالے لوگوں کو اس سفید فام آقا سے علیحدہ ہو جانا چاہئے تم یکجہتی کی بات کرتے ہو۔ امریکہ میں یکجہتی ممکن نہیں ہے۔ اسلئے میں کہتا ہوں کہ ہمیں علیحدہ ہو جانا چاہئے۔ سفید فام کو ہمیں علیحدہ ریاست دے دینی چاہئے تاکہ ہم اپنے طریقہ سے دینداری اور امن کی زندگی گذار سکیں۔ جہاں ہم اپنی فصلیں خود اگا سکیں۔ اپنے کارخانے خود چلا سکیں۔ اپنی ضروریات کے خود کفیل ہو سکیں ہم ایک آزاد اور مہذب قوم کی زندگی گذارنا چاہتے ہیں۔ ہم ایک آزاد اور خود مختار کالے لوگوں کی ریاست کا مطالبہ کرتے ہیں؟

الیاس محمد تقریباً دو گھنٹہ تک بولتے رہے۔ اس کے بعد میں نے سامعین سے چندے کی اپیل کی۔ ہماری بہنیں مہربند ڈبے لئے گھومنے لگیں۔ ڈبے ڈالروں سے بھر گئے۔ دوسرے ڈبے منگائے گئے۔ اور وہ پھر بھی پوری طرح چندے کے ڈالروں سے پُر ہو گئے۔ الیاس محمد کی تقریر نے امریکہ کے وہائٹ ہاؤس کے ایوانوں میں تہلکہ مچا دیا۔ میں اس رات لیٹا ہوا سوچتا رہا اور حیران ہوتا رہا کہ وہ کیا چیز ہے جس نے حکومت کی اتنی بڑی مشین کو ختم کر دیا۔ خدا کی اعانت و نصرت کے علاوہ کوئی دوسری چیز میری سمجھ میں نہیں آئی۔

اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ سفید فام آقا کچھ کالے لوگوں کو روپیہ پیسہ کا لالچ دیکر ہماری جاسوسی کے لئے بھیجتے ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر جب ہمارے درمیان آکر ہماری زندگیوں کو دیکھتے ہیں تو وہ سب کچھ صاف صاف بتلا دیتے ہیں اور مسلمان ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ الٹے سفید فاموں کی جاسوسی کرنے لگتے ہیں۔ عام طور پر سزا یافتہ مجرم زیادہ اچھے نومسلم ثابت ہوتے ہیں جیل سے نکلکر وہ اپنی پوری زندگی اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دیتے ہیں عیسائی بننے کے مقابلہ میں مسلمان بننا اتنا آسان نہیں ہے۔ وہ عیسائی بن جاتے ہیں مگر اپنی گناہ آلود زندگی جاری رکھتے ہیں مسلمان بننے کے لئے جسمانی اور اخلاقی اعتبار سے اپنے کو پوری طرح تیار کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے سخت اصول و ضوابط ہیں جن کی پیروی ضروری ہے مسلمان بننے کے بعد ایک نیگرو کی پوری زندگی بدل جاتی ہے۔ اس کے اندر خود اعتمادی اور خود شناسی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی نگاہوں میں بلند ہو جاتا ہے۔

ہم سگریٹ نوشی کے خلاف ہیں۔ کوئی بھی مسلمان سگریٹ

شہنشاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب، ملکہ فرح دیبا، محترمہ اندرا گاندھی اور نائب وزیر اعظم جناب مرارجی ڈیسائی پالم ہوائی اڈہ پر۔ ایک ملاقات ایک یادگار

چہل پہل نظر آنے لگی تھی۔ سڑکوں پر چلتے بسوں اور کاروں میں سفر کرتے احساس ہونے لگا تھا کہ ہندوستان کے دارالخلافہ میں کوئی اہم تقریب ہونے والی ہے۔

اعلیٰ حضرتین کی آمد سے چند روز پہلے ہی دلی میں عمارتوں اور چوراہوں پر رضا شاہ۔ ملکہ فرح اور ولیعہد کی بڑی بڑی تصویریں آویزاں کردی گئی۔ اخباروں میں ایران کے بارے میں مضامین شائع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ پارلیمنٹ اسٹریٹ پر پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے شہنشاہ اور شاہ بانو کی قد آدم تصویریں اس طرح لگائی گئیں تھیں کہ آپ کسی سمت سے بھی آئیں یہ تصویریں آپ کی طرف مسکراتی ہوئی نظر آتی تھیں دو دن پہلے ایران اور ہندوستان کے جھنڈے سڑکوں پر ساتھ ساتھ لہرانے لگے تھے۔ راشٹرپتی بھون میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بارات آنے والی ہے اور اس کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ہمارے راشٹرپتی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین نے شاہی مہمانوں کے رہائشی کمروں کو ایران سے ماہرین آرائش بلا کر خاص طور پر اعلیٰ حضرتین کے ذوق و پسند کو پیش نظر رکھتے ہوئے آراستہ کرایا تھا ان کے کھانوں کا مینو تیار کیا جا رہا تھا۔ ان کے پسندیدہ

پالم هوائی اڈہ پر استقبالیہ شامیانے کے نیچے جوابی تقریر — سامنے ملکہ فرح اور صدر جمہوریہ بیٹھے ہوئے نظر آرہے ہیں

پرآرام سے بیٹھنے کے لئے کہا گیا۔ اور پھر ان کی روداد سنی گئی۔ حضرت یو۔پی کے کسی گاؤں سے اسی وقت تشریف لارہے تھے کسی اسکول میں ٹیچر تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے اور اپنے فارسی شعروں کا مجموعہ شاہ ایران کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ ظاہر ہے وہ شہنشاہ ایران سے نہیں مل سکتے تھے۔ اور وہ نہ جانے کتنے روپیے خرچ کرکے اور وقت ضائع کرکے یہاں تک اسی مقصد کے لئے پہنچے تھے بشہنشاہ اور شاہ بانو کا پروگرام واقعی اس قدر مصروف تھا کہ اس میں فرصت کے چند منٹ تلاش کرنا فضول تھا۔ مجھے معلوم ہوا

کئی ایک ممتاز مرکزی وزیر شاہ سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ ان کو بھی ملاقات کی سعادت نصیب نہ ہوسکی۔

۲ رجنوری کی دوپہر واقعی بڑی حسین دوپہر تھی۔ پالم ہوائی اڈے پر بڑی رونق تھی ہوائی اڈہ دلہن کی طرح سجا ہوا تھا رن وے پر سرخ قالین کی پٹی بچھائی گئی تھی جو ایک چھوٹے سے خوبصورت اسٹیج تک پھیلی ہوئی تھی جہاز آنے سے چند منٹ پہلے راشٹرپتی ذاکر حسین مسز اندرا گاندھی کابینہ کے دوسرے وزرا، ایم پیز، غیرملکی سفرا نیز دوسری معزز و ممتاز شخصیتیں۔ پریس کے نمائندے اور فوٹو گرافرس

ہوائی اڈے پر موجود تھے یہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہر چہار
طرف حسن ہی حسن بکھرا ہوا تھا۔ دلوں میں جوش تھا خوشی تھی۔ آخر
کیوں نہ ہو۔ ایک قدیم ملک کا شہنشاہ اپنی خوبصورت ملکہ کے ساتھ
تشریف لا رہا تھا ایک ایسے ملک کا شہنشاہ جو تہذیبی ۔ مذہبی اور
سیاسی طور پر ہندوستان کے بہت قریب رہا ہے مقررہ وقت کے
چند منٹ بعد جیٹ ہوائی جہاز رن وے پر اترا۔ سب سے پہلے
شہنشاہ مسکراتے ہوئے دروازہ پر نمودار ہوئے اور ان کے بعد ان
کی ملکہ باہر آئیں اور ان کی ٹیم کے دوسرے لوگ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین
نے بڑھ کر شاہ سے مصافحہ کیا اب مسز اندرا گاندھی آگے بڑھ رہی ہیں
انہوں نے بڑھ کر ملکہ عالیہ سے ہاتھ ملایا پھولوں کے ہاروں سے دونوں
کی گردنیں بھر گئیں۔ کیمروں کے بلب کی روشنی سے نگاہیں چکا چوند
ہو رہی تھیں۔ ہند و ایران کی عظیم شخصیتوں کا یہ دلکش قافلہ اسٹیج کی
طرف بڑھا۔ گارڈ آف آنر پیش کیا گیا۔ فوجی باجے نے قومی ترانوں کی
دھنیں بجانی شروع کیں۔ ذاکر حسین نے اپنے معزز مہمانوں کو مختصر
الفاظ میں خوش آمدید کہا اور اس کے بعد شہنشاہ نے مختصر تقریر
کی۔ ہوائی اڈہ پر بچوں، عورتوں اور مردوں کی کافی بڑی تعداد موجود
تھی ان رسمیات کے بعد شہنشاہ راشٹرپتی کے ساتھ کار میں بیٹھے
اور ملکہ مسز اندرا گاندھی کے ساتھ۔ اور اس طرح لوگوں کی تالیوں اور
نعروں کے درمیان شاہی مہمان راشٹرپتی بھون کے لئے روانہ ہو گئے۔
دلی میں شہنشاہ کے قیام کے دوران بڑی ہماہمی رہی۔
شام کو راشٹرپتی بھون میں شاہ اور ملکہ کے اعزاز میں راشٹرپتی کی طرف
سے ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا اسی دن شاہ نے وزیر اعظم اندرا گاندھی
سے ملاقات کی۔ اگلے دن دلی کے لال قلعہ میں دلی کے شہریوں کی طرف
سے شاہ اور شاہ بانو کے استقبال کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کے بعد
شہنشاہ نے پریس کانفرنس کو خطاب کیا اور اخباری نامہ نگاروں
کے بہت سے سوالات کے جواب دیئے۔
شاہ بانو نے دلی کی تہذیبی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ وہ
جن پتھ پر واقع کاٹیج انڈسٹریز ایمپوریم دیکھنے تشریف لے گئیں یہاں
انہوں نے ہندوستانی دست کاری اور صنعت کے نمونے دیکھے مجھے
شاہی پارٹی کے دلی میں قیام کے دوران جمہوری دور کی اس خوبصورت
اور دراز قد ملکہ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انھیں دیکھ کر میرے
ذہن میں شاہ ایران کے سابقہ ہندوستانی دورہ کی بہت سی یادیں
تازہ ہو گئیں۔ اس دورہ پر سابق ملکہ ثریا شاہ کے ساتھ تھیں اس بات
کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا مگر جب سے حالات کس قدر بدل گئے تھے۔
میرا ذہن دنیا کی دو عظیم اور خوبصورت ترین خواتین کے حسن و دلفریبی
کا موازنہ کر رہا تھا۔ قسمت بھی کیا کیا عجیب دلفریب کھیل کھیلتی ہے۔ مگر
میں نے جلدی ہی اپنے ذہن کو اس الجھن سے آزاد کر لیا۔ فرح دیبا
کی دلنواز شخصیت نے سب کچھ بھول جانے پر مجبور کیا۔ ایران کی یہ خاتون
کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب فرانس کے ایک اسکول میں ایک
معمولی طالبہ کی حیثیت سے زندگی گذارتی تھی۔ وہ فن تعمیر پر ضخیم کتابوں
کا مطالعہ کرتی اور پیرس کے خوبصورت کیفوں میں اپنا دل بہلاتی۔ اس
وقت وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ ایک دن وہ ملکہ ایران بنے گی اس
کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ایران کی سب سے بڑی ماہرہ فن تعمیر بننے
کی تھی۔ ملکہ نے کہا: "درحقیقت میرا دراز قد باسکٹ بال کا مرہون منت
ہے میں کالج میں باسکٹ بال ٹیم کی کپتان تھی۔" وہ پہلی بار شاہ سے پیرس
ہی میں ملی تھی۔ شاہ فرانس کے دورہ پر تھے۔ پیرس میں مقیم ایرانی طلبا
کی ایک پارٹی ان سے ملنے گئی تھی۔ اسی پارٹی میں فرح دیبا بھی تھی جب
یہ خبر پھیلی کہ شاہ ایران نئی ملکہ کی تلاش میں ہیں تو فرح کے ساتھی طالب علم
اس سے مذاق میں کہا کرتے تھے کہ فرح ملکہ ایران بنے گی — یہ مذاق
حقیقت کے سانچوں میں ڈھل گیا۔ فرح کو رسمی طور پر طلب کیا گیا۔ شاہ
کی بہن کے گھر پر یہ ملاقات ہوئی اور شاہ نے فرح کو ملکہ بنانے کی منظوری
دیدی۔ آج اس لڑکی پر ذمہ داریوں کا ایک بڑا بوجھ ہے اسے ملکہ کی
حیثیت سے بہت سے کام کرنے پڑتے ہیں۔ وہ فرانسیسی بہبودی ویلفیئر
فاؤنڈیشن کی سرپرست ہیں جس کے تحت ایران میں چالیس یتیم خانے

دھلی کی سڑکوں پر شاہ کا پر جوش استقبال

چل رہے ہیں اور دوسرے چالیس سے زیادہ اداروں کی صدر ہیں۔

ملکہ نے کہا "یہ صرف میرے لئے عہدے ہی نہیں ہیں جب ایک شخص پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کے ملک نے لئے ہے تو اس کو اپنی پوری صلاحیتوں سے کام کرنا چاہئے"۔

لیکن یہ سب مصروفیات ان کو صنف نازک کے دوسرے کاموں سے نہیں روکتی ہیں۔ وہ اپنے کپڑوں کی وضع قطع اور قسمیں خود ہی منتخب کرتی ہیں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کا زیادہ تر لباس ایرانی کپڑوں سے ہی تیار ہوتا ہے ملکہ نے اپنے خوبصورت ہاتھوں کو فضا میں لہراتے ہوئے کہا "لباس کے معاملہ میں میرا ذوق بہت سادہ ہے۔ یہاں تک کہ میں زیورات پہننا بھی پسند نہیں کرتی۔ میرے پاس زیورات ہیں۔ شاید یہی میرے اطمینان کا باعث ہے اگر میرے پاس زیورات نہ ہوتے تو شاید میرا ردعمل دوسرا ہوتا۔"

ملکہ عالیہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر مزید کہا "ایک ساتھ ملکہ اور ماں ہونا بڑا مشکل کام ہے میں اپنے بچوں کے ساتھ رہنے کی کوشش کرتی ہوں ان کے روزانہ کے پروگرام کو ترتیب دیتی ہوں۔ اور انھیں سلانے کے لئے تیار کرتی ہوں۔ یہ اہم نہیں ہے کہ کتنا وقت بچوں کے ساتھ صرف کیا جاتا ہے بلکہ اہم بات یہ ہے کہ کون سا وقت ان کے ساتھ گذارا جائے" وہ ایک آدرش ماں کی حیثیت سے گفتگو کررہی تھیں۔ ملکہ عالیہ نے تسلیم کیا کہ وہ شاذونادر ہی باورچی خانہ میں تشریف لے جاتی ہیں "مجھے کھانا بنانا نہیں آتا، تاہم یہ میرا قصور نہیں ہے۔ بچپن میں میں نے جب بھی کھانا پکانا چاہا ماں نے مجھے اسکول کا ہوم ورک کرنے کے لئے بھیج دیا"

اپنے شوق کے بارے میں انہوں نے فرمایا "میں اپنا فالتو وقت ٹیپ ریکارڈ سننے، اپنے بچوں کی فوٹو اتارنے اور فرانسیسی کتابیں پڑھنے میں گذارتی ہوں۔ تفریح کے لئے میں پہاڑوں پر اسکائنگ اور گھوڑ سواری پسند کرتی ہوں" دلی کے بارے میں انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا "مجھے دلی کی عمارتیں اور سڑکوں پر لگے بڑے بڑے درخت سب سے زیادہ پسند ہیں"

دلی سے شاہ بانو آگرہ تشریف لے گئیں جہاں انھوں نے تاج کے فن تعمیر کا بڑے غور سے مطالعہ کیا انھوں نے دو گھنٹے تاج کے سایہ میں گذارے خاص طور پر انہوں نے آگرہ کے لال قلعہ کے فن تعمیر کو بہت پسند کیا۔ آگرہ میں ہی انھیں آگرہ یونیورسٹی نے اعزازی ڈگری نذر کی۔ شاہ بانو نے اجنتا اور ایلورہ کے غار بھی دیکھے اور وہ گنجی پورم میں واقع ملک کارخانہ کو بھی دیکھنے گئیں۔

شاہی مہمانوں کی ٹیم کل ۲۳ افراد پر مشتمل تھی جن میں ایران کے وزیر خارجہ اردشیر زاہدی وزیر خزانہ آموزگار بھی شامل تھے ان کے علاوہ بیس افراد پر مشتمل پریس ٹیلی ویژن کے نامہ نگاروں کی ٹیم

ملکۂ ایران شاہی تاج پہنے ہوئے

بھی تھی حکومت ہند کی طرف سے وزیر سیر و سیاحت ڈاکٹر کرن سنگھ منسٹر آف اسٹیٹ کے سی پنت، ڈپٹی منسٹر مسز سعادنور کاش سنگھ کو شاہ کی معیت و رفاقت کیلئے مقرر کیا گیا تھا۔ شاہ بانو کی معیت کا فرض مسز رگھو رمیہ اور مسز پنت انجام دے رہی تھیں۔ شاہ و شاہ بانو نے دہلی کے علاوہ جن شہروں کا دورہ کیا وہ ہیں اودے پور، چتوڑ گڑھ، رانچی، جمشید پور، ناگپور، چندا، حیدر آباد، اجنتا ایلورا، مدراس اور بمبئی۔ حیدر آباد میں عثمانیہ یونیورسٹی نے شاہ کو اعزازی ڈگری پیش کی ــــ مدراس میں انہوں نے ایک تیل کی بھٹی کا افتتاح کیا جو ایران و ہند کے تعاون سے زیر تکمیل ہے۔ چندا کے جنگلوں میں شاہ شکار کھیلنے گئے جہاں انہوں نے دو جنگلی بھینسے اور ایک سانبھر کا شکار کیا۔ دلی کے دوران قیام مسلمان ممتاز رہنماؤں نے شاہ کی خدمت میں ہندی اور اردو میں قرآن کے ترجمہ اور تفسیر پیش کی۔

شاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی کوئی روایتی شخصی حکمران نہیں ہیں۔ اس بات کا پوری طرح اندازہ مجھے ان کے حالیہ دورہ کے درمیان ہوا ــــ پچھلے چند برسوں میں نظریاتی اور عملی اعتبار سے انہوں نے اپنے کو کس قدر بدلا تھا۔ یہ جان کر واقعی میں حیران رہ گیا۔ محمد رضا پہلوی آریا مہر نے دراصل شہنشاہیت یا شخصی حکومت کا مفہوم ہی بدل دیا ہے واقعی بادشاہت کو جو رنگ ــــ روپ انہوں نے دیا ہے۔ اگر اسی کا نام بادشاہت ہے تو وہ موجودہ دور کی بہت سی جمہوریتوں پر بھاری ہے، وہ برائے نام ہی مطلق العنان بادشاہ ہیں، ان کے کام اور ان کی مصروفیات کسی بھی جمہوری ملک کے وزیر اعظم یا صدر سے کم نہیں ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ برطانیہ کے عوام کی طرح کہ جو تخت و تاج سے والہانہ محبت کرتے ہیں، شاہ ایران کے سلسلہ میں بھی کچھ ایسی ہی بات ہے۔ وہاں کے عوام کے دلوں میں ایرانی شاہی خاندان سے شیفتگی کی جڑیں بہت گہری ہیں وہ اپنے شاہ شاہ

ایرانی خواتین قالین بنتے ہوئے

بازاور شاہی روایات سے بے پناہ لگاؤ رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ایران میں آج بھی شخصی حکومت مضبوطی سے قائم ہے۔

ایران میں شہنشاہ کی مضبوطی اور پائیداری کا راز محمد رضا شاہ کی ذاتی شخصیت ہے اور اس راز کا انکشاف مجھے ان کے دورۂ ہند کے دوران ان کے خیالات جان کر ہوا۔ میں ہند و پاک تعلقات پر ان کے یہ الفاظ فراموش نہیں کر سکتا۔ "میں دنیا کا سب سے زیادہ خوش نصیب آدمی ہونگا اگر ان دونوں ملکوں کی کوئی خدمت کر سکوں" ————— انہوں نے اس سلسلہ میں مزید کہا "مگر میرا تعاون دو شرطوں پر منحصر ہے مجھ سے دونوں ملک پیش کش کریں۔ اور مجھے اس بات کا بھی یقین ہونا چاہئے کہ میرا پیش کردہ حل کے منظور کئے جانے کا بھی امکان۔ کشمیر کے جھگڑے سے متعلق ایک سوال کے جواب میں شہنشاہ نے فرمایا تھا کہ "پاکستان میرا دینی بھائی ہے — اور — ہندوستان میرا دوست" میں نہیں چاہتا کہ یہ دونوں ہمسائے باہم جنگ کریں۔ انہیں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی تجاویز کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل ڈھونڈنا چاہئے۔ ہمیں کوئی شک نہیں کہ شاہ ایران ہند و پاکستان کو ایک دوسرے کو قریب لانے میں نمایاں رول ادا کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حکومت ہند نے ان کی خواہش کو سراہا ہے اور پاکستان سے دوستانہ تعلقات کی پیش کش بھی کردی ہے شاہ ایران کا یہ دورہ اس لئے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ آرسی ڈی (علاقائی باہمی تعاون و ترقی کی کونسل جو ایران ترکی اور پاکستان پر مشتمل ہے) کی میٹنگ سے یہاں تشریف لائے تھے انہوں نے اس سلسلہ میں کہا "ایشیا میں باہمی تعاون و ترقی کے آرسی ڈی جیسے ادارے ہونے چاہئیں۔ ہندوستان اس تنظیم میں جب چاہے شامل ہو سکتا ہے"

ہند و پاک تعلقات کے بارے میں انہوں نے کہا "ایشیا میں امن و آشتی کام کے لئے ہند و پاکستان کے درمیان دوستی اور باہمی تعلق ہونا بہت ضروری ہے" انہوں نے کشمیر کا کوئی واضح حل پیش کرنے سے گریز کیا۔ بہرحال انہوں نے کہا "مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ کی تجاویز کی روشنی میں حاصل کیا جا سکتا ہے" شاہ نے اس بات پر بھی زور دیا کہ پاکستان و ترکی سے ایران کی دوستی کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ کسی دوسرے ملک کے ساتھ دوستی نہیں کر سکتے ہماری دوستی کی بنیاد ہمارے اپنے قومی مفاد پر ہے"

شاہ نے ہند و ایران کے درمیان باہمی اقتصادی و تکنیکی معاونت اور رشتوں کے بے شمار امکانات پر زور دیا۔ انہوں نے کہا "ایران اپنی پٹرو کیمیکل اشیاء سپلائی کر کے ہندوستان کی مدد کر سکتا ہے اور ہندوستان فولاد اور انجینئرنگ صنعتوں میں ایران کا ہاتھ بٹا سکتا ہے"

ایک بین الاقوامی نوعیت کا مسئلہ خلیج فارس یا بحرین کا تھا اس جزیرہ سے ۱۹۷۱ء تک برطانیہ اپنی فوجیں واپس بلائے گا — جغرافیائی۔ اقتصادی۔ سیاسی۔ تہذیبی اور تاریخی اعتبار سے یہ خطہ ایران کا ایک حصہ ہے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں کہا "یہ بات قطعی صاف ہے کہ ایران طاقت کے ذریعہ بحرین کو حاصل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے۔ اگرچہ اپنی جگہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ یہ خطہ ایران کا ہے جسے ڈیڑھ سو سال پہلے برطانیہ نے اس سے چھین لیا تھا۔"

عرب اسرائیل تنازعہ پر شاہ نے فرمایا "اس مسئلہ کا الفوری ایشیائی حل ممکن نظر نہیں آتا ہے۔ میں ۲۲ر نومبر ۱۹۶۷ء کی یو این او سیکیورٹی کونسل کی تجویز کا حامی۔ مگر کسی بھی تجویز یا حل کو صرف چار بڑی طاقتیں ہی عملی جامہ پہنا سکتی ہیں کیونکہ یہی بڑی طاقتیں فریقین کو اسلحہ فراہم کر کے زندہ رکھے ہوئے ہیں"

ایک سوال کے جواب میں ہز میجسٹی نے فرمایا "سینٹو کبھی کا اپنی فوجی اہمیت کھو چکا ہے۔ باوجود چیکوسلواکیہ میں روس کی مداخلت کے سینٹو کی وہی حیثیت رہے گی۔

شاہ نے چین کے بارے میں سوالات کے سلسلہ میں بڑا

محتاط رویہ اپنایا۔ چین کی پاکستان دوستی اور چین کی فوجی طاقت کے ایشیائی خطرہ پر بولتے ہوئے شاہ نے فرمایا: "دراصل یہ بات ہندوستان کے خود فیصلہ کرنے کی ہے۔ ایران چین کے ساتھ کوئی تعلقات نہیں رکھتا ہے، مگر سرخ چین کی یو این او میں موجودگی تخفیف اسلحہ کے لئے ضروری ہے۔"

روس کے ساتھ اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا "روس کے ساتھ پچھلے دنوں میں ایران کے تعلقات کافی خوشگوار ہوئے ہیں۔ ہمارے تعلقات ہمارے پڑوسی ملکوں سے بہت اچھے ہوگئے ہیں۔ ہم دونوں ملکوں نے اپنا سرحدی تنازعہ بالکل حل کرلیا ہے۔ روس نے ایران میں انجینئرنگ صنعتیں اور فولادی کارخانے کھولنے کا وعدہ کیا ہے اس کے بدلے میں ہم اس کو گیس سپلائی کریں گے۔ اس مقصد کے لئے روس اور ایران کے درمیان پانچسو ملین ڈالر کی قیمت سے پائپ لائن بچھائی جارہی ہے۔

شاہ سے سوال کیا گیا "کیا سینٹو کی وجہ سے ایران اور روس کی دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا؟" اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا "یہ تعلقات باہمی احترام پر قائم ہیں ہم ان سے نہیں پوچھتے کہ وہ وارسا پیکٹ میں کیا کرتے ہیں۔ پھر وہ ہم سے کیوں پوچھیں گے۔"

ایران کی اقتصادی ترقی کے سلسلہ میں انہوں نے بولتے ہوئے کہا "پچھلے چار برسوں میں گیارہ فیصد قومی ترقی ہوئی ہے جب کہ ہمارے معیار زندگی کی قیمت میں ایک فیصد سالانہ بھی اضافہ نہیں ہوا ہے۔"

ہند و پاک تعلقات پر انہوں نے مزید فرمایا "ایک عرصہ سے میں اپنے ہندوستانی اور پاکستانی دوستوں سے کہتا آیا ہوں کہ واقعی یہ بات بڑے افسوس کی ہے کہ آپ آپس میں لڑائی کرتے ہیں۔ آپ کے جھگڑوں کا پرامن تصفیہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اس خطہ میں امن کی ضمانت بن سکتا ہے۔"

آرسی ڈی (ترکی ایران و پاکستان کی اقتصادی تنظیم)

ایران کے ولی عہد شہزادہ رضا شاہ پہلوی

میں کشمیر کے متعلق تجویز پاس کی گئی تھی اس تجویز کے بارے میں شاہ نے فرمایا! ہم نے وہاں بھی وہی کہا ہے جو اس سے پہلے کہتے آئے ہیں۔ ہم نے کشمیر کے سلسلہ میں یو این او تجویز کی حمایت کی تھی اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں پر منحصر ہے کہ وہ اپنے مسائل کا حل تاشقند معاہدہ کی روشنی میں کریں یا اقوام متحدہ کی تجویزوں کی بنیاد پر۔ آخر کار آپ اور کشمیری اہل معاملہ ہیں۔ میری تو صرف اس قدر خواہش ہے کہ دونوں ملک جو میرے دوست ہیں باہمی لڑائی جھگڑوں کو چھوڑ کر دوسرے کاموں کی طرف توجہ دیں!

عرب اسرائیل تنازعہ پر انہوں نے مزید خیالات کا اظہار کیا: "میرا خیال ہے ڈاکٹر جارنگ کو ذرا اور سخت جدوجہد کرنی چاہئے۔ اگر یہ کوشش ناکام ہوجاتی ہے تو صرف چار بڑوں کی کانفرنس ہی واحد حل رہجاتا ہے کیونکہ کسی بھی حل یا معاہدہ کو یہ چار طاقتیں ہی عملی جامہ پہنانے کی طاقت رکھتی ہیں۔"

آخر میں شاہ ایران نے ہندوستانی پریس کی آزادی اور اس کے ذمہ دارانہ رول کی تعریف کی۔ شاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی اور ایران کی ملکہ شاہ بانو فرح اپنا بارہ روزہ دورہ مکمل کرکے ۱۲ر جنوری کو اپنے وطن ایران واپس لوٹ گئے۔

میں نے جنرل رومیل کو کس طرح شکست دی

فیلڈ مارشل منٹگمری کے قلم سے

[illegible]

۱۰ مئی ۱۹۴۰ء کو جب جرمنی نے مغربی یورپ پر حملہ کیا رومیل ساتویں پینزر ڈویژن کی کمان کر رہا تھا اور میں تیسرے برطانوی ڈویژن کی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اس کا نام نہیں سنا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ اس کے لیے بھی میں بالکل اجنبی ہی تھا۔ حالانکہ ہم دونوں ہی میجر جنرل تھے۔ مگر جب ہٹلر کی جنگ بڑھی اور وسیع ہو کر عالمی جنگ کی شکل اختیار کر گئی تو دونوں میجر جنرلوں کی قسمتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئیں اور واقعات نے ایسا رخ اختیار کر لیا کہ ہم دونوں کا مقابلہ ایک طرح ذاتی مقابلہ بن گیا۔ اس کی ابتدا افریقہ میں ۱۹۴۲ء میں ہوئی اور اختتام نارمنڈی میں ۱۹۴۴ء میں ہوا۔ میری اکثر یہ خواہش رہی کہ میں اپنے اس مشہور حریف سے ملوں، اس سے گفتگو کروں، مگر میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ میں آپ کو اپنے مقابلے کی کہانی سناؤں گا مگر اس سے پہلے میں رومیل کی شخصیت، کردار اور زندگی کے بارے میں چند دلچسپ باتیں بتاتا چلوں۔ وہ کس قسم کا آدمی تھا؟ یہ سوال بڑا اہم ہے، اس لیے کہ سپہ گری میں شخصیت بڑے معنی رکھتی ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہم دونوں کو ایک ہی راستے پر طویل سفر طے کرنا پڑا۔ وہ مجھ سے عمر میں چار برس چھوٹا تھا مگر

ہم دونوں کی پیدائش نومبر میں ہوئی تھی۔ وہ پندرہ نومبر ۱۸۹۱ء کو پیدا ہوا تھا اور میں ۱۷ نومبر ۱۸۸۷ء کو۔ نہ اس کے خاندان کی کوئی فوجی روایت تھی نہ میرے خاندان کی۔ بچپن میں وہ بڑا سست اور کاہل تھا اور اسکول میں پیچھے رہ گیا تھا۔ تقریباً یہی میرا اپنا حال تھا۔ وہ ۲۱ برس کی عمر میں فوج میں داخل ہوا تھا اور میں نے بھی اسی عمر میں اپنی فوجی زندگی کی ابتدا کی۔ ہم دونوں نے پہلی جنگ عظیم میں حصہ لیا اور دونوں ہی زخمی ہوئے۔

ہم دونوں کی شادی ہوئی اور ۱۹۲۸ء میں وہ بھی ایک لڑکے کا باپ بنا اور میں بھی۔ میری طرح وہ بھی شراب سے بہت کم رغبت رکھتا تھا۔ دونوں ہی سگریٹ نوشی کے خلاف تھے۔ اور کھانے پینے کے معاملہ میں لاپروا۔ وہ بھی ۱۹۳۷ء میں کرنل اور ۱۹۳۹ء میں میجر جنرل بنا اور میں بھی۔ ۱۹۳۷ء میں اس نے فوجی تربیت سے متعلق ایک کتاب لکھی اور میں نے بھی یہی کیا۔ جنرل اسپائڈل نے جو نارمنڈی میں رومیل کے چیف آف اسٹاف تھے اور بعد میں "نیٹو" میں میرے ہمراہ ملازم تھے، مجھے بتایا کہ فوج اور جنگ سے متعلق شاید ہی کوئی کتاب ہوگی جو رومیل نے نہیں پڑھی۔ بہرحال اپنے بارے میں میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔

بریگیڈیر ڈیسمونڈ ینگ نے ۱۹۵۰ء میں رومیل پر ایک اعلیٰ کتاب لکھی ہے۔ وہ رومیل سے اس زمانے میں ملے تھے جب جرمن فوج نے ۱۹۴۲ء میں انہیں افریقہ میں گرفتار کر لیا تھا۔ جنگ کے بعد ان کی ملاقات رومیل کے خاندان کے کئی افراد سے ہوئی اور وہ بیشتر ایسے افسروں کو ذاتی طور پر جانتے ہیں جنہوں نے رومیل کے ساتھ کام کیا تھا۔ ان سے پتہ چلا کہ رومیل معاشرتی زندگی سے دور دور رہتا اور تنہائی کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ مگر اپنے کام میں بلا کی مہارت رکھتا تھا اور خاصا ذہین اور تجربہ کار تھا۔ بریگیڈیر ینگ لکھتے ہیں کہ

"جب جنگ شروع ہو جائے تو رومیل میدانِ جنگ میں پہاڑ بن کر ڈٹ جاتا تھا۔ بہادری اور عزم میں بے مثال تھا اور اسے دیکھ کر فوج کے باقی افسر اور جوانوں میں کافی جوش و خروش پیدا ہو جاتا تھا۔"

مئی ۱۹۴۰ء میں جب رومیل برطانوی فوج کے خلاف اپنی ساتویں پینزر ڈویژن لے کر چلا تو اس کی جیب میں ایک ڈائری ہوا کرتی تھی جس پر وہ روز کی روداد باقاعدگی سے لکھتا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں جب ہٹلر نے اس کی موت کا حکم سنایا تو اس سے پہلے ہی یہ ڈائری اس کے خاندان والوں نے محفوظ کر لی تھی۔ ۱۹۵۳ء میں لندن کے ایک ناشر نے "دستاویزات رومیل" کے نام سے یہ ڈائری شائع کر دی ہے۔ میں نے بھی ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۸ء میں "نیٹو" کی ملازمت سے الگ ہونے کے بعد تک اسی طرح روزانہ کی ڈائری لکھی ہے۔

میں نے العلمین کے محاذ پر برطانیہ کی آٹھویں ڈویژن کی کمان ۱۳ اگست ۱۹۴۲ء کو سنبھالی۔ ۱۹۴۰ء میں ڈنکرک کے مقام پر برطانیہ کی شکست کے بعد میں انگلستان میں ہی مامور کر دیا گیا تھا اور ۱۹۴۱ء میں پہلی بار مجھے رومیل نامی جرمن جنرل کی افریقہ میں موجودگی کی خبر ملی۔ رومیل کے مقابلے پر کوئی بھی برطانوی جنرل نہ ٹھہر سکا تھا اور صحرا میں ہر جگہ جرمنوں کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ جب میں صحرا میں پہنچا تو معلوم ہوا ہماری فوج کے ہر آدمی کے لیے رومیل ہوّا بنا ہوا تھا۔ سب پر اس کا خوف طاری تھا مگر اس کے باوجود ہر کوئی اس کی سپہ گری اور کمان کی تعریفیں کر رہا تھا۔ کہانیاں مشہور تھیں کہ جن انگریز فوجیوں کو قید کیا جاتا تھا رومیل کے حکم سے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے میرے ذہن میں رومیل کا جو تصور قائم ہوا یہ تھا کہ میں اس کی عزت کروں مگر میں نے سب پر یہ واضح کر دینے کا فیصلہ کیا کہ میں رومیل

سے ہرگز خوفزدہ نہیں ہوں اور محاذ پر پہنچنے کے پہلے دن ہی میں نے اپنے تمام افسروں اور جوانوں کو یکجا کر کے انہیں یقین دلایا کہ اگر ہم پورے جوش و خروش اور لگن سے مقابلہ کریں تو کوئی عجب نہیں کہ چند دنوں میں ہی جنرل رومیل کو شکست فاش دیں۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ تھوڑے ہی عرصے میں جنرل رومیل کو صحرا سے مار بھگاؤں گا۔

اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھوں آپ یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ ہر جنگ میں ہار جیت کا تعلق بنیادی طور سے جنرل کی اپنی قابلیت اور اہلیت پر ہوتا ہے۔ رومیل کو شکست دینے کے لیے مجھے سب سے پہلے یہ اندازہ کرنا پڑا کہ وہ کس قسم کا جنرل تھا اور جنگ کے کون سے طریقوں پر عمل کرتا تھا۔ یہ بات عیاں تھی کہ وہ پیدائشی قائد تھا اور جنگ میں انسانوں کی اہمیت سے پوری طرح واقف تھا اس نے اس انداز میں اپنے سپاہیوں اور افسروں سے تعلقات قائم کر رکھے تھے کہ ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ وہ اس کا دوست ہے۔ ہر شخص اس کے لیے اپنے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کے لیے آمادہ تھا چنانچہ اسے فتح پر فتح حاصل ہو رہی تھی۔ وہ ہر اعتبار سے کامیاب سپاہی تھا نپولین نے کہا تھا کہ "سب سے بڑا جنرل وہ ہے جو کم سے کم غلطیاں کرتا ہے"۔ لیڈل ہرٹ نے اس بات کو ذرا اور جامع انداز بیان کیا ہے کہ "سب سے بڑا جنرل وہ ہے جو اپنے حریفوں کو زیادہ سے زیادہ غلطیاں کرنے پر مجبور کر دے" اور واقعی رومیل نے یہی کیا تھا۔ برطانوی جنرل اس کے مقابلے میں آ کر غلطیوں پر غلطیاں کیے جا رہے تھے چنانچہ شکست پر شکست کھا رہے تھے۔ میں نے فوج کی کمان سنبھالتے ہی فیصلہ کر لیا کہ اب یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے۔ اکثر ایسا ہوا تھا کہ رومیل جنگ چھوڑ کر اپنی فوج سمیت پیچھے ہٹ جانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ برطانوی جنرل یہی سمجھتے تھے کہ انہوں نے رومیل کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ یہ رومیل کی چال تھی۔ اس چال میں آ کر برطانوی فوج کو کافی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ میں اب رومیل کے ساتھ اس انداز کی جنگ لڑنا چاہتا تھا جس کا اسے پہلے کبھی تجربہ نہ ہوا ہو۔ اب میں اسے غلطیاں کرنے پر مجبور کر دینا چاہتا تھا اور اس طرح اسے شکست فاش سے ہمکنار کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ مجھے اس بات کا خدشہ نہیں تھا کہ جب تک میں اپنی فوج پوری طرح تیار کر دوں وہ میدان جنگ سے پیچھے ہٹ جائے گا اور اس طرح میری فوج میں عدم توازن پیدا کر دے گا۔ ہٹلر اسے کسی صورت میں بھی اپنی جگہ سے پیچھے ہٹنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے اپنی اور اس کی فوج کے درمیان ابتدائی معرکوں کی تیاری کی اور فوراً موقع بھی ہاتھ آ گیا۔

ہمیں اپنے جاسوسوں سے یہی خبر ملی تھی کہ اب رومیل آخری بار زور لگا کر قاہرہ کی طرف پیش قدمی کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے وہ صحرائی جنگ کے اس پرانے اصول پر عمل کرتا۔ کہ پہلے خشکی پر اس کی فوجیں حملہ کریں اور پھر تیزی سے شمال کی طرف سمندر کی راستے سے آگے بڑھتیں پہلے بھی یہی ہوا تھا کہ جب رومیل کے بکتر بند دستوں نے برطانوی مورچوں پر حملہ کیا تو برطانوی دستے دفاعی جنگ میں مصروف ہو گئے بری طرح ہارے۔ اب بھی یہی توقع تھی کہ پہلے اس کی فوج کے بکتر بند دستے براہ راست برطانوی مورچوں پر پل پڑیں گے اور دوسری طرف فوج ساحل کے کنارے پیش قدمی کرتی رہے گی۔ مگر میں نے ان دونوں محاذوں پر اس کا بھرپور مقابلہ کرنے کی تیاری کر لی تھی۔ ۳۱ اگست ۱۹۴۲ء کو اس کی پینزر ڈویژن نے ہمارے جنوبی مورچوں پر حملہ کیا اور فوراً شمال میں ام حلفا کی طرف پیش قدمی کرنے لگی۔ جو العلمین کے محاذ پر ہماری فوج کا مرکز تھا۔ میں نے اپنی فوجوں کو حکم دیا کہ وہ ہرگز آگے نہ بڑھیں بلکہ اپنے مورچوں پر ڈٹی رہیں

کمانڈر نے اپنی فوج کو مورچوں پر قائم رکھ کر انتہائی سود مند حکمت عملی کا مظاہرہ کیا ہے ہمارا حملہ اور پیش قدمی بے کار ثابت ہوئی اور ہماری فوج کو کافی نقصان اٹھانا پڑا جب کہ برطانوی فوج کی حیثیت اسی طرح مضبوط رہی۔"

اس کے بعد رومیل نے براہِ راست الم حلفا پر حملہ کیا مگر وہاں بھی اسے ہزیمت اٹھانی پڑی۔ میں چاہتا تو تھا کہ اس کی مراجعت کرتی ہوئی فوج پر حملہ کر دوں مگر میں نے مزید چند دن اور تیاریوں میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی ۸ ویں برطانوی فوج میں بھرپور حملہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ رومیل کے بارے میں یہ بات طے تھی کہ وہ اپنے حریفوں کی خامیوں کو فوراً بھانپ لیتا تھا اور اگر اسے برطانوی فوج کی موجودہ حالت کا پوری طرح علم ہو جاتا تو کسی صورت میں بھی بخشنے کے لیے تیار نہ ہوتا الم حلفا کے محاذ پر ناکامی سے وہ اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ آٹھویں برطانوی ڈویژن پہلے سے زیادہ طاقت ور بن گئی ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ بہر حال میرے لیے یہ مسئلہ تھا کہ میں رومیل پر حملہ کس محاذ پر کروں۔ رومیل کی فوج شمال میں سمندر کے ساحل سے مغرب میں قطرہ جھیل تک پھیلی ہوئی تھی رومیل کو توقع تھی کہ میں اس پر بیک وقت شمال اور جنوب دونوں طرف سے حملہ کروں گا۔ مگر میں نے اس کی بجائے درمیان سے حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنایا۔ منصوبے کے مطابق ہماری فوجیں درمیان سے جرمن محاذ کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی مغرب کی طرف بڑھ جائیں۔

رومیل اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ ادھر میں نے اپنی فوج کے تمام افسروں اور جوانوں کو پورے منصوبے سے آگاہ کر دیا تھا۔ اور یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ ہمیں کم از کم بارہ دن تک گھمسان کی جنگ لڑنی پڑے گی تب کہیں جا کر ہم اپنے مقصد میں کامیاب

فیلڈ مارشل منٹگمری

اور رومیل کو مورچوں کے اندر گھس آنے دیں۔ اس بار برطانوی فوج کے نئے اندازِ جنگ نے رومیل کو الجھا دیا۔ اسے توقع تھی کہ برطانوی فوج آگے بڑھ کر اس کی فوج کا مقابلہ کرے گی۔ اور اس طرح کافی نقصان اٹھائے گی۔ مگر ایسا نہ ہوا برطانوی فوج کے دستے اپنے مورچوں سے ہلے بھی نہیں۔ یہ چیز رومیل کے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔ چنانچہ اس کی فوج واپس ہونے لگی۔ ہم پھر بھی مورچوں پر ڈٹے رہے اور ان کا پیچھا نہ کیا۔

جنگ کے دوران رومیل نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ "نیا برطانوی کمانڈر، جنرل منٹگمری انتہائی چالاک اور محتاط آدمی معلوم ہوتا ہے۔ جو ذرا سا بھی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

جنگ کے چند دن بعد اسے میری حکمت عملی پر غور کرنے کا موقع ملا تو اس نے ڈائری میں لکھا کہ "اس میں شک نہیں کہ برطانوی

کامران ہو سکیں گے۔ چنانچہ ۵ نومبر کو ۹ ویں ڈویژن نے اچانک
جرمن محاذ کے عین وسط میں حملہ کر دیا۔ اور آگے بڑھنے لگی۔
رومیل نے سارا زور شمال اور جنوب کی طرف لگایا ہوا تھا اسلئے
جب تک کہ وہ اپنے محاذ کو درمیان سے ٹوٹنے سے بچا سکتا ہم کافی
آگے بڑھ گئے اور جرمن بڑی تیزی سے پیچھے ہٹ جانے پر مجبور ہو گئے
اس دوران رائل ایئر فورس کے بمباروں نے شمال اور جنوب
میں جرمن مورچوں پر کامیاب بمباری کا سلسلہ شروع کر دیا تھا
اور پھر ایک موقع یہ آیا کہ شمال اور جنوب دونوں حصوں میں جرمن
فوج کو تین سمت سے ہماری فوجوں نے گھیر لیا تھا۔ میرا یہ حملہ
رومیل کی شدید شکست کا باعث ہوا۔ اور جرمن فوج کافی
جانی و مالی نقصان اٹھا کر صحرا سے کوچ کر جانے پر مجبور ہو گئی۔
جنرل رومیل میرے ہاتھوں ہار گیا تھا۔

رومیل سے میرا دوسرا مقابلہ نارمنڈی کے محاذ پر ہوا،
اتحادیوں کا فیصلہ تھا کہ ۶ جون ۱۹۴۴ء کو نارمنڈی پر برطانیہ
اور امریکہ کی فوجیں حملہ آور ہوں۔ اور راستے میں جرمن فوجوں کا
مقابلہ کرتے ہوئے برلن کی طرف بڑھیں۔ یہ کام اتنا آسان نہ
تھا۔ ہٹلر کو اس حملہ کی خبر تھی۔ اور اس نے فیلڈ مارشل رومیل
کو نارمنڈی کے محاذ پر مامور کر دیا تھا۔ رومیل نے جس انداز میں
۱۲ ویں ڈویژن سے وہاں مورچہ بندی کی تھی۔ اس کے
پیش نظر اتحادی بری افواج کا نارمنڈی کے ساحل پر اترنا
تقریباً ناممکن ہی معلوم ہوتا تھا۔ بہرحال اتحادی بری افواج کی
کمان جنرل آئزن نے میرے ذمہ کی اور مجھے حکم دیا کہ جونہی ہماری
فوجیں ساحل پر اتریں ہم رومیل سے ہر محاذ پر آمنے سامنے
جنگ شروع کر دیں۔ ۶ جون کو اتحادی بری فوجیں نارمنڈی
کے ساحل پر اتر گئیں۔ مگر میں نے آئزن ہاور کی ہدایت پر عمل
کرنے میں کوئی دانشمندی نہیں سمجھی اور ہر محاذ پر رومیل کا
مقابلہ کرنے کی بجائے اسے دھوکہ دینے کا منصوبہ بنایا۔ میں نے

میں نے آئزن ہاور کی ہدایت پر عمل کرنے میں کوئی دانشمندی نہ سمجھی۔ اور ہر محاذ پر رومیل کا مقابلہ کرنے کی بجائے اسے دھوکہ دینے کا منصوبہ بنایا۔ شمال اور جنوب میں ہماری فوجیں جرمنوں کا مقابلہ کرتی رہیں اور درمیان سے ہم تیزی سے آگے بڑھتے گئے۔ میں نے یہاں بھی العلمین والے محاذ کی چال چلی تھی۔ رومیل پھر میرے جھانسے میں آگیا اور زبردست شکست سے دوچار ہوا۔

برطانوی ڈویژن کے کئی بریگیڈ کو شمال میں رومیل کی ۱۱ ویں
پینزر ڈویژن کیطرف سے مقابلہ کرنے کیلئے مامور کر دیا اور جنوب میں امریکی ڈویژن کو
پیش قدمی کا رومیل نے میرا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی ڈویژن کو دو حصوں
میں تقسیم کر کے شمال اور جنوب کے محاذوں پر لگا دیا۔ اس اثنا
میں میں نے برطانوی ڈویژن کے باقی ڈویژنوں اور امریکی فوج
کے دو ڈویژنوں کو درمیان سے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

شمال اور جنوب میں ہماری فوجیں جرمنوں کا مقابلہ
کرتی رہیں۔ اور درمیان سے ہم تیزی سے آگے بڑھتے گئے میں
نے یہاں بھی العلمین والے محاذ کی چال چلی تھی۔ رومیل پھر میرے
جھانسے میں آگیا اور زبردست شکست سے دوچار ہوا۔

جولائی ۱۹۴۴ء میں ہمارے ایک بمبار نے رومیل
کی کار کو نشانہ بنایا اور وہ بری طرح زخمی ہوا اور ہسپتال میں
زیر علاج رہا۔ اسی دوران ہٹلر نے اسے اپنے خلاف ایک سازش
کے الزام میں گرفتار کر لیا اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۴ء کو جیل خانے
میں اسے زہر دیدیا گیا۔ کاش وہ زندہ رہتا اور جنگ کے بعد میں
اس سے ملاقات کر سکتا۔ بہرحال وہ ایک بڑا جنرل اور ماہر
سپاہی تھا۔

+++

غالب نیر

امریکہ کی اندھی اور بہری دیوی

ایم
این
خان

جو اس صدی کا معجزہ تصور کی جاتی ہے

۱۸۸۰ء کے ماہ جون کے چھبیس دن گذر چکے تھے
یہ ستائیسواں دن تھا۔ یوں تو روزانہ ہی دنیا بھر میں ہزاروں بچے
پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اس دن بھی پیدا ہوئے ہونگے ان میں سے
ہی امریکہ کی ریاست الباما کے شہر ٹسکمبیا (TUSCUMBIA)
کے ایک متمول "کیلر" گھرانے میں پیدا ہونے والی بڑی بڑی آنکھوں
والی خوبصورت بچی بھی تھی۔ جو آگے چل کر دنیا کی عظیم ترین شخصیت
بنی۔ اس کے والدین نے اپنی بچی کا نام رکھا "ہیلن"
ہیلن کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہونے لگی اس کی

راج گھاٹ پر پھول چڑھاتے ہوئے
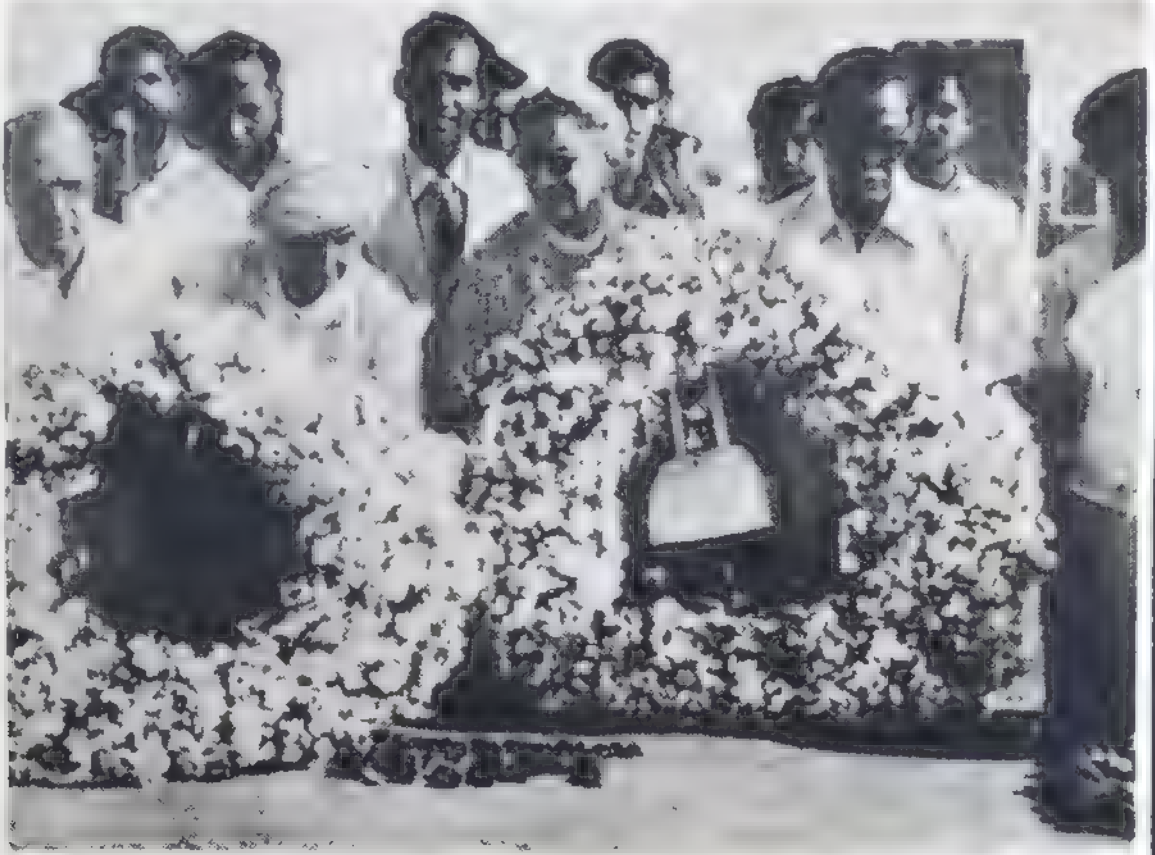
صحت بہت اچھی تھی۔ ڈیڑھ سال کی عمر میں وہ تین سال کی معلوم ہونے لگی جو دیکھتا کہتا:

"ہیلن بے کیسی تندرست بچی ہو تو ایسی ہو۔"

"آنکھیں تو دیکھو کیسی بڑی بڑی ہیں۔"

اور پھر جیسے ہی اس نے انیسویں ماہ میں قدم رکھا قدرت کو ایک عجیب و غریب مذاق سوجھا۔ ایک زبردست بیماری نے اسے آدبوچا اور دیکھتے ہی دیکھتے خوبصورت آنکھوں والی ہیلن (دبلی پتلی اندھی بہری) ہیلن بن گئی۔ ماں باپ کے رنج و غم کی کوئی انتہا نہ رہی اس کی ماں نے اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر گڑگڑا کر خدا سے دعا مانگی:

"اے خدا تو نے اس غریب کو کس جرم کی سزا دی۔ اب یہ بدنصیب کیونکر اپنی زندگی گذارے گی۔ رحم کر! پروردگار تو اس بچی پر رحم کر اور اسے اس جہان سے اٹھا لے ورنہ یہ زندہ درگور ہو جائے گی۔"

شاید خدا اپنے بندوں کی دعائیں اتنی آسانی سے قبول نہیں کرتا۔ خدا کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے اس کے ماں باپ کو کیا معلوم تھا کہ وہ جس بچی کو ناکارہ سمجھ رہے ہیں ایک دن دنیا کی عظیم ترین شخصیت بنے گی۔

اندھی بہری ہیلن بڑی ہوتی گئی اس نے کبھی کسی کو بولتے نہیں سنا تھا اس لئے وہ بھی بول نہیں سکتی تھی۔ والدین نے اس کی تعلیم و تربیت پر بہت زیادہ توجہ دی اور ایک انتہائی شریف و مشفق خاتون "انی سلیوان" (ANNE SULLIVAN) کو استانی مقرر کیا۔ وہ اندھے بچوں کو تعلیم دیا کرتی تھیں۔ پہلے وہ خود بھی اندھی تھیں لیکن ایک کامیاب آپریشن کے بعد ان کی بینائی جزوی طور پر بحال ہو گئی تھی لہٰذا وہ اندھوں کی تکالیف اور لوگوں سے بہتر سمجھ سکتی تھیں شاید اسی وجہ سے انھیں اندھے بچوں سے بے انتہا محبت تھی۔

جو سب سے پہلا لفظ مس ہیلن نے پڑھا وہ تھا "گڑیا" جو اس کی استانی نے اس کی ہتھیلی پر لکھا تھا۔

بولنا ہیلن نے بڑے انوکھے طریقے سے سیکھا۔ اس کی قوت احساس غیر معمولی طور پر تیز تھی وہ اپنی استانی کے گلے اور ہونٹوں کی حرکت کو اپنے ہاتھ سے محسوس کرتی۔ وہ بہت جلد ٹوٹے پھوٹے الفاظ ادا کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ "انی سلیوان" اپنی اس غیر معمولی کامیابی پر بہت نازاں تھی اور ہیلن کے والدین بھی بہت مسرور تھے۔ آہستہ آہستہ ہیلن باقاعدہ بڑے بڑے جملے ادا کرنے لگی اس نے اس طرح اپنی عظیم استانی کی مدد سے اپنی معذوریوں پر فتح حاصل کی۔ اب مس ہیلن کو پرکن (PERICIN) کے "اندھوں کے انسٹیٹیوٹ" میں بھیج دیا گیا جہاں اس محنتی اور ذہین بچی نے نابیناؤں کی تعلیم کے لئے استعمال کئے جانے والے ابھرے ہوئے حروف کی مدد سے بہت جلد پڑھنا سیکھ لیا۔

اس کا شمار کالج کی ذہین ترین طالبات میں ہوتا تھا ہیلن نے بڑی جانفشانی سے مطالعہ جاری رکھا۔ چوبیس سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد وہ امریکہ کی مشہور و معروف یونیورسٹی، ہارورڈ یونیورسٹی سے گریجویٹ بن کر نکلیں انھوں نے گریجویشن کے امتحان میں پوچھے گئے سوالات کے اتنے معیاری جوابات ٹائپ کئے کہ وہ آج بھی ہارورڈ یونیورسٹی (HARVERD UNIVERSITY) کے میوزیم میں بطور نمونہ رکھے ہوئے ہیں۔

مس ہیلن کیلر بڑی حیرت انگیز شخصیت اور ناقابل فہم صلاحیتوں کی مالک تھیں وہ نہ صرف انگریزی زبان سے ہی واقف تھیں بلکہ فرانسیسی اور جرمن بھی اچھی طرح جانتی تھیں اور لاطینی تو ان کی پسندیدہ زبان تھی۔

اس حیرت انگیز خاتون کے بارے میں مشہور امریکی

مصنف مارک ٹوائن نے سچ ہی تو کہا تھا کہ "دنیا کے دلچسپ ترین اور حیرت انگیز لوگوں میں جو دو نام سرِ فہرست ہیں وہ نپولین اور مس ہیلن کیلر کے ہیں"۔

مس ہیلن گھوڑا سواری اور موسیقی سے بھی لطف اندوز ہوا کرتی تھیں انھوں نے اپنی زندگی اندھوں اور بہروں کے لئے وقف کر دی تھی کام سے انھیں بے انتہا انس تھا وہ اٹھاسی سال کی عمر میں بھی روزانہ دس گھنٹے کام کرتی تھیں۔

انھوں نے امریکہ میں معذور انسانوں کے لئے ایک بین الاقوامی امدادی ادارے کی بنیاد ڈالی۔ اور ان کے لئے ایک نئی جدوجہد کا آغاز کیا۔ انھوں نے نابینا اور بے سماعت لوگوں کے مفاد کے لئے دنیا کے کونے کونے میں جا کر لیکچر دیئے۔ دنیا بھر کے اندھوں اور بہروں کی توجہ کے اس مرکز سے بڑے بڑے سیاست داں، عالم، دانشور اور ملکتوں کے سربراہ ملاقات کرنا باعث فخر سمجھتے تھے۔ اور وہ بھی ان سے پوری خود اعتمادی کے ساتھ تبادلہ خیال کرتی تھیں۔

امریکہ میں انھیں صدر کے اعلیٰ ترین عوامی اعزاز "میڈل آف آنر" سے نوازا گیا۔ ۱۹۳۱ء میں یوگوسلاویہ میں سینٹ ساوان آرڈر (ST. SAVAN ORDER) ملا۔ ۱۹۳۲ء میں گلاسگو یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لا کی ڈگری دی۔ ۱۹۵۲ء میں فرانس میں انھیں لیجن آف آنر..... (LEGION OF HONOUR) ملا تو ۱۹۵۳ء میں برازیل نے "ساودرن کراس" SOUTHERN CROSS عطا کیا۔ اس کے علاوہ بھی دنیا بھر کی بہت سی یونیورسٹیوں نے جن میں دہلی یونیورسٹی بھی شامل ہے ان کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں "ڈاکٹر آف لا" کی اعزازی ڈگریاں پیش کیں۔

لیکچر دینے کے علاوہ انھوں نے لکھنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ ایک کامیاب مصنفہ بن گئیں۔ "دنیا جس میں رہتی ہوں" (THE WORLD I LIVE IN) "نغمۂ دیوار سنگ" (SONG OF THE STONEWALL) - اور ان کی اپنی سوانح حیات "استاد" (TEACHER) ان کی مشہور ترین کتابیں ہیں۔

۱۹۵۵ء میں ہیلن کیلر ہندوستان کے دورے پر آئیں۔ یہاں ڈاکٹر مسز اینا سپسن نے ان کے گائیڈ کے فرائض انجام دیئے۔ مسز سپسن نے ہیلن کیلر کے ساتھ گزارے ہوئے دن بہت ہی دلچسپ انداز میں بیان کئے۔ مس سپسن کے اس مضمون کو پڑھ کر ہیلن کا بالکل صحیح خاکہ ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

۲۰ فروری ۱۹۵۵ء کی ایک شام تھی۔ میں اپنی بہن کے ساتھ لیڈی ارون کالج کے احاطہ میں اپنے مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی کہ مالی کچھ پھولوں کے لئے ہمارے پاس آیا۔ یہ پھول ایک مہمان کو پیش کئے جانے والے تھے۔ میں نے پوچھا وہ مہمان کون ہے۔ کیا بوڑھا ہے یا جوان ہے عورت ہے یا مرد؟ مگر مالی نے کہا کہ وہ یہ سب کچھ نہیں جانتا مگر اتنا جانتا ہے کہ یہ پھول ودیش سے آنے والی کسی اہم شخصیت کو پیش کئے جانے والے ہیں۔ میں نے اسے بتلایا کہ وہ کس قسم کے پھول چنے اور مالی نے ایک خوبصورت مہکتے پھولوں کا گلدستہ بنا لیا۔

اگلی صبح جب میں نے اخبار کھولا تو پہلے ہی صفحہ پر ایک تصویر دیکھی جس میں پھولوں کا وہی گلدستہ ہیلن کو پیش کیا جا رہا تھا میں نے سوچا مجھے اس بارے میں کیوں نہیں بتلایا گیا۔ میں خود ایرپورٹ پر اس کے استقبال کے لئے پہونچ جاتی۔ میری خواہش تھی کہ میں ہیلن کیلر سے ضرور ملوں۔ عجیب و غریب اتفاق یہ ہوا کہ پندرہ منٹ کے بعد ہی اسسٹنٹ ریڈ کراس کمشنر نے مجھ سے ٹیلیفون پر درخواست کی کہ میں تین دن کے لئے ہیلن کیلر

ہیلن کی اپنی جوانی کے دور میں ٹیگور سے ملاقات ہوئی تھی جس سے وہ بہت متاثر ہوئی

کی گائڈ بنوں وہ کل ہی شام کو دہلی پہونچی ہیں۔ ہیلن کیلر وزارت تعلیم کے دعوت نامہ پر اندھوں کے لئے عوام میں بیداری پیدا کرنے کی غرض سے ہندوستان آئی ہیں۔ حکومت نے ریڈکراس سے اپیل کی تھی کہ وہ معزز مہمانوں کے لئے کوئی مناسب معاون وگائڈ فراہم کرے اور چونکہ میں ریڈکراس کے لئے پہلے رضاکارانہ کام کر چکی تھی اس لئے اس کام کے لئے میرا انتخاب کیا گیا۔ میں نے کالج کی پرنسپل صاحبہ کو چھٹی کی درخواست لکھی۔ میں لیڈی اروِن کالج میں شعبہ غذائیات میں لیکچرر ہوں۔ اس کے آدھ گھنٹہ کے بعد میں حیدرآباد ہاؤس پہونچ گئی۔ جہاں ہیلن کیلر اور اس کی ساتھی مس پولی تھومس ٹھہرائی گئی تھیں میں جب ان سے ملنے کا انتظار کر رہی تھی تو سوچ رہی تھی کہ دنیا کی اس عظیم شخصیت کی میں کس طرح معاون بنوں گی اور جب کہ وہ ایک اندھی، بہری اور گونگی شخصیت ہے۔ اسی وقت اپنے نیلے لباس میں کیلر باہر آئی۔ وہ بہت پرسکون اور مسرور معلوم ہو رہی تھی۔ ہمارا ایک دوسرے سے تعارف کرایا گیا۔ اس نے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں سے محسوس کیا اور خوش آمدید کا بوسہ دیا اور بولی "یہ اپنا ہے" اور اس کے بعد سے ہم تینوں کی کمپنی بن گئی۔ ہیلن پولی اور اپنا۔

میری ذمہ داریاں فوراً ہی شروع ہو گئیں میں نے پولی اور ہیلن کی اشیاء کو ترتیب دیا۔ ہیلن کے کمرہ سے تمام غیر ضروری فرنیچر ہٹا دیا گیا تاکہ اس کو نقل و حرکت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اس کے ٹائپ رائٹر کو ایک مخصوص میز پر رکھ دیا گیا۔ ہیلن کیلر مجھ سے بار بار اصرار کرتی رہی کہ میں رات اسی کے ساتھ قیام کروں مگر میری گھر جانے کی بڑی خواہش تھی اور رات کو جب میں گھر پہونچی تو مجھے ٹیلیگرام ملا جس میں لکھا تھا کہ میرا ہندوستان میں جو بھائی

آل انڈیا ویمن کانفرنس کے ارکان کے ساتھ

تھا وہ مرگیا، اگرچہ مجھے سخت صدمہ پہونچا مگر میں نے اس خبر کو کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ میں صبح اٹھ کر ہیلن کے پاس پہونچ گئی ہیلن نے کہا:

"اینا آج تمہارا دل کچھ افسردہ معلوم ہوتا ہے"

مجھے اس پر سخت حیرت ہوئی۔ پولی نے پوچھا کیا مجھے کوئی بری خبر ملی ہے۔ میں نے کہا "ہاں کل میرا بھائی مرگیا ہے"۔ ہیلن کو جب یہ خبر سنائی گئی تو وہ بہت متاثر ہوئی۔

میرا پہلا رسمی کام ہیلن کی اس تقریر کا املا لینا تھا جو اُسے دلی کے شہری استقبالیہ میں دینی تھی۔ ہیلن کو کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ ادا کر لینے کی مہارت پیدا کرنے میں ۲۵ برس لگے تھے مگر پھر بھی ان کی زبان مبہم معلوم ہوتی تھی ان کا تلفظ بہت عجیب اور غیر مانوس ہوتا تھا۔ وہ سننے والوں کی بڑی مشکل سے سمجھ میں آتے تھے۔ لیکن اگر کوئی ہمدردی اور توجہ سے ان کی بات سنے تو سمجھ سکتا تھا۔

اگلے دن ہیلن نے جب تقریر کی تو میری حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ یہ تقریر لفظ بہ لفظ وہی تھی جو انہوں نے گذشتہ شام مجھے املا کرائی تھی۔ وہ غیر معمولی قوت حافظہ کی مالک تھیں۔

پنڈت نہرو سے ہیلن کی ملاقات گھریلو ڈھنگ کی تھی۔ کیونکہ وہاں پنڈت نہرو، ان کی بیٹی اندرا کے دونوں بیٹے موجود تھے۔ زیادہ بھیڑ بھاڑ نہ تھی۔ نہرو اور ہیلن بہت جلد ایک دوسرے سے گھل مل گئے انہوں نے مختلف موضوعات پر گفتگو کرنی شروع کر دی۔ نہرو نے ہیلن کو بھگوت گیتا کے ایک نئے انگریزی ترجمہ کے بارے میں بتلایا اور درخواست کی وہ اسے ضرور پڑھے۔ دوران گفتگو نہرو نے پوچھا کیا وہ تاج دیکھنا پسند کریں گی۔ ہیلن نے کہا اگرچہ یہ میری خواہش تھی مگر میں جاؤں گی نہیں۔ لیکن نہرو نے کہا "تمہیں تاج ضرور دیکھنا ہوگا" اور اس کے بعد انہوں نے ہدایات جاری کر دیں کہ ہیلن کے پروگرام میں آگرہ کی سیاحت کو بھی شامل کرلیا جائے۔ اور اپنا ذاتی جہاز ہیلن کو آگرہ کے سفر کے لئے پیش کیا۔

جب ہم تاج پہونچے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ میں اور پولی سخت مایوس ہوئے مگر ہیلن نہایت مسرور اور پرجوش تھی۔ وہ تاج کی سنگ مرمر کی دیواروں کو اپنے ہاتھوں سے چھوتی ہوئی ادھر ادھر دوڑ رہی تھی۔ ہیلن نے اس مقبرہ کو دیکھنے میں دو گھنٹہ سے بھی زیادہ وقت صرف کیا۔ واپسی پر ہیلن نے مجھ سے کہا: "میری انگلیاں تاج کی نقاشی کے حسن سے سرشار ہیں"

ہم اپنے سفر کے دوران نہرو کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ ہیلن نے ایک دفعہ کہا "میں نے ان کی بلند پیشانی اور خوبصورت چہرہ میں عالمگیر معاملات کا بوجھ محسوس کیا"۔ دلی میں ہیلن کی چند پسندیدہ سڑکیں تھیں جن پر وہ اپنی کار کو لے جانا پسند کرتی تھیں۔ یہ سڑکیں تھیں۔ اشوکا روڈ، پرتھوی راج روڈ، اورنگ زیب روڈ، اور چند دوسری سڑکیں

ہیلن کو ہندوستانی کھانوں میں پوری اور چپاتی پسند تھیں۔ وہ برفی اور جلیبی بھی شوق سے کھاتی تھیں۔ میں نے ہیلن اور پولی کو آم سے متعارف کرایا۔ انہوں نے آم بڑے چاؤ سے کھایا۔

ہیلن ایک خوش پوشاک خاتون تھی۔ اس کا لباس نہایت خوبصورت ہوتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ چودہ عدد سامان کے لائی تھی ان میں چار ہیٹ کے صندوق تھے۔ دو جوتوں کے صندوق۔ دو خوشبو اور پاؤڈر کی صندوقچیاں۔ اور دو دوسرے بڑے بڑے ٹرنک جن میں ہیلن کا لباس تھا۔ وہ ہر دفعہ ایک سا لباس زیب تن کرتی تھی جوتے، ہیٹ اور دوسرے لباس ایک دوسرے کے تعلق ہم رنگ اور مطابق ہوتے تھے یہاں تک کہ ہاتھ کا پرس بھی لباس کے ہم رنگ ہوتا تھا۔ پولی نے بتلایا کہ ہیلن کو اس لباس کے سلسلہ میں امریکہ کی ایکٹرس کیتھرین کارنل نے مشورہ دیا تھا۔ اکثر میں ہیلن کے لباس کی زیادتی پر اس سے

مذاق کرتی تھی. لباس تبدیل کرنے کے وقت ہمیشہ ایک سوال کھڑا ہو جاتا تھا کہ کون سا لباس پہنا جائے۔ ہیلن لباس کے سلسلہ میں غیر معمولی محتاط تھی۔ اس کو سنگھار میز پر بیٹھے اپنی آرائش کرتے دیکھ کر بڑا دلچسپ معلوم ہوتا تھا۔ اسوقت ہیلن کی عمر ۵، برس کی تھی۔

میں ہیلن کے بمبئی کے سفر میں اس کا ساتھ نہیں دے سکی مگر وہاں سے متعدد ٹیلیگرام آنے پر میں ان کے ساتھ حیدرآباد میں ان کے سفر میں شریک ہوگئی۔ حیدرآباد سے مدراس تک جہاز سے سفر بڑا دلچسپ تھا۔ پولی نے ہیلن کو جہاز اور اس کے مسافروں کے بارے میں پوری تفصیلات فراہم کیں۔ پولی کی گفتگو ہاتھ کے اشاروں سے ہوتی تھی۔ وہ ہیلن کی ہتھیلی پر اپنی انگلیوں سے ٹائپ کرتی جاتی تھی۔ مدراس کے ہوائی اڈہ پر مدراس کے اسوقت کے گورنر سری پرکاش نے ہمارا خیر مقدم کیا ہمیں راج بھون میں ٹھہرایا گیا۔ وہاں بڑا اچھا انتظام تھا۔ اور اکثر گورنر صاحب ہمارے پاس آتے رہتے تھے۔ ہیلن کے ساتھ انہوں نے شاعری اور فلسفہ کے بارے میں کافی تفصیلی باتیں کیں ان میں گہری دوستی ہوگئی تھی اور ہیلن کے امریکہ واپس چلے جانے کے بعد بھی ان دونوں کی خط و کتابت جاری رہی۔

اس سفر کی سب سے زیادہ ناقابل فراموش یاد مدراس میں ہیلن کا اندھوں اور گونگوں کے اسکول کا معائنہ کرنا تھا۔ بہت سے خوش پوشاک اندھے بچوں نے اس کا استقبال کیا وہ خوبصورت بچوں کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ وہ بچے جو کچھ تتلا کر الفاظ ادا کر سکتے تھے۔ ہیلن سے انھوں نے سوالات کئے۔ ایک بچے نے پوچھا: کیا آپ خوش ہیں؟ کیا آپکے پاس کتا ہے؟" ہیلن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بہت سے دوسرے بچوں نے سوالات کئے: آپ کا وطن کہاں ہے؟ آپ کے کتنے بہن بھائی ہیں۔ آپ کی سالگرہ کب ہے کیا آپ کے باغ میں پھول ہیں وغیرہ؟

اس روز ہیلن بہت زیادہ مغموم اور خاموش معلوم ہوتی تھی اس دوران اس نے مجھ سے بڑی حسرت سے کہا "کبھی کبھی مجھے اپنے بہرہ پن کا احساس شدت سے ہونے لگتا ہے۔ بینائی کی کمی سے بھی زیادہ۔ کیونکہ اس وجہ سے میں دوسروں کی بات نہیں سن سکتی۔ خاموش رہنا زیادہ تکلیف دہ نہیں ہے اس سے زیادہ تکلیف دہ دوسروں کے غم اور مصیبت سے بہرہ رہنا ہے۔"

مدراس سے ہم بنگلور پہنچے اور بنگلور سے اوٹی۔ اوٹی میں ہیلن کو چند روز آرام کرنا تھا۔ یہاں اس کو اپنی کتاب "ٹیچر" کے بارے میں پروف پڑھنے کا موقع مل گیا۔ یہ کتاب ہیلن نے اپنی ٹیچر" اینی سلیوان میسی" کے بارے میں لکھی تھی اس نے ہی ہیلن کو چھ برس کی عمر سے لکھنا پڑھنا سکھایا۔ اور اسی کی مدد سے ہیلن نے بی۔ اے کا امتحان دیا۔ "ٹیچر" کتاب کا مسودہ دوبار نذر آتش ہو چکا تھا اور تیسری بار ہیلن نے پھر اپنے حافظہ کی مدد سے ترتیب دیا تھا۔ اس کے پروف امریکہ سے بڑے بڑے کاغذوں پر آتے تھے۔ جب بھی میں صبح کو اسکے کمرے میں گئی ہیلن کو یہ مسودہ پڑھتے ہوئے دیکھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنے ہاتھوں سے ہی مطالعہ کرتی تھی دراصل ہیلن کے ہاتھ ہی اس کی آنکھیں اور اس کے کان تھے۔ میں ہیلن کی کام کرنے کی قوت سے بھی متاثر ہوئی وہ بعض دن تو بارہ بارہ گھنٹے کام میں مصروف رہتی تھی۔ ٹائپ رائٹر پر اس کو کام کرتے دیکھ کر بڑی حیران ہوتی تھی۔ اس نے ٹائپ کرنا بارہ سال کی عمر میں سیکھ لیا تھا۔

وہ عام ٹائپ رائٹر ہی استعمال کرتی تھی۔ جس میں اندھوں کے لئے کوئی بھی مخصوص پرزہ نہیں تھا۔ وہ اپنی ایک مخصوص میز پر اپنے کاغذات سجا کر رکھتی تھی۔ ان کاغذات کو چھونے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میز پر کہاں کیا چیز رکھی

راشٹرپتی بھون کے ایک بیرے کی وردی کو دیکھا جا رہا ہے

ہے۔ سادہ کاغذ کہاں سے لینا ہے۔ فلاں کاغذ کہاں رکھا ہے اس کا ٹائپ شدہ مسودہ بہت صاف ستھرا ہوتا تھا۔ اسمیں بعد میں قطعی اصلاح کی ضرورت نہ پڑتی۔ ہیلن کی ٹائپنگ کے سلسلہ میں حیران کن بات یہ تھی کہ وہ ٹائپ کا آخری لفظ ضرور یاد رکھتی تھی درمیان میں اگر ٹائپ چھوڑ کر اسے کچھ اور کرنا پڑتا تو پھر وہیں سے ٹائپ شروع کر دیتی جہاں سے چھوڑا تھا۔ اس سفر کے دوران ہیلن کی یہ کتاب مکمل ہو چکی تھی جس کی اس کو بڑی خوشی تھی۔

ایک اور غیر معمولی بات یہ تھی کہ ہیلن کو پودوں درختوں اور پھولوں سے بے پناہ لگاؤ تھا اور وہ اس سلسلہ میں بہت وسیع معلومات رکھتی تھی۔ ایک دفعہ میں نے اس کو اوٹی میں ایک لبنانی دیودار کا درخت دکھایا۔ اس نے اس کو چھوا اور بولی اس قسم کے دنیا میں صرف ۱۳۰ درخت ہیں" ہمارے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ بعد میں ہم نے حوالوں کی کتابوں سے

ہیلن نہرو کے ساتھ

ہیلن کے بیان کی تصدیق کی۔ واقعی وہ سچ کہہ رہی تھیں ابھی ہی میں ایک مداح نے مختلف پھولوں کا ایک گلدستہ ہیلن کو پیش کیا۔ ہیلن نے بڑے چاؤ سے ہر پھول کو چھو چھو کر دیکھا۔ وہ پھول کو چھوتی تھی اور بتلاتی تھی کہ فلاں قسم کا پھول ہے، فلاں فلاں جگہ پایا جاتا ہے اور اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ وہ پھولوں کے رنگ بتلا رہی تھی، میں نے پوچھا آپ رنگوں کے بارے میں کیسے جانتی ہیں؟ ہیلن نے بتلایا "میں پھولوں کی پتیوں پر اپنی انگلیوں سے رنگوں کو بھی محسوس کر لیتی ہوں۔ گلابی رنگ ذرا کھردرا ہوتا ہے۔ سفید بہت نازک اور نیلا بچے کی گال کی طرح ہوتا ہے۔

ابھی ہی میں ہیلن نے کتاب کا مسودہ پورا کر لیا تھا اور اب وہ نہایت آزاد اور مسرور نظر آتی تھی اس نے مجھ سے کہا "میری خواہش ہے کہ میں باقی زندگی ہندوستان ہی میں گزاروں۔"

ہیلن اور پولی ۲۰؍اپریل کو ہندوستان سے روانہ ہو گئیں۔ وہ یہاں تو ہفتہ رہیں۔ اس کے بعد بس میری ہیلن سے خط و کتابت رہی اور جب میں امریکہ گئی تھی تو اس سے ملی تھی میں ہیلن کے ساتھ گزاری ہوئی چند ساعتوں کی یادوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

۲۷؍جون کو وہ اپنی ۸۸ ویں سالگرہ منانے والی تھیں لیکن افسوس اس سے چھبیس دن پہلے ہی یعنی ۲؍جون ۱۹۶۸ء کو قضا نے "اندھوں کی اس اندھی اور بہری دیوی" کو آدبوچا اور دنیا ایک عظیم ترین شخصیت سے محروم ہو گئی۔ ان کی موت نے دنیا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ آج وہ اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کا نام رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ اندھے بہرے اور معذور انسان اس دیوی کو ہمیشہ ہمیشہ یاد رکھیں گے —

★ ★

لیاقت علی خان　　ایڈمرل ڈیرلین　　نگو دن دیم

جان کنیڈی

جولیس سیزر کے زمانہ سے لے کر آج تک جتنے بھی مشاہیر عالم کے قتل ہوئے ان سے تاریخ کا ہر ورق خون سے رنگین ہے۔ سیزران ہی میں سے ایک ہے جسے قاتل کے خنجر کا پہلا نشانہ کہا جا سکتا ہے، لیکن یہ داستان ظلم و ستم کافی طویل اور لرزہ خیز ہے۔

ماقبل مسیح ایران کے دارا سوم اور مقدونیہ کے فلپ سوم، آرک بشپ آف کینٹ بری۔ تھامس بیکٹ۔ اسکاٹ لینڈ کے جیمس اول جو اپنے ہی امراء کے ہاتھوں ہلاک کر دیئے گئے، انگلستان کے ایڈورڈ پنجم، ہنری ڈیوک آف گیوس کو فرانس کے ہنری سوم کے حکم سے مار دیا گیا اور خود فرانس کے ہنری سوم کو جاکوس کلیمنٹ نے قتل کر ڈالا، اگر یہ قتل متصور رہا ہو تو، سویڈن کے گتادس کورڈی، مارٹ کو چارلوٹی کارڈی نے ہلاک کیا، فرانس کے جنرل کلیبر پال اول روس کا زار، ترکی کے سلیم سوم (۱۸۰۸ء) کے دوران واقع ہوئے قتل تھے اب جبکہ ۱۹ویں صدی ہے اس میں

لیون ٹراٹسکی　　لومبا　　جنرل قاسم

قدرے اضافہ ہوا ہے" ۱۸۶۵ء میں لنکن ۱۸۷۰ء میں اسپین کے سربراہ مارشل ۱۸۷۲ء میں وائسرائے ہند ارل آف میو ۱۸۷۶ء میں ترکی کے سلطان عبدالعزیز اور ۱۸۸۱ء میں جنرل گارفیلڈ ہلاک کردیئے گئے۔

ابھی یہ بیان کرنا باقی ہے ۱۸۹۴ء میں فرانس کے صدر کارنوٹ ۱۸۹۷ء میں اسپین کے وزیراعظم کینوس ڈی کاسٹیلو، ۱۹۰۰ء میں اٹلی کے بادشاہ ہمبرٹ اول ۱۹۰۱ء میں صدر میکنلے، ۱۹۰۴ء میں فنلینڈ کے گورنر باب ری کاف ۱۹۰۵ء میں یونانی وزیراعظم دلیانی، ۱۹۰۷ء میں بلغاریہ کے وزیراعظم بکاف، ۱۹۰۸ء میں پرتگال کے بادشاہ کارموس اور ان کا قائمقام شہزادہ ۱۹۰۹ء میں سر کرزن وسلے، کو دینگرا کے ہاتھوں ایک کوریں کے ہاتھوں ۱۹۰۹ء جاپان کے شہزادہ اتو ۱۹۱۱ء میں سٹولیسن وغیرہ جیسی عظیم ہستیوں کے قتل ہوئے ان کے علاوہ قابل ذکر درج ذیل ہیں۔

نکولاس دوم، روس کے زار ان کی بیوی زرینہ الگزینڈرا ان کا بیٹا الکزس ان کی لڑکیاں اولگا تتیانا، میری اور فستاسیا۔ ان سبھوں کو ۱۹۱۸ء میں انقلابیوں کے حکم سے بڑی بے دردی سے قتل کردیا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں جنرل فرانسسکو پنچولا کو میکسیکو میں قتل کردیا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں نازیوں نے اینگلبرٹ ڈلفوس کا قتل کیا۔ اسی سال یوگوسلاویہ کے بادشاہ الگزینڈر اول کو مارسلیز میں قتل کردیا گیا اور فرانس کے وزیر خارجہ جین لوئس بارتھو بھی قتل کردیئے گئے۔

۱۹۴۰ء میں شہر میکسیکو کے قریب لیون تروٹسکی کو قتل کردیا گیا ۱۹۴۲ء میں الجیریا میں مارشل دارلن کو گولی مار کر ہلاک کردیا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں کونٹ فولک برناڈوٹ یروشلم میں فوجیوں کی گولی کا نشانہ بنے، ۱۹۵۵ء میں جوسی انتونیو پناما کے روسی صدر کی نسلی فسادات کے دوران پناما میں ہی گولی سے ہلاکت ہوئی۔ ۱۹۵۷ء میں گوتمالا کے صدر کیار لوس کیاسٹلوار اس اپنے ہی ایک گارڈ کے ہاتھوں قتل ہوئے، ۱۹۶۱ء میں سابق وزیر کانگو پیٹرک لومبا کا قتل ہوا، ۱۹۶۳ء میں ٹوگو کے صدر سلوانوس اولمپو قتل کردیئے گئے۔

یہ تو پچھلے وقتوں کی داستان قتل تھی، جہاں تک ہماری یادداشت کا تعلق ہے ہندوستان میں گاندھی جی اور پرتاپ سنگھ کیروں، پاکستان میں لیاقت علی خاں اور خان صاحب۔ برما میں اونگ سانگ اور ان کی کابینی وزرا۔ سیلون میں بندرانائکے، بھوٹان میں جگم دورجی، ویت نام میں نگودن دیم۔ عراق میں جنرل قاسم اور عراق کے شاہ فیصل ان سے قبل ان کے چچا شاہ پرنس عبداللہ اور وزیر نوری السعید قتل کردیئے گئے۔

آرک ڈیوک آف آسٹریا کا قتل تو پہلی جنگ عظیم کا پیش خیمہ ثابت ہوا تھا۔ ان میں سے بیشتر اگرچہ سیاسی قتل تھے جو سوچے سمجھے منصوبہ کے، اور قبل از وقت تیار کئے گئے پلان کے تحت کئے گئے تھے۔ کئی ایک قتل کا قیاس بھی کیا گیا تھا لیکن تساہل، لاپروائی اور عدم توجہی کے نتیجہ میں روبہ عمل ہوسئے ـــ لیکن ریاستہائے متحدہ امریکہ میں جو قتل ہوئے وہ بالکل ہی سیاسی حربہ ثابت ہوئے خواہ وہ صدر لنکن، جنرل گارفیلڈ، میکینلے کا قتل ہو یا کینیڈیوں کا یہ صرف اقتدار چھیننے کے لئے ہی نہیں کئے گئے۔

بیشتر قاتل جس کی گولی سے صدر کی ہلاکت ہوئی وہ دماغی عارضہ کا شکار تھا۔ جان وکس بوتھ شہرت چاہتا تھا "مجھے نام در ہونا چاہتے" شہرت شہرت کہا کرتا تھا، دو سال کے اندر اس نے سچ مچ لنکن کا قتل ہی کر ڈالا، اس نے شکاگو میں اپنے ایک دوست کو بتایا تھا "کسی شخص کو اپنے آپ کو دوامی شہرت یافتہ بنانے کے لئے اس سے اچھا اور کیا موقع

ہوگا کہ وہ ابراہم لنکن کو قتل کر دے۔ بوتھ نے لنکن کو اغوا کرنے اور حراست میں رکھنے کے منصوبہ میں کئی ایک سازشیوں کو اکٹھا کر لیا تھا، ایک سازشی دستہ کو قید کر لینے پر متعین کیا تھا، لیکن اسے روبہ عمل لایا نہ جاسکا پھر بھی وہ موقع کا منتظر تھا، بالآخر ۱۴ اپریل ۱۸۶۵ء کی بدنصیب صبح کو واشنگٹن کے ایک فورڈ تھیٹر کی تقریب OUR AMERICAN COUSIN میں صدر کو شرکت کرنا تھا۔ بوتھ شو کے شروع ہونے سے چند گھنٹے قبل ہی آموجود ہوا قتل کا منصوبہ بڑی ہی احتیاط سے بنالیا تھا کسی کو بھی اس بات کا شائبہ نہ تھا کہ ایک بدترین قتل دھوکہ سے ہونے والا ہے۔ صدر کا باڈی گارڈ قریب ہی ایک محفل مے نوشی میں مدہوش تھا کہ بوتھ داخل ہوا، عین اس وقت جبکہ سارے تماشائی کھیل کے اہم ترین منظر پر اظہار خوشی وخوشدلی کر رہے تھے۔ بوتھ صدر کی نشست کی جانب میانہ روی سے لپکا اور چیخنا شروع کر دیا SIC SEMPER TYRANNIS "جابر حکمران کو ہمیشہ کے لئے سلادو" اور چشم زدن میں لنکن کے سر کے پچھلے حصہ پر گولی چلادی۔ لنکن کا نو گھنٹوں بعد انتقال ہوگیا، بوتھ از خود ایک خفیہ مقام میں روپوش ہوگیا، دو ہفتوں بعد پولیس نے ایک غیر رہائشی مکان کے کوٹھے کو آگ لگادی تاکہ وہ باہر نکل سکے، اس کو گولی ماردی گئی اور آگ سے گھسیٹ کر نکالا گیا تب وہ زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔ "ماں سے کہنا کہ میں نے وطن کے لئے جان دیدی۔"

صدر گارفیلڈ کا قتل بھی اسی طرح کا ایک بے مقصد قتل ثابت ہوا، وہ شخص جس نے صدر کا خون کیا تھا چارلس جولیس گوئیتے، فرانس کے قونصل میں ملازمت کے حصول کے لئے صدر کو تنگ کیا کرتا تھا۔ گوئیتے وکیل تھا اور عیسائیت کا مبلغ بھی وہ خود کو جیسس کرسٹ اینڈ کمپنی کا ملازم بتاتا تھا وہ اکثر وبیشتر واشنگٹن کے اطراف بلا کسی مقصد کے پراسرار حالت میں گھومتا پایا جاتا تھا کبھی کبھار بڑبڑایا کرتا تھا کہ اس کا اصل مقصد ری پبلکن پارٹی میں اتحاد کو اجاگر کرنا ہے، لیکن ایک دن وہ کہنے لگا کہ صدر کو ختم کرنے کا حکم خدا سے لایا ہے، وہ ایک ۴۴؍کال ریوالور لایا (امریکہ میں اس وقت بھی آج کی طرح اسلحہ کا خریدنا بالکل آسان تھا) اس سے کتے کے بچے پر نشانہ کی مشق کیا کرتا تھا اور موقع کی تلاش میں تھا۔

۲؍جولائی ۱۸۸۱ء کی بدنصیب صبح ۹ بجکر بیس منٹ پر صدر واشنگٹن کے بالٹی مور اینڈ پوٹیمک ریلوے اسٹیشن میں داخل ہو رہے تھے کہ گوئیتے صدر کے بالکل قریب سے انہیں مس کرتا ہوا گزرا۔ صدر کو ذرہ برابر بھی گمان نہ تھا کہ کوئی ان پر گولی چلادے گا، اور اس نے صدر کی پشت میں گولی داغدی گارفیلڈ کراہ اٹھے "میرے خدایا یہ کیا ہوا" وہ منہ کے بل گر پڑے اگرچہ ان کو فوری طبی امداد پہنچائی گئی پر وہ جانبر نہ ہو پائے۔ گولی لگنے کے اسی دن بعد وہ چل بسے گوئیتے گرفتار کرلیا گیا لیکن وہ پاگل ثابت ہوچکا تھا اسے سزائے موت دے دی گئی۔

ولیم میکنلے کا قاتل لیون ایف زولگوز باغیوں کا سرغنہ تصور کیا جاتا تھا یہ کہا جاتا ہے کہ زولگوز نے اٹلی کے شاہ ہمبرٹ اول کے باغیوں کے قتل کی خبر سن کر ہی ریاستہائے متحدہ امریکہ کے صدر کے قتل کی ٹھان لی، اور اس نے ایک مہینے کے اندر اندر ہی سچ مچ صدر کو ہلاک کر ڈالا۔ اس نے ایک ۳۲؍ کیلیبر پستول ۴.۵۰ ڈالر میں خریدی تھی، قتل کی واردات اس وقت ہوئی جب کہ ۶؍ستمبر ۱۹۰۱ء کو نیویارک کے امریکن ایکسپوزیشن بفلو میں واقع ٹمپل آف میوزک میں صدر مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ زولگوز نے عمدہ لباس زیب تن کیا ہوا تھا، اس کے ساتھ اس کا ریوالور تھا۔ (لیکن صدر کے کسی

گاندھی جی

بھی محافظ نے اسے نہیں دیکھا) میکنلے جب مہمانوں کے استقبال میں ہاتھ پھیلائے ہوئے تھے قاتل آگے بڑھا اور صدر کے سینے میں گولی پیوست کر دی، میکنلے کی زبان سے نکلا "لوگو اس سے نرمی برتو" آٹھ دن بعد طبی امداد بھی سود مند ثابت نہ ہو پائی کہ وہ چل بسے۔

زولگوز کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ وہ خود اپنے آپ کو حوالہ کر دے اس نے اپنی بے گناہی بھی ثابت نہ کرنی چاہی اور اعتراف کر لیا کہ "میں نے صدر کا قتل کیا ہے چونکہ وہ اچھے کام کرنے والوں کے دشمن تھے" میں اس جرم کے لئے شرمندہ بھی نہیں ہوں۔ اگرچہ وہ بچاؤ چاہتا تھا لیکن اسے موت کی سزا دے دی گئی۔

صدر کینیڈی کا قتل بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں رہا اس کی تفصیلات سے بھی دنیا کو واقفیت ہوئی اور یہ تسلیم کر لیا گیا کہ جو شخص صدر کا مبینہ قاتل تھا وہ آسویلڈ ہی تھا اس پر اور نہ... اس کے قاتل پر کوئی مکمل طور پر مقدمہ چلایا جا سکا گارفیلڈ کے قاتل گوئٹے کو جب پھانسی کے تختہ پر لیجایا جا رہا تھا وہاں پہنچ کر اس کو سولی پر چڑھا دیکھنے کا بے حد مشتاق تھا اس مقصد کے لئے تین تین سو ڈالر........ ادا کئے گئے تھے اور اس کو آخر تک شہرت، شہرت چیختے چلاتے سنا گیا۔

میکنلے کی ہلاکت کے ۴۶ دن بعد زولگوز کو برقی قوت کے ذریعہ ہلاک کر دیا گیا، کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد بھی کسی نے انتقامی جذبہ کے تحت اس کے کفن پر سلفیورک ایسڈ ڈال دیا۔ مارٹن لوتھر کنگ اور رابرٹ کینیڈی کے قتل کا مقصد بھی مکمل طور پر منظر عام پر نہیں لایا گیا اور شاید آئندہ بھی...!

کیا کسی بھی بادشاہ، صدر، شہزادہ، وزیر یا سیاستدان کے قتل نے کسی بھی مسئلے کی یکسوئی میں مدد دی ہے، جبکہ ہر قتل ایسا ہی سمجھ کر کیا جاتا رہا ہے، اس کا کوئی مکمل جواب نہیں بن پائے گا، تاریخ میں اس طرح کی سیکڑوں مثالیں پڑی ہیں کہ دنیا نے اپنوں میں سے کسی ایک کو اپنے سروں پر طاقتور حکمران بننے نہیں دیا۔ اگر براون شرٹ مومنٹ سے قبل ہی ہٹلر کا قتل ہوا ہوتا تو شاید دنیا میں اس طرح جبر و ظلم و ستم اور ناانصافیوں کا دور دورہ نہ ہوتا۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ دنیا ظالم، جابر، لالچی اور ذلیل طاقتوں کے نقش قدم پر ہوتی گئی، سب سے زیادہ لاحاصل بحث تو یہی ہوگی کہ تاریخ کے "اگر" اور "لیکن" کو لے کر بیٹھ جائیں، اگر دارا شاہجہاں کا جانشین ہوتا تو...... نارائن راؤ کا قتل نہ ہوا ہوتا۔ اگر... اگر... اگر...

سارے کے سارے قتل بے نتیجہ ثابت ہوئے البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حرکات آدمی میں چھپی ہوئی درندگی کی غمازی کرتی ہیں، قتل کا لامتناہی سلسلہ کسی مخصوص مملکت قوم، ملک یا سرزمین کے لئے نہیں بلکہ ہر سنجیدہ آدمی کے لئے باعث شرم ہوا کرتے ہیں، ان ستم ظریفوں کے مہیب و خوفناک تصور کے آگے کوئی بھی قوم یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ یہاں سرزد نہیں ہو سکتے ــــ یہ ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے!

شاکر بشارتی

نیند میں چلنے والے

یہ واقعہ لندن کا ہے۔ صبح کے چار بجے آگ بجھانے والا ایک انجن کہیں سے واپس آرہا تھا کہ ڈرائیور نے کہر آلود اور سنسان سڑک کے بیچوں بیچ ایک سایہ متحرک دیکھا۔ لگاتار ہارن بجانے پر بھی چلنے والا جب سامنے سے نہ ہٹا تو ڈرائیور نے بریک لگا دیئے اور فائرمین نیچے کود کر پر اسرار سائے کی طرف بڑھے۔

قریب پہنچکر انہوں نے جو کچھ دیکھا اس سے مارے حیرت کے وہ انگشت بدنداں رہ گئے۔ ایک جوان سال عورت شب خوابی کا لباس پہنے، گردوپیش سے بے خبر خراماں خراماں چلی جارہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ آگے کو اٹھے ہوئے تھے اور آنکھیں بند تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کوئی روح عالم بالا سے اس دنیائے فانی کی سیر کو نکل آئی ہو۔

فائرمینوں نے اسے جھنجھوڑا ــــــ "مادام! مادام!! طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟ ہوش میں آیئے ــــــ"

لیکن مادام جواب دینے کی بجائے چند لمحوں کے لئے رکی اور پھر اسی طرح ہاتھ اٹھائے آنکھیں بند کئے چلنے لگی۔ فائرمین دم بخود پیچھے پیچھے تھے۔ سڑک پار کر کے وہ ایک ڈاکٹر کے مطب کے پاس رکی اور باہر رکھی ہوئی ایک بنچ پر آرام سے بیٹھ گئی، فائرمینوں نے پولیس کو بلا لیا اور بہ ہزار دقت جب وہ ہوش میں آئی تو اس نے بتایا کہ وہ خواب خرامی یعنی نیند میں چلنے کی مریضہ ہے۔ جب پولیس اسے گھر چھوڑنے گئی تو اس کا خاوند

بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ اس کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ اس کی بیوی کمرے سے باہر نکل کر کوچہ گردی کر رہی ہے۔

اپنی نوعیت کا یہ انوکھا واقعہ نہیں۔ یہ عورت۔ ان سیکڑوں بلکہ ہزاروں عورتوں، مردوں اور بچوں میں سے ایک تھی جو رات کو سوتے سوتے اچانک بستر سے اٹھ کر خواب کی حالت میں ہی چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ صرف برطانیہ میں پانچ لاکھ کے لگ بھگ ایسے لوگ ہیں جو خواب خرامی کے مریض ہیں۔

دماغی امراض کے مشہور ماہر ڈاکٹر منگلو رپائی فرماتے ہیں کہ جب کبھی آپ کسی کو حالت خواب میں چلتا دیکھیں تو فوراً جگا دیں۔ یہ غلط ہے کہ نیند میں چلنے والوں کو جگا دیا جائے، تو اچانک صدمہ سے ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینے کی صورت میں نوے فیصدی اس امر کا امکان ہے کہ ان کو کوئی حادثہ پیش آجائے گا۔ ڈاکٹر پائی نے خواب خرامی کے اسباب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق خواب خرامی کے مریضوں کے پانچ مختلف گروہ ہیں ان میں سب سے بڑا گروہ جسے دائم المرض کہنا چاہیئے۔ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو سخت ذہنی پریشانیوں میں مبتلا ہوتے ہیں ایسے لوگوں کو اپنی روزمرہ زندگی میں کئی ایسے مسائل سے سابقہ پڑتا ہے جن سے وہ حالت بیداری میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتے اس لئے وہ ان کو حالت خواب میں حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس گروہ میں سب سے زیادہ تعداد بچوں کی ہے۔

خواب خرامی کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ اگر کوئی بچہ نیند میں چلتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو اس کے والدین سخت گیر ہیں اور یا استاد تیز مزاج ہے یا اسکول اور محلے میں کوئی ایسا خبیث شخص موجود ہے جس کا خوف و ہراس ہر دم اس کے دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے اور اس سے نجات پانے کے لئے وہ بچہ سوتے میں بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ اس نے سونے سے پہلے کوئی خوفناک کہانی پڑھی یا سنی ہو، اور اس کے کردار خواب میں اس کا پیچھا کر رہے ہوں۔ بچے عموماً خواب میں دیکھتے ہیں کہ کوئی ہیبت ناک جانور ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ یا وہ کسی اندھیرے غار میں گر گئے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ گھبرا کر بستر سے اٹھ بیٹھتے ہیں اور حالت خواب میں ہی باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرتے ہیں اس قسم کے بچے اکثر کھڑکی کے راستہ نیچے گر پڑتے ہیں۔

سونے سے پہلے کسی خاص امر کے متعلق حد سے زیادہ سوچ بچار یا غور و فکر بھی بہت سے لوگوں کی خواب خرامی کا سبب ہوتا ہے۔ ۱۹۵۷ء کا قصہ ہے کہ اوکلوہاما (امریکہ) کی ایک خاتون مسز آئی ون وائر ایک رات سونے سے قبل بہت دیر تک اس خیال میں غلطاں رہی کہ صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے وہ اپنے باغیچے کی صفائی کرے گی۔ آدھی رات۔ کو وہ یک لخت بستر سے اٹھی۔ ہاتھ میں کھرپا پکڑا اور باغ میں جا کر گھاس کھودنے لگی۔ اتفاق سے تھوڑی دیر بعد اسکے شوہر کی آنکھ کھل گئی اور وہ بڑی دقت سے اسے بیدار کر کے خوابگاہ میں واپس لایا۔

ڈاکٹر پائی نے نیند کو مندرجہ ذیل مرحلوں میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا مرحلہ:۔ محویت یا ادھیڑ بن ——— اس مرحلہ میں ہم بستر پر لیٹ کر دن میں گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں سوچ بچار کرتے ہیں۔ اور آئندہ کل کیلئے پروگرام مرتب کرتے ہیں۔

دوسرا مرحلہ:۔ غنودگی ——— اس میں ہمارے خیالات گڈمڈ ہو کر آہستہ آہستہ دھندلانے لگتے ہیں

تیسرا مرحلہ:۔ خواب ——— اس مرحلہ میں ہمارے اکثر خیالات مجسم و متشکل ہو کر پردہ دماغ پر اٹھ آتے ہیں۔

چوتھا مرحلہ:۔ جزوی نیند ——— اس میں دماغ کے اکثر حصے سو جاتے ہیں۔

پانچواں مرحلہ:۔ گہری نیند ——— اس مرحلہ میں پہنچ کر دماغ

کے چند ان حصوں کے سوا جو جسم و جان کا تعلق قائم رکھنے والے آلات کو کنٹرول کرتے ہیں (مثلاً تنفس) باقی تمام حصے بے حس ہو جاتے ہیں۔

گہری نیند کے دوران ہلکی نیند کے لمحات بھی آتے ہیں انہیں لمحات میں ہم کروٹیں بدلتے ہیں۔ جاگنے سے قبل بھی سونے والا انہیں مراحل سے گزرتا ہے لیکن اس صورت میں ان کی ترتیب الٹی ہو جاتی ہے یعنی پہلے گہری نیند، اس کے بعد جزوی نیند، پھر خواب، اس کے بعد غنودگی اور پھر محویت یا اُدھیڑبُن۔

نیند میں چلنے والے مریض خواب کے مرحلہ میں ہوتے ہیں اس لئے ان کے دماغ کے کئی حصے بیدار اور سرگرم رہتے ہیں اور یہ یقیناً وہی حصے ہوتے ہیں جو اعضاء جسمانی کی حرکات کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اکثر اوقات ایسا ہوا کہ خواب خرامی کا کوئی مریض کھڑکی سے نیچے گر پڑا اور گرتے ہی خواب کے مرحلہ سے گزر کر گہری نیند کے مرحلہ میں داخل ہو گیا اور اس وقت تک بے خبر سوتا رہا جب تک کہ کسی نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا نہیں یا اس کی نیند پوری نہیں ہوئی مگر ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب گرنے والے کو زیادہ چوٹ نہ لگی ہو۔ ایک دفعہ ایک دس سالہ لڑکا نیند کی حالت میں کھڑکی کے ساتھ لگے ہوئے پرنالے کے ذریعہ چھت پر چڑھ گیا اور صبح تک وہیں پڑا سوتا رہا۔ جاگنے کے بعد اس نے بتایا کہ "مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی آدمی مجھے پکڑنے دوڑ رہا ہے۔ اس سے بچنے کی صرف یہی صورت مجھے نظر آئی کہ چھت پر چڑھ جاؤں۔"

دوسری جنگ عظیم کے دوران ڈاکٹر بائی کو چند ایسے فوجی سپاہیوں کے علاج پر مامور کیا گیا جو حالتِ خواب میں بڑی عجیب و غریب حرکتیں کیا کرتے تھے۔ ان کے دل و دماغ پر میدان جنگ کے لرزہ خیز مناظر مسلط تھے۔ سوتے سوتے وہ اکثر اچھل کر جاگ بیٹھتے اور جو چیز ہاتھ لگتی اسے پکڑ کر غیر مرئی دشمن کی طرف پھینکتے۔ ان میں آٹھ دس فوجی افسر بھی تھے جو سوتے سوتے "اباؤٹ ٹرن ——— ہالٹ ——— فائر" وغیرہ کے نعرے لگا لگا کر ہسپتال کے در و دیوار ہلا دیتے تھے۔

خواب خرامی کے مریضوں کے متعلق عجیب و غریب قصے مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ بعض ادیبوں نے عالم خواب میں ہی بڑے معرکے کے ناول لکھے۔ ایک مشہور موسیقار نے سوتے سوتے کئی گانوں کی دھنیں بنا لیں اور صبح کو بیدار ہوا تو اپنے اس غیر ارادی کارنامہ پر حیران رہ گیا۔ مشہور نوبیل پرائز یافتہ سائنسدان "اوٹو لودی" کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے عالم خواب میں ہی "اعصابی ہیجانات" جیسے دقیق طبی و نفسیاتی موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ دیا تھا۔

نیند میں چلنے کے عادی ان مریضوں کو ڈاکٹر بائی دوسرے گروہ میں شمار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایسے لوگوں کی ایک دوسری شخصیت بھی ہوتی ہے جو نارمل شخصیت کے سو جانے کے بعد وہ کام سرانجام دیتی ہے جن کو حالت بیداری میں نارمل شخصیت کرنے سے احتراز کرتی ہے۔ دراصل ایسے لوگوں کو مشکل ہی سے خوابیدہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ حالت خواب میں بھی ان کے حواس پوری طرح سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں۔ شور کی طرف بہت جلد متوجہ ہو جاتے ہیں۔ درد، تکلیف، گرمی اور سردی محسوس کرتے ہیں لیکن کوئی بات کرے تو اس کا جواب نہیں دیتے۔

تیسرے اور چوتھے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو کسی بیماری (مثلاً مرگی وغیرہ) کے باعث خواب خرامی کی عادت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پانچواں اور آخری گروہ مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے مریضوں کا ہے۔ یہ لوگ بے حد خطرناک ہوتے ہیں۔ عموماً اپنی بیویوں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ اور اگر حالتِ خواب میں گھر سے باہر نکل جائیں تو اکا دکا راہ گیروں کے لئے مصیبت بن جاتے ہیں۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ یہ لوگ نقب لگا کر کسی کے مکان میں گھس گئے اور جو کچھ ملا پیٹھ پر لاد کر گھر لے آئے۔ ایسے لوگوں کے قرب میں ایک ہی کمرے میں سونا خود کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ دماغی امراض کے کسی ماہر سے ان کا باقاعدہ علاج کرایا جائے۔ ●

غالب نجم

ناوک حمزہ پوری

شاعروں کی نوکِ زبان پر رہنے والا چاند۔ حسینانِ جہاں کے حسن کو مات دینے والا چاند۔ بچوں کا ماموں چاند۔ عروسِ شب کا سہاگ چاند۔ لیلائے ارضی کو چاندنی کی اوڑھنی عطا کرنے والا چاند۔ وہ چاند جو پہلے دور تھا۔۔۔ بہت دور۔۔۔ اتنی دور کہ ننھے منوں کی منت سماجت کے باوجود ان کا یہ بے درد ماموں کبھی ان کے پاس آیا نہ انہیں کبھی دودھ چاول کھلایا۔

یہ سائنس کا کرشمہ ہے کہ اس نے زمین سے چاند تک کی دوری کو نہ صرف ہیچ ثابت کر دیا بلکہ چاند کی مصنوعی خوبصورتی کا پردہ بھی چاک کر ڈالا۔ اب چاند ایک بھوری بھونڈی اور بھدی شکل لے کر ہمارے سامنے آیا ہے۔ آفت آپڑی ہے بیچارے شعراء کی جان پر۔۔۔ مصیبت آگئی ہے عشاقِ ناتوان پر جو معشوقانِ پری جمال کے ابرو کو ہلال اور عارض کو ماہِ کمال کہتے کبھی نہ تھکتے تھے۔ مسئلہ درپیش یہ ہے کہ اب اگر کسی حسینہ سے کہا جائے کہ "تم چودھویں کا چاند ہو" تو کہیں وہ چپل لیکر نہ دوڑے "ہونہہ! موا مجھے بدصورت بھوری، بھدی اور بھونڈی بلکہ ایسی سمجھتا ہے جس کی اپنی کوئی شکل نہ ہو، کوئی رنگ نہ ہو۔"

سائنسدانوں نے تو چاند کی خوبصورتی کا راز بہت پہلے ہی فاش کر دیا تھا۔ لیکن یہ سر پھرے محبت کے مارے مجنوں خیالات کے سراب کے پیچھے دوڑ لگانے والے یہ شعراء ان کی بات کب سننے والے تھے۔ ان کی دلیل تو یہ تھی کہ کیا ان سائنسدانوں نے چاند کو قریب سے کبھی دیکھا ہے؟

سائنس کی نوخیز کسمساتی ہوئی نوجوانی کے لئے یہ ایک چیلنج تھا۔ یہ للکار اسے خاموش کیسے بیٹھنے دیتی۔ نتیجے کے طور پر خلائی پرواز شروع ہوئی۔ روسی دوڑ پڑے۔ امریکی کب چپ بیٹھنے والے تھے۔ انہوں نے پیچھا کیا۔ اور آخر کار اپولو ہشتم کی کامیابی نے امریکہ کو مرد میدان ثابت کر دیا۔ اپولو ہفتم کے گیارہ روزہ چکر پورا کر لینے کے بعد خیال تھا کہ امریکہ روسی خلائی جہاز جونڈ پنجم کی طرح اپنے خلائی جہاز چاند کے گرد چکر لگانے کو بھیجیگا لیکن تین انسانوں کو بھی بھیجنے کا فیصلہ شاید اس لئے کیا گیا کہ اس دوڑ میں کہیں روس بازی نہ مار لے جائے۔

خلائی جہاز اپولو ہشتم چھ دن تین گھنٹے تک ہماری زمین سے دور رہ کر گذشتہ ۲۷ دسمبر ۱۹۶۸ء کی رات کے نو بج کر اکیس منٹ (ہندوستانی وقت) پر بحرالکاہل کی وسیع و عریض آغوش میں صحیح و سلامت لوٹ آیا۔ لامحدود خلا میں پرواز کرنے والا اپولو ہشتم دنیا کا سب سے زیادہ بھاری بھرکم جہاز ہے یہ ۳۶۴ فٹ اونچا ہے، ۳۶ منزلہ عمارت کے برابر۔ یہ ۶۲ لاکھ پونڈ بھاری ہے۔ وزن میں ۲ ہزار بڑی کاروں کے برابر یہ ۵۴۳ جٹ فائٹروں کے ذریعہ پیدا کی جانے والی کل طاقت سے زیادہ طاقتور جہاز ہے۔ یہ جہاز دس سالہائے گراں کی انتھک محنت اور کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس پر بے شمار سائنسدانوں اور انجینیروں نے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کی ہیں۔ بے اندازہ دولت اس کے پیچھے خرچ کی گئی ہے۔ خلائی پرواز میں اس کی رفتار ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ تھی۔ تخیل کی اڑان کی طرح تیز و تند۔ دنیا کے سب سے زیادہ طاقتور اس خلائی جہاز پر سفر

کرنے والے مادرِ گیتی کے تین سپوت ہیں کمانڈر فرینک بورمین، کیپٹن جیمس لوول اور مسٹر ولیم اینڈرس۔ تینوں بہادر دلیر، ہمت و شجاعت کے پتلے۔ ان پر اہلِ زمین بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ تاریخ انسانی میں انہوں نے ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ ایک نئے زمانے کی داغ بیل ڈالی ہے۔ مادرِ گیتی کو ان پر ناز ہے ہم انہیں صرف خلائی کولمبس کہہ کر ان کے احسان، ان کی قربانی کا بدلہ نہیں چکا سکتے۔ یہ مسافر خود اعتمادی کی تصویر، بلند حوصلگی کی علامت اور یقینِ محکم کا پیکر ہیں۔ اپنی بیش قیمت جان کو ہتھیلی پر رکھ کر خلا میں اڑنے والے یہ دلیر مسافر، یہ بہادر ہوا باز انسانیت کے محسن ہیں۔

اس عظیم الشان خلائی جہاز نے کل تقریباً ۵ لاکھ ۲۷ ہزار میل کا کامیاب خلائی سفر کیا۔ اس کا سب سے محیر العقول کارنامہ یہ ہے کہ یہ انسانی تاریخ میں پہلی بار کشش ارضی کے دائرے سے نکل کر چاند کے دائرہ کشش میں داخل ہوا اور پھر صحیح و سلامت واپس نکل آیا۔ درحقیقت اپولو ہشتم کی کامیابی سائنس کی کامیابی ہے۔ انسانی عزم کی کامیابی ہے۔ یہ چھ دن اور تین گھنٹوں کی خلائی پرواز جتنی دلچسپ تھی اس سے کہیں زیادہ لرزہ خیز بھی تھی۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک برس کی طرح گذر رہا تھا۔ چاند کی کشش کے دائرے میں داخل ہونے سے قبل کے لمحات بڑے اندیشہ ناک تھے۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۶۸ء کو دن کے ۳ بج کر ۵۵ منٹ (ہندوستانی وقت) پر انتظار کی طویل گھڑیوں کا خاتمہ ہوا جب ایک خلاباز کی حوصلہ افزا آواز گونج اٹھی "ہم کامیاب ہو گئے ہیں" کیپٹن لوول نے بتایا "چاند کا رنگ عموماً بھورا ہے۔ دراصل اس کا کوئی رنگ ہی نہیں ہے۔ وہ پیرس پلاسٹر کی طرح دکھائی دیتا ہے۔" ولیم اینڈرسن نے کہا "میری داہنی طرف پہاڑ ہی پہاڑ ہیں اتنی اونچائی سے میں جو مناظر دیکھ رہا ہوں ان سے مجھے مایوسی ہو رہی ہے" "زمین کی سمت چالیس ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اترتے ہوئے جیمس لوول بولے" ہمیں اچھا دکھائی دے رہا ہے"

اپولو ہشتم نے پہلی بار زمین پر چاند کی واضح ٹیلی ویژن تصویریں بھیجیں۔ پہلی تصویر جو چاند کے بہت قریب سے لی گئی تھی غیر معمولی حد تک صاف تھی۔ چاند کی سطح پر پھیلے ہوئے آتش فشاں کے ٹیلے تصویر میں صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔

اس عظیم کامیابی نے امریکہ کو سرفرازی بخشی ہے۔ ایسی امید ہے کہ امسال مئی تک وہ اپولو نہم، دہم اور یازدہم چاند پر اتار دے گا۔ ہم کامیابی کی اس مبارک گھڑی کے نہ صرف منتظر ہیں بلکہ اس کامیابی کے لئے دست بدعا بھی ہیں لیکن ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ سائنس کی اس عظیم طاقت کو انسانی فلاح کے لئے استعمال کیا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس بے اندازہ طاقت کے غلط استعمال کی وجہ سے انسان اپنی ہلاکت کے قریب آپ چلا جائے۔ انسان کی تعمیری قوت پر جس حد تک بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے کم خوف اس کے تخریبی عمل سے نہیں کیا جا سکتا۔ ●

میرا اگلا سوال تھا: "کیا عرب اسرائیل تنازعہ کا اب طاقت ہی واحد حل رہ گیا ہے؟" اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا: "ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ بڑی طاقتیں باہمی مفاہمت کیلئے کوشاں ہیں۔ آخر دنیا میں امن قائم رکھنے کی ان طاقتوں کی بھی تو ذمہ داری ہے۔ روس اور امریکہ چاہتے ہیں کہ مشرق وسطیٰ میں جنگ نہ ہو۔ روسی لیڈر گرومیکو کا حالیہ مصری دورہ اسی سمت میں ایک کوشش ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آخر ایمانداری سے معاملات کو سلجھایا جائے تو بغیر جنگ کے ہی حالات ٹھیک ہو سکتے ہیں۔"

"کیا آپ الفتح اور الاصفہ کی گوریلا تنظیموں کو تسلیم کرتے ہیں؟" ہز ایکسیلینسی سے یہ میرا اگلا سوال تھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولے: "ہم ان تحریکوں کے بنیادی اصول کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ جنگ آزادی ہے۔ وہ اپنے وطن کی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ جس طرح فرانسیسیوں نے نازیوں کے خلاف جنگ کی تھی۔ اسی طرح وہ جنگ کر رہے ہیں۔"

میں نے مزید پوچھا: "مصر الفتح کو کتنی امداد دے رہا ہے؟" انہوں نے اس سلسلہ میں فرمایا: "میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ یہودی میرے بیان کو عربوں کے خلاف استعمال کریں گے۔"

عربوں کے اتحاد کے بارے میں محمد امین حلمی نے فرمایا: "عربوں کے اتحاد سے اگر آپ کی مراد اسرائیل کے معاملہ میں اتحاد ہے تو عرب ایک ہیں۔ اسرائیل کے سلسلہ میں تمام عرب ملکوں کی ایک پالیسی ہے۔ ویسے بہت سے معاملات میں اختلافات ہیں انکو دور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ ایک بڑا عظیم مقصد ہے۔ اور اب ہم محسوس کرنے لگے ہیں کہ اتحاد ہماری زندگی کیلئے ناگزیر ہے۔ عرب تاریخ کے ایک اہم موڑ پر کھڑے ہیں۔ ان کے سامنے ماضی کے تلخ تجربات ہیں۔ وہ ایک شاندار مستقبل تعمیر کر سکتے ہیں۔ انہوں نے جہاں فتح و نصرت کی خوشیاں دیکھی ہیں وہاں انہوں نے شکست کے زخم بھی کھائے ہیں۔ آج پوری عرب دنیا انتقام کی آگ میں جل رہی ہے۔ اس کا خون کھول رہا ہے لیکن اتحاد و یکجہتی کے بغیر وہ اپنے خوابوں کو حقیقت کے سانچوں میں نہیں ڈھال سکتے۔ بیشک اتحاد عربوں کے لئے وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔"

اب میں جناب محمد امین حلمی سے مزید سیاسی سوالات نہیں کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے اپنے سوالات کا رخ انکی ذاتی زندگی کی طرف موڑ دیا۔

میرے مختلف سوالوں کے جواب میں انہوں نے کہا: "سیاحت اور کیمپنگ میرے پسندیدہ شوق ہیں۔ میں کھلے میدانوں، پہاڑوں، جنگلوں، دریاؤں اور جھیلوں کے کنارے زیادہ تر وقت گذارنا پسند کرتا ہوں۔ بہت عرصہ تک مکان کی چہار دیواری میں گھر نہیں رہ سکتا۔ فطرت کے حسن کے درمیان گذارے ہوئے لمحے میری زندگی کے سب سے زیادہ یادگار لمحے ہیں۔ میں جب کینیڈا اور امریکہ میں تھا تو اپنی ٹریلر گاڑی (چلتا پھرتا گھر) میں ہزاروں میل جنگلوں اور بیابانوں میں نکل جاتا تھا۔ اور اپنی چھٹیاں جھیلوں کے کنارے کیمپ لگا کر گذارا کرتا تھا۔ مجھے سمندر میں جہاز رانی کا بھی بہت شوق ہے۔ ایک دفعہ میں قطب شمالی بھی گیا تھا اور وہاں کچھ دن گذارے تھے۔"

انہوں نے مزید کہا: "مجھے سوانح عمریاں، تاریخ اور طبعی سائنس پر کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ میں نے اپنے ذاتی تجربات

MEMOIRS بھی لکھے تھے، مگر وہ ابھی تک شائع نہیں ہو سکے ہیں۔"

اپنی سیاحت کے بارے میں کہا: "میں پورا یورپ، امریکہ، لاطینی امریکہ، میکسیکو، یمن، سوڈان وغیرہ گھوم چکا ہوں۔"

میں نے سوال کیا ان ملکوں میں آپ کو سب سے زیادہ کونسا ملک پسند ہے؟ اس سوال پر وہ مسکرائے اور بولے: "اس سوال کا جواب مشکل ہے یہ ایسی ہی بات ہے جیسے آپ پوچھیں کہ آپکو کونسا پھل پسند ہے۔ ہر پھل اپنے موسم میں مزا دیتا ہے۔ اسی طرح ہر ملک ایک خاص موسم میں زیادہ خوشگوار اور حسین ہوتا ہے اب میں ہندوستان کی سیاحت کا پروگرام بنا رہا ہوں۔"

آخر میں انہوں نے کہا: "میں شادی شدہ ہوں۔ میرے پانچ بچے ہیں چار لڑکے ایک لڑکی۔" پھر مسکراتے ہوئے انہوں نے فرمایا مجھے اپنی بیوی کے ساتھ ایک جگہ جانا ہے۔ میرے زبان ترجمان پورے ہو گئے تھے میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ہز ایکسیلینسی نے گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔ اور وہ اپنے پریس اتاشی محمد الشفکی اور مجھے ایک ساتھ بیٹھا چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ میں دیر تک بیٹھا محمد الشفکی سے گفتگو کرتا رہا اور ان کے ساتھ عربوں کی مخصوص کالی کافی پیتا رہا۔ محمد الشفکی مصر سے تازہ تازہ آئے ہیں۔ میں نے ہندوستان کے لئے ان کے دل میں بڑی عزت و احترام کے جذبات پائے۔ ہم دونوں دوستوں کی طرح نہایت بے تکلفی سے غیر رسمی باتیں کرتے رہے۔ اب مجھے دیر ہو رہی تھی۔ اس لئے میں نے رخصت کی اجازت چاہی۔ اور عربوں کی روایتی خوش اخلاقی اور جوش و جذبہ کے گہرے نقوش اپنے قلب پر لئے ہوئے واپس آیا۔

٭٭٭

کاروان
آزادی
منزل بہ
منزل
پینڈرل مون
برطانوی راج کی آخری دور کی تاریخ دلچسپ
بھی ہے اور سنسنی خیز بھی۔ موجودہ مضمون انگریز
مصنف پینڈرل مون کی تصنیف Divide
Quit کے چند ابواب کی تلخیص ہے۔
جو قارئین ہما کی دلچسپی کے لیے پیش کیا جا رہا ہے

۱۹۴۷ء سے ایک سو سال پہلے ہی آزاد ہندوستان کا نقشہ منظر عام پر آ چکا تھا۔ موجودہ صدی کے آغاز میں ہندوستانی نیشنلسٹ لیڈروں نے اس کو اپنی جدوجہد کا مقصد بنا لیا تھا۔ اور پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ تک آزاد ہندوستان برطانوی مبصرین کے لئے ایک ناگزیر حقیقت بن چکا تھا اس کے برخلاف پاکستان کا سنہ ۱۹۳۰ء تک بھی کوئی تصور نہیں تھا اور اس کے تین سال بعد مسلم رہنماؤں نے برطانوی پارلیمنٹ کی جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے سامنے پاکستان کو "ایک طفلانہ اسکیم، احمقانہ اور ناقابل عمل تصور" کہا تھا۔ جولائی سنہ ۱۹۴۶ء تک بھی پاکستان کو ناگزیر حقیقت نہیں کہا جا سکتا تھا۔

لیکن اگر پیچھے کی طرف دیکھا جائے تو آخر میں پاکستان کا اتنی تیزی سے وجود میں آنا زیادہ حیران کن بھی نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ سنہ ۱۸۶۷ء میں سرسید احمد خان نے اس نظریہ کی نشاندہی کر دی تھی جو آگے چل کر پاکستان کی بنیاد بنا۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہندوستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں مگر اس وقت ان کے سامنے یہ صرف نظریاتی مسئلہ کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ وکٹوریہ دور میں انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سرسید فکرمند تھے کہ انتخابی نمائندہ حکومت جس کیلئے نئی قائم کردہ کانگریس پارٹی زور دے رہی تھی وہ ہندوستان کے لئے سازگار نہیں ہو سکتی کیونکہ یہاں اکثریت اقلیت کے مفادات کو نقصان پہونچائے گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان ہی ایک علیحدہ ملک کی مانگ کر سکتے تھے کیونکہ ہندو قوم پرست جو آزادی کی تحریک چلا رہے تھے اور جن کا کانگریس پر قبضہ تھا وہ تقسیم کو ناپسندیدہ خیال کرتے تھے لیکن مسلمان سیاسی اعتبار سے کافی پس ماندہ

سائمن کمیشن کے خلاف ایک جلسہ کو پنڈت نہرو خطاب کرتے ہوئے

تھے اس کی ایک توجہ یہ تھی کہ ان کے زیادہ تر سیاسی لیڈر یہاں تک کہ مسٹر جناح بھی ایک عرصہ تک کانگریس میں شامل رہے۔ اور ان کے سامنے برطانوی غلامی کے جوئے کو اتار پھینکنا تھا اور انھوں نے یہ بھی مان لیا تھا کہ انھیں اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر حکومت چلانی ہے اس کے علاوہ تقسیم کے اندر چھپی دشواریوں نے بھی اس خیال کو پس منظر میں رکھا۔ ہندو اور مسلمان اگرچہ وہ باہمی شادیاں نہیں کرتے تھے لیکن باہمی میل جول کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب اور ساتھ ساتھ رہتے تھے اس لئے اگر ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگا تو منقسم حصوں میں کافی تعداد میں دونوں فرقوں کے لوگ رہ جائیں گے۔ یہی نہیں وہ دو حصے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ شمال مغرب اور شمال مشرق (پنجاب اور بنگال) وہ ایک دوسرے سے کافی دوری پر تھے اور ان کو

ملا کر ایک ریاست بنانے کا خیال دور از قیاس معلوم ہوتا تھا۔

۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں پاکستان کا کوئی ذکر نہیں ہے مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے دوسرے رہنماؤں کی پوری باہمی رضامندی سے مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت کے لئے دوسرے ذرائع تلاش کئے گئے۔ سیاسی اقتدار پر ہندو اکثریت کی اجارہ داری کے خطرہ کو کم کرنے کیلئے پرانا یونٹری فارم آف گورنمنٹ کا نظریہ ختم کر کے ایک وفاقی دستور بنایا گیا۔ جس کے تحت صوبوں کو کافی حد تک خود مختار بنایا گیا۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا گیا۔ تاکہ گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے مسلم بن سکیں۔ مسلمانوں کیلئے علیحدہ انتخاب کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ خود مختار آبائی ریاستوں کو بھی وفاق میں شامل کر لیا جائے گا۔ وہاں جن کی موجودگی مرکز میں توازن قائم

سائمن کمیشن کے خلاف ملک بھر میں مظاہرے

رکھ سکے گی۔ ان انتظامات سے مسلمان مطمئن تھے۔ یہ صحیح ہے کہ مسٹر جناح نے اس ایکٹ کے وفاقی حصہ کو بنیادی اعتبار سے ناقابل تسلیم بتلایا۔ تاہم وہ اس لئے معترض نہیں تھے کہ اس ایکٹ میں مسلم مفادات کی حفاظت نہیں ہوتی تھی بلکہ ان کا اعتراض تھا کہ اس طرح مرکز میں ایک مستحکم حکومت نہیں بن سکے گی۔ کیونکہ محکمۂ دفاع اور محکمۂ امور خارجہ وزیروں کو سونپنے کی بجائے جو قانون ساز اسمبلی کے سامنے جوابدہ تھے گورنر جنرل کو دیدیئے گئے تھے۔ دراصل مسٹر جناح وہی بات کہہ رہے تھے کہ کانگریسی ہندو لیڈر بھی جس بات پر معترض تھے۔ اس اعتراض کے باوجود مسٹر جناح، مسلم لیگ اور تمام دوسری مسلم پارٹیاں اس ایکٹ پر اتفاق کرتی تھیں اور ان کا خیال تھا کہ اس کو آزما لیا جائے۔

یکم اپریل ۱۹۳۷ء تک یہ صورت حال تھی جب اس ایکٹ کا صوبائی حصہ عمل میں آیا۔ صوبوں میں کچھ پابندیوں کے ساتھ ذمہ دار حکومتیں قائم ہو گئیں۔ ایکٹ کا وفاقی حصہ کچھ عرصہ کیلئے ملتوی کر دیا گیا کیونکہ آبائی ریاستوں نے وفاق میں شامل ہونا ابھی تک منظور نہیں کیا تھا۔ ریاستوں کے حکمرانوں کے ساتھ وفاق میں شمولیت کے لئے گفتگو جاری تھی۔ خیال کیا جا رہا تھا کہ ان کے شکوک و شبہات کو دور کر دیا جائے گا۔ اور جلد ہی وفاق کا افتتاح عمل میں آجائے

گا۔ لیکن ایک سال کی مختصر مدت میں یہ صورت حال بالکل بدل گئی۔ مسلم رائے عامہ میں ایک بڑی تبدیلی آئی۔ کانگریس اور لیگ کے درمیان ایک خلیج پیدا ہو گئی جو بڑھتی گئی اور آخر کار تقسیم اور ۱۹۴۷ء کے فسادات کی ذمہ دار بنی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگریسی رہنما مسلم رائے عامہ کی اس تبدیلی کے ذمہ دار تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک لعنت کا شکار ہو گئے تھے جس کے اثر سے آئندہ دس سال تک ان کا عمل ان کے نظریات سے بالکل مختلف

رہا۔ وہ پوری شدت سے ہندوستان کے اتحاد کو قائم رکھنا چاہتے تھے مگر ان کا عمل مسلسل ملک کو تقسیم کی طرف لے جا رہا تھا۔

کانگریسی رہنماؤں نے پہلی غلطی ۱۹۳۷ء میں کی۔ اسی سال سردی کے موسم میں قانون ساز اسمبلیوں کے لیے انتخابات عمل میں آئے۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے انتخابات میں حصہ لیا ہندو اکثریت والے چھ صوبوں میں کانگریس نمایاں طور پر کامیاب ہوئی۔ ان کے علاوہ آسام میں بھی اسے اچھی نشستیں ملیں چار مسلم اکثریت والے صوبوں میں سے تین صوبوں ــ بنگال، پنجاب ــ اور سندھ میں اسے زیادہ بڑی کامیابی نہیں مل سکی۔ مگر اس کے برعکس مسلم لیگ کا تجربہ مختلف تھا مسلم اکثریت کے صوبوں میں بھی اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں مل سکی اور وہ صرف چند سیٹیں حاصل کر سکی ان صوبوں میں مسلمان آپس میں مختلف گروہوں میں تقسیم تھے شمال مغربی سرحدی صوبہ میں جہاں خاص مسلم اکثریت تھی وہاں دوسری مسلم پارٹی "سرخ پوش" عرصہ سے کانگریس کے ساتھ مل کر کام کر رہی تھی۔ پنجاب میں زیادہ تر مسلمان یونینیسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے تھے جس میں دیہی علاقوں کے مسلمان سکھ اور ہندو سبھی شامل تھے مسلم لیگ کو ان مسلم صوبوں میں کامیابی نہ مل سکی اسے اگر کچھ کامیابی حاصل ہوئی تو ان صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور وہ اپنی حکومت نہیں بنا سکتے تھے۔ مسلم لیگ کو سب سے بڑی کامیابی یوپی کے علاقوں سے ملی جہاں مغلیہ تمدن روایات ابھی تک باقی تھیں اور یہاں پر مسلمان اگرچہ آبادی کا سولہ فیصد تھے مگر ان کو کافی سیاسی اہمیت حاصل تھی

اگرچہ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان کوئی انتخابی معاہدہ نہیں تھا لیکن لیگی رہنماؤں نے اپنا انتخابی منشور ایسا بنایا تھا جو کانگریس پروگرام کے مطابق ہو اور اس کے اصولوں کے مخالف نہ ہو۔ ان کو بلاشبہ یہ توقع تھی کہ کانگریس انھیں یوپی اور کچھ ہندو اکثریت والے

آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری لیاقت علی خان

صوبوں میں متحدہ حکومت بنانے کے لئے مدعو کرے گی لیکن ۱۹۳۷ء
کی گرمیوں میں یہ توقعات بری طرح پاش پاش ہو گئیں۔ کانگریس نے
قانون ساز اسمبلیوں میں بھاری اکثریت حاصل کی تھی اس لئے اسے
لیگ کی حمایت کی پروا نہیں رہی تھی۔ وزارتوں میں مسلمانوں کی
نمائندگی کانگریسی مسلمانوں کو نامزد کر کے پوری کی جا سکتی تھی اس لئے
یوپی کے لیگی لیڈروں کو صاف صاف کہہ دیا گیا کہ ان کے ساتھ متحدہ
حکومت نہیں بنائی جائے گی اور اگر انہیں وزارت میں جگہ لینی ہے تو
وہ "علیحدہ پارٹی کی حیثیت ختم کر دیں"۔ اور کانگریس میں شامل ہو کر
اس کے نظم و ضبط کے پابند ہو جائیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ اسی
وقت ان کے ساتھ اقتدار میں شریک ہو سکتے تھے جب وہ اپنی جداگانہ
حیثیت ختم کر کے اپنے کو کانگریس میں مدغم کر دیں۔ انہوں نے لیگ کو
تعاون دینے کی بجائے اپنے میں مدغم کرنے پیش کش کی۔

یہ پالیسی تباہ کن ثابت ہوئی اور یہی غلطی پاکستان کے
وجود میں آنے کا سبب بنی کانگریس مسلمانوں کے علیحدہ سیاسی
وجود کو ختم کر کے ان کی اکثریت کو اپنے میں ضم کر لینا چاہتی تھی۔ ہندو
ازم کا یہ ایک مخصوص ذہن تھا اور تین سو سال پہلے ہندو ذہن
کی اسی ادغام کی پالیسی نے اورنگ زیب کو اسلام کی انفرادیت
کو برقرار رکھنے پر مجبور کیا تھا۔

مسلم لیگ نے کانگریس کے اس الٹی میٹم کو قطعی رد کر دیا۔
اپنی تنظیم کے ضم کر دینے کے مشورہ پر ان کو سخت طیش تھا وہ کسی
قیمت پر بھی اس کے لئے تیار نہ تھے مایوس ہونے والوں میں یوپی
کے ایک بڑے زمیندار لیاقت علی خاں بھی تھے جو آگے چل کر مسٹر جناح
کے نائب بنے۔ جناح جو انتخابات سے پہلے یہ کہہ رہے تھے کہ لیگ
اور کانگریس میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے اب وہ بھی بدل گئے
اس سے پہلے وہ کانگریسی حلقوں میں "ہندو مسلم اتحاد کے پیغمبر"

جنگِ آزادی کے عظیم رہنما پنڈت نہرو

حیثیت سے مشہور تھے۔ وہ ایک مسلمان سے زیادہ برطانیہ مخالف کٹر
نیشنلسٹ (قوم پرست) مانے جاتے تھے۔ مگر وہ بھی اب برطانیہ سے
زیادہ کانگریس کے مخالف ہو گئے تھے اور اب انہوں نے کانگریس کے
خلاف مہم کا آغاز کر دیا تھا اب انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ مسلمانوں
کو کانگریس کے تحت انصاف نہیں مل سکے گا۔ فرقہ وارانہ امن و اتحاد
کی تمام امیدیں کانگریس فاشزم کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئیں

مسلم لیگ اور مسلم اقلیتوں والے صوبوں کے مسلمانوں تک
ہی یہ ردعمل محدود نہیں تھا۔ بلکہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں میں
خوف وہراس پھیل گیا اگر یوپی میں کانگریس کے عمل کا یہ نمونہ ہے تو جب
وفاق وجود میں آجائے گا اس وقت مسلمانوں کی کیا حالت ہوگی؟
اس وقت کانگریس کے تحت مسلمانوں کیلئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔
سال کے ختم ہونے تک سر سکندر حیات خاں یونینسٹ پارٹی کے
مسلم ممبروں کو لے کر اجتماعی طور پر مسلم لیگ میں شریک ہو گئے۔
بنگال اور آسام کے مسلمان وزراء اعظم نے بھی مسلم لیگ کی حمایت
کا اعلان کر دیا۔ پنجابی مسلمانوں کی حمایت بڑے معنی رکھتی تھی کیونکہ
اس صوبہ میں لیگ قطعی ناکام ہو گئی تھی اور تقریباً تمام ہی مسلم نشستیں
یونینسٹ پارٹی کے ہاتھ میں چلی گئیں تھیں لیکن اب سر سکندر حیات
تمام مسلم ممبروں کو لے کر لیگ میں شامل ہو گئے تھے وہ یونینسٹ
پارٹی کے بھی ممبر رہے مگر ساتھ ہی انہوں نے لیگ کی ممبری بھی
اختیار کر لی۔ سر سکندر کسی بھی طرح ایک فرقہ پرست مسلمان نہیں
تھے وہ پنجاب میں مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ تبلیغ کے سخت مخالف تھے
اب اسی کے بہت سے حامی لیگ میں شامل ہو رہے تھے۔ سر
سکندر کو خطرہ تھا کہ اگر وہ مسلم رائے عامہ اور ان کے جذبات کا
ساتھ نہیں دیں گے تو وہ خود بے سہارا ہو کر رہ جائیں گے۔ اور
تمام مسلمان مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے اس لئے انہوں نے
لیگ میں شامل ہونے میں عافیت سمجھی۔ بعد کے حالات نے ثابت
کر دیا کہ ان کا خوف بجا تھا۔

بنگالی اور پنجابی مسلمانوں کی حمایت سے مسلم لیگ
کی طاقت بہت بڑھ گئی مسٹر جناح کو ایک دم وہ ممتاز حیثیت
حاصل ہو گئی جو انہیں اس سے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔
وہ اب تمام مسلمانوں کے بلاشرکت غیرے لیڈر بن گئے تھے یہاں
تک کہ بنگال اور پنجاب کے وزراء اعظم نے بھی ان کو اپنا رہنما تسلیم
کر لیا تھا۔ کانگریسی رہنما خیالات کے ان تیز دھاروں سے بے نیاز
تھے جن کو پیدا کرنے کے وہ خود ذمہ دار تھے۔ ان کو اس بات کا
احساس نہیں تھا کہ یہ دھارے کتنے خطرناک رخ پر بہہ رہے ہیں

انہوں نے اپنی ابتدائی غلطی کو درست کرنے کی کوشش
نہیں کی۔ بجائے مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان کی خلیج کو پُر
کرنے کے انہوں نے اس کو زیادہ وسیع کر دیا۔ نہرو کے ایماء پر
مسلمانوں میں عوامی رابطہ (Mass Contact) تحریک شروع
کر کے انہوں نے حالات کو اور زیادہ بدتر کر دیا۔

یہ مسلم لیگ کو متحرک اور بیدار کرنے کا اشارہ تھا اب

تک مسلم لیگ امیر طبقہ اور متوسط طبقہ کے مسلمانوں کی جماعت تھی۔ اس کو مسلم عوام کی حمایت حاصل نہ تھی۔ لیکن کانگریس جیسی تنظیم نے جس پر ہندوؤں کا غلبہ تھا جب مسلمان کسانوں اور مزدوروں سے رابطہ قائم کرنے کی تحریک شروع کی تو مسلم لیگ کے لئے یہ ایک بڑا چیلنج تھا جس کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتی تھی کانگریس کی عوامی رابطہ تحریک زیادہ آگے نہیں بڑھی تھی کہ مسلم لیگ بھی عوام کی طرف متوجہ ہوئی اس نے پارٹی کی ممبری فیس گھٹا کر دو آنہ کر دی۔ اس نے اپنا حلقہ اثر دیہاتوں تک بڑھانا اور ہندو اقتدار اور غلبہ کے خطرہ کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا یہ اسی طرح کا پروپیگنڈا تھا جو کانگریس انگریزی اقتدار کے خلاف کر رہی تھی۔ کانگریس مسلمانوں کے درمیان 'عوامی رابطہ تحریک' چلا کر یہ بھول گئی کہ مسلم لیگ بھی یہ ہتھیار خود ان کے خلاف استعمال کر سکتی تھی۔

جو کچھ ہو رہا تھا اس کی اہمیت کا اندازہ مجھے ۱۹۳۶ء کی گرمیوں میں ہوا جب میں عارضی طور پر شملہ میں گورنر پنجاب کے سکریٹری کی حیثیت سے بلایا گیا۔ اس وقت مجھے مسلم رائے عامہ میں تبدیلی اور اس تبدیلی کے کیا نتائج ہو سکتے ہیں اس کا اندازہ ہوا اس وقت وائسرائے لارڈ لن لتھگو ریاستی حکمرانوں کو وفاق میں شامل ہونے کی ترغیب دے رہے تھے شاید لارڈ ماؤنٹ بیٹن جیسی صلاحیتوں کا آدمی یہ کام انجام دے سکتا تھا۔ لیکن موجودہ وائسرائے کی بات پر کوئی دھیان نہیں دے رہا تھا۔ اس اسٹیج پر والیان ریاست کے وفاق میں شامل ہونے کا مسئلہ ثانوی درجہ میں پہونچ گیا تھا اب اس سے بڑا مسئلہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی مخالفت تھی۔ میں نے اس کا اندازہ اس وقت لگایا جب جولائی میں سر سکندر نے مجھ سے اپنے تحریر کردہ کتابچہ "ہندوستان کے وفاق کی اسکیم کا خاکہ" کو ترتیب دینے میں مدد کی درخواست کی۔ سر سکندر معتدل اور سنجیدہ خیالات کے انسان تھے اس لئے مجھے ان کا کتابچہ پڑھ کر حیرانی ہوئی جس میں ان جیسے صحیح الذہن شخص نے بھی وفاق کو بجنسہ قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ ان کی وفاق کی اسکیم کی اب کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن انہوں نے مرکز کی طاقت کو کم کرنے پر زور دیا تھا اور کانگریسی راج کے خطرہ کو دور کرنے کی کوشش کی تھی اگرچہ اس اسکیم کے مان لئے جانے کے بہت کم امکانات تھے اور وہ مجھے ناقابل عمل بھی معلوم ہوتی تھی ۔۔۔ مگر سر سکندر اس کو عوام کے سامنے رکھنے پر اصرار کر رہے تھے جب میں نے اس اصرار کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ اگر یہ ایجابی اسکیم پیش نہ کی جائے گی تو دوسرے انتہا پسند حضرات "خطرناک ترین قدم اٹھائیں گے۔ خطرناک ترین قدم سے ان کی مراد پاکستان کی تجویز تھی۔ وہی طفلانہ اور احمقانہ اسکیم، جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اب لیگ کے حلقوں میں زور پکڑ رہی تھی۔

اب تک میری سمجھ میں 'پاکستان' کا مطلب نہیں آیا تھا۔ میں نے اس کی گہرائی تک پہونچنے کی کوشش کی۔ اس خیال کی روح یہ تھی کہ ملک تقسیم ہو جائے اور مسلم اکثریت والی آبادی کے

جنگ آزادی کے ناقابل فراموش رہنما۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری

علاقوں ۔۔۔ پنجاب سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک مسلم ریاست وجود میں آئے یہی پاکستان ہوگا۔ ہندوستان کے باقی ماندہ مسلمانوں کا کیا ہوگا ابھی اس کے بارے میں کچھ نہیں سوچا گیا تھا۔ یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ آسام اور بنگال کے مسلم آبادی والے علاقوں کو ملا کر ایک دوسری ریاست وجود میں آئے گی اس طرح موٹے طریقہ پر ہندو اور مسلمان کی بنیاد پر ملک کی تقسیم ہو جائے گی۔ ان تینوں منقسم ریاستوں میں کافی تعداد میں اقلیتیں رہ جائیں گی ان کی موجودگی ہی ان کے ساتھ اچھے برتاؤ کی ضمانت بن جائے گی۔ مجھے اس نظریہ نے کافی اپیل کی۔ پہلی نظر میں ہندو مسلم مسئلہ کا یہ معقول حل نظر آتا تھا۔ ایک دن اکتوبر ۱۹۳۸ء میں میں نے پاکستان کے نظریہ کی سر سکندر کے سامنے پرجوش حمایت کی۔ سر سکندر اپنی روایتی سنجیدگی سے میری بات سنتے رہے پھر اچانک وہ مجھ پر برس پڑے ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور مجھے ان الفاظ میں تادیب کی:

"آپ یہ کیوں کر کہہ سکتے ہیں؟ آپ پنجاب میں کافی رہے ہیں اس لئے وہاں کے مسلمانوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ پاکستان کا مطلب ہوگا کہ وہاں کے ہر بنئے کی گردن مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور ہندوستان کے مسلمان ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہوں۔"

میں نے یرغمال (Hostage) کے نظریہ کے بارے میں ان سے کہا۔ انہوں نے اس نظریہ کی تردید کرتے ہوئے کہا دونوں طرف کے یرغمال (Hostage) کو ختم کر دیا جائے گا یہ نظریہ محض ایک فرضی خیال ہے اس کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا "میں امید کرتا ہوں کہ اب آئندہ اس طرح کی باتیں نہیں کریں گے پاکستان کا مطلب ہوگا قتل عام!"

انہوں نے یہ الفاظ جذبات کی شدت کے ساتھ کہے تھے اور مجھ پر ان کا گہرا اثر پڑا تھا۔ پاکستان کے لئے میرا ابتدائی جوش ٹھنڈا ہو گیا اور مجھے خیال ہونے لگا کہ مستقبل قریب میں پاکستان نہیں بن پائے گا۔ لیکن بہت دن نہیں گذرے کہ سر سکندر جیسے معقول اور معتدل لوگ بھی پاکستان کی مانگ کرنے پر مجبور ہوئے۔ مسلم لیگ اب تیزی کے ساتھ پاکستان کے نظریہ کو آگے بڑھا رہی تھی۔ ۱۹۳۷ء کی گرمیوں میں اس نے خطرناک شکل اختیار کر لی۔ ایک سال بعد لیگ نے وفاق کی اسکیم کو بالائے طاق رکھ دیا۔ ۱۹۳۹ء کے آغاز پر وہ دوسری دستوری اسکیمیں بنا رہی تھی اور آخر کار مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور کے اجلاس میں مسلم لیگ نے صاف لفظوں میں پاکستان کی تجویز منظور کر دی۔

حکیم اجمل خاں ــــــ ملت کے بے تاج بادشاہ

لیگ کے نظریہ میں یہ انقلابی تبدیلی فطری امر تھا اشتراک عمل کی جب تمام امیدیں منتشر ہوگئیں تو یہی معقول اور منطقی واحد حل تھا۔ پرائیویٹ طور پر مسٹر جناح نے ایک دو آدمیوں سے کہا کہ "پاکستان تجویز" ایک "شاطرانہ قدم" (Tactical) تھا مسٹر جناح اس کے چھ سال بعد بھی پاکستان کے علاوہ کسی دوسرے حل کو ماننے کے لئے آمادہ نظر آتے تھے اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ سنہ ۱۹۴۰ء کا ان کا "شاطرانہ قدم" واقعی ایک سیاسی دباؤ تھا جس سے وہ کانگریس سے زیادہ مراعات حاصل کرنا چاہتے تھے اور کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کو زیادہ روشن بنانا چاہتے تھے۔ ورنہ درحقیقت پاکستان جیسی کوئی جداگانہ ریاست بنانے کا ان کا کوئی خیال نہیں تھا یعنی کہ سنہ ۱۹۴۲ء تک بھی اس سلسلہ میں ان کے نظریات صاف نہیں تھے سر سکندر حیات خاں بھی اس تجویز سے پریشان تھے۔ وہ پاکستان کو پہلے سے ناپسند کرتے تھے وہ ہندو راج اور مسلم راج کے قطعی خلاف تھے وہ ایک صوبائی حکومت کے سربراہ اور ایک ایسی سیاسی پارٹی کے لیڈر تھے جس میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ سکھ اور ہندو بھی کافی تعداد میں شامل تھے سر سکندر حیات کے مسلمان پیروکار جو مسلم لیگ کے ممبر تھے ان کی وجہ سے چاہے رسمی طور پر ہی سہی ان کو پاکستان کی مانگ کی حمایت کرنی پڑی۔ اگرچہ ان میں سے بہت سے ذاتی طور پر پاکستان کے خلاف تھے۔ سر سکندر کے ہندو اور سکھ حامی تو پاکستان کے قطعی مخالف تھے ہی۔ سر سکندر نے پرائیویٹ طور پر پاکستان تجویز کو اپنے حامیوں کو اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ اس طرح کی جو ریاستیں وجود میں آئیں گی وہ کلیتاً ایک دوسرے سے آزاد ہوں گی۔ مگر پاکستان کی یہ تشریح مسٹر جناح کے پاکستان نظریہ سے قطعی ٹکراتی تھی۔

پنجاب کی طرح بنگال میں بھی مسلم وزیر اعظم بنگال فضل الحق دل سے پاکستان کے حامی نہ تھے۔ اگرچہ عوام میں وہ اس کی حمایت کرتے تھے۔ سر سکندر اور فضل الحق عجیب مخمصہ میں پھنس گئے تھے لیکن دونوں ہی جناح سے علیحدہ ہونے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ سر سکندر کا خیال تھا اور معقول خیال تھا کہ اگر وہ جناح کی کھلم کھلا مخالفت شروع کرتے ہیں تو پنجاب کے مسلمان تقسیم ہو جائیں گے۔ اور ان کا اثر ان پر سے ختم ہو جائے گا۔ اس لئے انہوں نے ظاہرا طور پر جناح کی حمایت کرنا مصلحت خیال کیا۔

سر سکندر حیات اور فضل الحق بلکہ کسی حد تک مسٹر جناح بھی پاکستان کے متعلق اپنے ذہن میں پوشیدہ خیال رکھتے تھے۔ عوام کے دلوں کی آواز تھی۔ سیاست اور حالات نے انھیں پاکستان کی مانگ کرنے پر مجبور کر دیا تھا، لیکن جو آواز بلند کی

صدر کانگریس مولانا ابوالکلام آزاد ـــــــ وزارتی مشن کے ارکان کے ساتھ

گئی تھی اس کو دبانا مشکل تھا۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں جو تجویز پیش کی گئی تھی اگرچہ وہ کافی مبہم تھی مگر اس نے مسلمانوں کے دلوں میں مسلم راج کا خواب جگا دیا ایک ایسا راج جہاں مسلمان اپنی قسمت کے مالک ہوں گے اس لئے پاکستان کا نعرہ بہت بڑی جذباتی اپیل رکھتا تھا وہ عوام کی امیدوں اور تمناؤں کے قریب تھا اس لئے جب یہ امیدیں اور تمنائیں، ایک بار جاگ گئیں تو ان کو دبانا مشکل تھا۔

بہت ممکن تھا کہ سنہ ۱۹۴۰ء کی پاکستان کی تجویز تک بات نہ پہونچتی بشرطیکہ سنہ ۱۹۳۷ء کے بعد کانگریسی رہناؤں نے جناح اور ان کے حامیوں کو ہموار کرنے کے لئے کچھ ایجابی قدم اٹھائے ہوتے ادھر جناح نے کانگریس کے خلاف پروپگنڈے کا آغاز کر دیا تھا اس لئے جو خلیج پیدا ہو گئی تھی وہ بڑھتی ہی گئی۔ اتحاد کے راستہ میں دوسری رکاوٹ یہ تھی کہ کانگریس دعویٰ کرتی تھی کہ وہ تمام جماعتوں اور فرقوں کی نمائندگی کرنے والی آل انڈیا جماعت ہے اس طرح مسٹر جناح کا دعویٰ تھا کہ لیگ ہندوستانی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اس لئے اس کو تسلیم کیا جانا چاہئے۔ کانگریس اس دعویٰ کو منظور نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ خود کانگریس کے اندر بہت سے ممتاز مسلمان رہنما جن میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے شامل تھے۔ مولانا آزاد سنہ ۱۹۴۰ء میں کانگریس کے صدر بنائے گئے۔ یہ متضاد دعوے بھی اتحاد کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔

جنگ کے شروع ہونے تک لیگ اور کانگریس میں مفاہمت کی صورت پیدا نہیں ہو سکی۔ اور جب جنگ شروع ہوئی تو یہ خلیج اور وسیع ہو گئی یہ تو ظاہر تھا کہ ہندوستان میں برطانوی راج چراغ سحری تھا۔ سوال صرف یہ تھا کہ ملک کے اتحاد کو کس طرح برقرار رکھا جائے۔ سنہ ۱۹۴۰ء کی لیگ کی تجویز اس اتحاد کے لئے ایک خطرہ بن گئی تھی۔ جنگ کے دوران متحدہ کوششیں اتحاد کی راہ ہموار کر سکتی تھیں۔ اگر کانگریس موجودہ دستور پر اتفاق کر لیتی تو مسلمانوں کے معتدل رہنما بخوشی اس کے ساتھ مرکز میں ایک متحدہ محاذ بنانے کے لئے تیار ہو جاتے اس کے بجائے کانگریس نے علیحدہ رہنے کا فیصلہ کر لیا وہ نہ برطانیہ کے ساتھ اور نہ مسلم لیگ کے ساتھ ہی کسی قسم کا تعاون کرنے کیلئے تیار تھی۔ اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء میں صوبوں کی کانگریس وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا اور بعد میں کانگریسی رہنما

جیلوں میں بھیج دیئے گئے۔ اب جناح اکیلے ہی میدان میں رہ گئے اور انھوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔

ہر نقطۂ نظر پر کانگریس کا رویہ بڑا افسوسناک رہا سوائے جنگ کے برطانوی حکومت نے بھی دونوں فرقوں میں مصالحت کی کوشش نہیں کی۔ پاکستان تجویز کے بعد بھی برطانوی حکومت نے لیگ کے ساتھ مصالحت کے لئے کانگریس پر کوئی زور نہیں ڈالا۔ تاہم دونوں حلقوں میں سنجیدہ عناصر ۱۹۴۰ء کی تجویز سے پریشان تھے اور انھوں نے خود اپنے لیڈروں سے آزادانہ لیگ اور کانگریس میں مصالحت کی کوشش کی۔ سر سکندر نے ۱۹۴۲ء میں کانگریس کے دائیں بازو کے لیڈروں جیسے راج گوپال آچاریہ کے پاس مصالحت کے لئے اپنے آدمی بھیجے۔ انھوں نے اس بات کا یقین دلایا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جناح کا ساتھ چھوڑنے کے تیار ہیں بشرطیکہ کانگریس ان کی حمایت کرے۔ مگر یہ کوششیں بھی ناکام ہوگئیں۔

ایک سال بعد جب جاپان ہندوستان پر حملہ کے لئے تیار تھا برطانیہ نے ان دونوں پارٹیوں میں اتحاد پیدا کرنے کی آخری کوشش کی۔ مارچ ۱۹۴۲ء میں سر اسٹیفورڈ کرپس ہندوستان آئے ان کا مشن بھی ناکام ہوگیا اور کانگریس لیگ کو ایک دوسرے کو قریب لانے کی یہ کوشش بھی بے سود ثابت ہوئی۔ کانگریس ڈومینین اسٹیٹس کو قبول کرنے کے تیار نہ تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کے نقطۂ نظر سے صورت حال کا یہ پہلو کافی اہم تھا کیونکہ پہلی بار برطانوی حکومت نے تقسیم کے امکانات کو تسلیم کیا۔ یہ مسٹر جناح کی ذاتی فتح تھی اس فتح نے ان کی پوزیشن کو مضبوط کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ مسلمان جو پاکستان نہیں چاہتے تھے وہ بھی جناح کی حمایت کرنے میں اپنی اہمیت محسوس کرنے لگے۔

گاندھی جی سر کرپس کی تجاویز کو رد کرنے کے ذمہ دار تھے۔ نہ صرف انھوں نے ان تجاویز کو رد کیا بلکہ انھوں نے مانگ کی کہ برطانیہ کو فوراً ہندوستان چھوڑ دینا چاہئے۔ اس کا نتیجہ چاہے انارکی ہو یا ـــ ہندوستان جاپانیوں کے ہاتھ میں چلا جائے ایک جری اور ممتاز کانگریسی راج گوپال آچاریہ ـــ سابق وزیر اعلیٰ مدراس اور گاندھی جی کے پرانے ساتھی ـــ نے ایک نہایت جرأتمندانہ قدم اٹھایا۔ وہ بہت عرصہ سے مسلم لیگ اور برطانیہ کے بارے میں کانگریس کے منفی اور غیر حقیقی رویہ سے پریشان تھے ان کا خیال تھا کہ کرپس تجاویز کی بنیاد پر اتحاد قائم کیا جا سکتا ہے مگر گاندھی کے سامنے ان کی بات پر کان نہ دھرا گیا۔ گاندھی جی کے تباہ کن اور غیر ذمہ دارانہ رویہ سے گھبرا کر اب انھوں نے کھلم کھلا "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کی مخالفت شروع کردی ان کی دلیل تھی کہ برطانیہ کو اس خطرناک موڑ پر ہندوستان نہیں چھوڑنا چاہیے۔ کیونکہ اسوقت کوئی مضبوط متبادل حکومت موجود نہیں ہے۔ ان کے خیال میں اگر ایسا ہوا تو ہندوستانی سوسائٹی منتشر ہو جائے گی یہ ایک سمجھداری کی بات تھی جناح اور لیگ کے متعلق بھی انھوں نے سمجھداری کا معاملہ کیا۔ مارچ ۱۹۴۲ء میں انھوں نے کانگریس کے سامنے پاکستان کی مانگ کو مان لینے کی تجویز رکھی۔ اس وقت ان کی سیاسی بصیرت کو کسی نے نہ سراہا ان کی تجویز نہ صرف رد کردی گئی بلکہ ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی گئی اور راجہ جی کو کانگریس سے استعفیٰ دینا پڑا۔

آج بہت کم لوگ ہیں جو اس حقیقت سے انکار کریں گے کہ کانگریس نے اگر ان کی تجویز کو مان لیا ہوتا تو اچھا تھا۔ کیونکہ ۱۹۴۲ء میں زیادہ تر لیگی لیڈر یہاں تک کہ جناح بھی دلی طور پر تقسیم کی خواہش نہیں رکھتے تھے اور اگر اصولی طور پر پاکستان کو تسلیم کر لیا جاتا تو اس سے باہمی مصالحت کا راستہ ہموار ہو سکتا تھا۔

لیکن سمجھداری کی آواز کسی نے نہیں سنی۔ کانگریس اندھا دھند گاندھی جی کی آواز کے پیچھے چل رہی تھی اور اس نے اس طرح ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑ دو تحریک" کا آغاز کر دیا۔ تمام کانگریسی رہنما گرفتار کر لئے گئے اور ان کو جیل میں ڈال دیا گیا جب وہ تین سال بعد رہا ہو کر باہر آئے تو انھوں نے دیکھا کہ مسٹر جناح ایک ناگزیر طاقت بن گئے ہیں اور تقریباً ہندوستان کے پورے مسلمان ایک چٹان کی طرح ان کے پیچھے کھڑے ہیں ● ●

شرط
چوتھی قسط
اے جبار

اب تک کی کہانی: مسٹر فوگ ایک پراسرار اور سنکی انگریز تھے، لندن کے بینک آف انگلینڈ میں پچاس ہزار پاؤنڈ کی چوری کے بعد چور کے فرار پر قیاس آرائی کرتے ہوئے ریفارم کلب میں انہوں نے اپنے دوستوں سے شرط لگائی کہ محض اسی روز کے اندر دنیا کے گرد چکر لگایا جاسکتا ہے، جبکہ اس زمانے میں ہوائی جہاز بھی ایجاد نہ ہوا تھا اور ریلیں بھی دنیا کے چند ممالک میں ہی تھیں، چنانچہ بیس ہزار پاونڈ کی شرط لگا کر مسٹر فوگ اپنے فرانسیسی ملازم پاسے پرٹاؤٹ کے ہمراہ دنیا کے سفر پر روانہ ہوگئے ــــــ ان کی روانگی کے چند روز بعد بینک آف انگلینڈ کے چور کی تلاش میں گئے ہوئے جاسوسوں میں سے فکس نامی ایک جاسوس نے لندن کی پولیس کو بندر سعید سے تار روانہ کیا کہ وہ بینک ڈکیت فلیس فوگ کا تعاقب کر رہا ہے لہٰذا اس کا وارنٹ گرفتاری روانہ کر دیا جائے، چونکہ وارنٹ بروقت نہ آسکا اس لئے جاسوس کو مسٹر فوگ کے تعاقب میں بمبئی تک سفر کرنا پڑا بمبئی چند گھنٹے قیام کے دوران ان کا ملازم مالابار مندر میں جوتوں سمیت داخل ہوگیا اور پجاریوں کے شور مچانے پر بمشکل جان بچا کر وہاں سے بھاگا، مسٹر فوگ اس کے ہمراہ بمبئی سے کلکتے جانے والی ٹرین پر سوار ہوئے جو راستے میں ریلوے لائن نہ ہونے کی وجہ سے رک گئی۔ کلکتے کے لئے دوسری ٹرین الٰہ آباد سے ملنی تھی جو وہاں سے پچاس میل تھا، اس سفر کے لئے مجبوراً مسٹر فوگ کو دو ہزار پاؤنڈ کی کثیر رقم سے ایک ہاتھی خریدنا پڑا تب وہ الٰہ آباد کے لئے روانہ ہوئے ــــــــ اب آگے پڑھئے

راستہ کم کرنے کی غرض سے مہاوت نے ہاتھی کو جنگلات کی طرف موڑ دیا، اس کے بیان کے مطابق اس راستے سے سفر کرنے پر وہ بیس میل بچا سکتے تھے، چند گھنٹوں تک سفر کرنے کے بعد مہاوت نے ہاتھی کو ایک صاف جگہ روک دیا تاکہ اسے اور سواریوں کو سستانے کا موقع مل سکے۔ مہاوت کے اس اقدام پر بریگیڈیر جنرل سر فرانسیس نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ اب تک کے مختصر سفر سے ہی اس کے جوڑوں میں درد ہونے لگا تھا۔ اس کے برعکس مسٹر فوگ بالکل تازہ دم نظر آتے تھے۔ یہ شخص شاید فولاد کا بنا ہوا ہے، جنرل نے سوچا ــــــ دوپہر کو مہاوت نے دوبارہ سفر جاری کیا۔ ہاتھی کبھی گھنے جنگلات اور کبھی چھوٹے چھوٹے میدان عبور کرتا رہا۔ بندیل کھنڈ کا یہ علاقہ بہت خطرناک سمجھا جاتا تھا کیونکہ یہاں کی بیشتر آبادی "ٹھگ" فرقے پر مشتمل تھی، اس لئے مہاوت قصداً ہاتھی کو آباد علاقوں سے بچاتا ہوا لے جارہا تھا، چونکہ دن کا وقت تھا۔ اس لئے جنگل میں بہت کم جانور نظر آرہے تھے، البتہ وہاں بندر کافی تعداد میں تھے جنہیں دیکھ کر پاسے پرٹاؤٹ بے حد محظوظ ہو رہا تھا لیکن اسے ایک فکر لاحق ہوگیا تھا اور وہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ الٰہ آباد پہنچنے پر ہاتھی کا کیا کیا جائے گا، کیا مسٹر فوگ کئی ٹن وزنی اس جانور کو بھی اپنے ساتھ دنیا کے سفر پر لے جائیں گے یا پھر الٰہ آباد میں اسے آزاد چھوڑ دیا جائے گا۔ اس مسئلے کا کوئی حل اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

رات ہوگئی تھی اور سردی بہت تیز تھی، ہوندھیاچل

پہاڑوں کو عبور کرنے کے بعد انہیں کسی قدیم حویلی کا کھنڈر نظر آیا جسے دیکھ کر مہاوت نے ہاتھی کو روک لیا اور پھر اس نے اور فرانسیسی ملازم نے ایک جگہ صاف کر کے سب سے پہلے آگ روشن کی تاکہ سردی کا احساس کچھ کم ہو، اس کے بعد مہاوت نے کھانا تیار کیا جسے کھا کر مسٹر فوگ، سر فرانسیس اور پاسے پارٹاؤٹ گھاس پھوس پر اپنے مختصر بستر بچھا کر سو گئے۔ خود مہاوت ہاتھی اور مسافروں کی نگہبانی کے لئے تمام رات جاگتا رہا۔ صبح چھ بجے سفر دوبارہ جاری کر دیا گیا۔ مہاوت کا خیال تھا کہ وہ شام تک الٰہ آباد پہنچ جائیں گے اور اس طرح مسٹر فوگ کے بچت کے دو دنوں میں سے صرف چند گھنٹے ہی ضائع ہوں گے۔ دوپہر کو یہ مسافر موضع کالنگر پہنچے۔ اب الٰہ آباد صرف بارہ میل رہ گیا تھا۔ دوپہر کے دو بجے ہاتھی ایک بہت گھنے جنگل میں داخل ہوا سفر سکون اور عافیت سے جاری تھا اور امید تھی کہ اس کا اختتام بھی بعافیت ہی ہو گا لیکن ——— چار بجے کے قریب ہاتھی چلتے چلتے اچانک رک گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی چیز سے خائف ہو ——— کیا معاملہ ہے؟ سر فرانسیس نے مہاوت سے دریافت کیا ——— کچھ پتہ نہیں جناب ——— لیکن سنئے شاید کسی شور کی آواز آ رہی ہے۔ سب نے کان لگا کر سنا۔ اتنی دیر میں آوازیں واضح طور پر سنائی دینے لگیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے بہت سے لوگ زور، زور سے گاتے اور تانبے پیتل کے برتن بجاتے ہوئے اس طرف آ رہے ہوں۔

پاسے پرٹاوٹ کے کان کھڑے ہو گئے، لیکن مسٹر فوگ سکون کے ساتھ خاموش بیٹھے رہے، اچانک مہاوت ہاتھی پر سے کود کر نیچے اترا اور جلدی سے ہاتھی کی گردن میں بندھی ہوئی زنجیر کو ایک قریبی درخت کے تنے سے باندھ کر جنگل میں اس طرف چل دیا جس سمت سے آوازیں آ رہی تھیں اور پھر پانچ منٹ کے اندر، اندر ہی واپس لوٹ آیا ——— صاحب برہمنوں کا ایک جلوس اس طرف آ رہا ہے۔ مناسب یہی ہے کہ وہ لوگ ہمیں نہ دیکھنے پائیں، یہ کہکر اس نے ہاتھی کو درخت سے کھولا اور اسے زیادہ گھنے درختوں اور جھاڑیوں کی طرف لے گیا، اس کے بعد وہ خود بھی ہاتھی کی گردن پر آ بیٹھا تاکہ غیر معمولی حالات پیش آ جانے کی صورت میں فوراً ہی ہاتھی کو ہانک سکے۔ اس کا خیال تھا کہ جلوس انہیں دیکھے بغیر گذر جائے گا۔

شور قریب آتا گیا۔ آوازیں شاید بین کرنے کی تھیں جو ڈھول، نقارے اور جھانجھ کے ساتھ مل کر اس نیم تاریک جنگل کے ماحول کو زیادہ وحشتناک بنا رہی تھیں۔ اس کے بعد جلد ہی درختوں کی اوٹ سے پورا جلوس نظر آنے لگا۔ شاید پچاس آدمی ہوں گے جن میں سے کچھ جو جلوس کے آگے تھے پجاری تھے جن کے ماتھے پر لمبے لمبے تلک لگے ہوتے تھے۔ انہوں نے گیروے رنگ کے چغے پہنے ہوئے تھے۔ پجاریوں کے پیچھے مرد، عورتیں اور بچے تھے جو زور، زور سے کچھ گاتے جا رہے تھے اور ساتھ ہی ڈھول اور جھانجھ بجاتے جاتے تھے، ان کے پیچھے غیر معمولی طور پر اونچے پہیوں والی ایک گاڑی تھی۔ اس گاڑی پر دونوں طرف شیروں کے مجسمے نصب تھے اور بیچ میں ایک خوفناک مورتی استیادہ تھی' اس کے چار ہاتھ تھے اور جسم پر سیاہ رنگ کیا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں مشعل کی طرح روشن تھیں اور سرخ رنگ کی زبان دہانے سے باہر لٹکی ہوئی تھی۔ گلے میں انسانی کھوپڑیوں کا ہار تھا اور دو ہاتھوں میں انسانی سر تھے۔ سر فرانسیس اس مجسمے کو اچھی طرح پہچانتا تھا ——— "کالی" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا ——— یہ کالی دیوی کا مجسمہ ہے۔ جنرل نے کہا ——— جو موت اور عشق کی دیوی ہے ——— موت ——— مان لیا، پاسے پرٹاوٹ نے دھیرے سے کہا لیکن عشق ———؟ "منہ بند رکھو" مہاوت نے اسے ڈانٹا ——— کالی کے مجسمے کے گرد فقیروں کا ایک غول تھا۔ ان سبھوں نے

اپنے جسموں پر راکھ مل رکھی تھی اور ان کی جٹائیں بکھری ہوئی تھیں ــــ فقیروں کے پیچھے کچھ برہمن تھے جو ایک سجی بنی اور انتہائی حسین عورت کو سہارا دیئے چل رہے تھے، عورت پر غنودگی سی طاری تھی وہ بمشکل اپنے قدموں سے چل پا رہی تھی اس کی جلد کی رنگت کسی یورپین عورت کی طرح سفید تھی اس کا سر، گردن، شانے، کان، بازو، ہاتھ اور پاؤں کی انگلیاں غرض سارا جسم بے شمار قیمتی زیورات سے سجا ہوا تھا چہرے پر سنہری جھالر والا انتہائی باریک ململ کا نقاب تھا لیکن حسن کے اس جیتے جاگتے مجسمے کے پیچھے ایک بھیانک تضاد نظر آرہا تھا ــــ ایک سنہری پالکی میں مسلح گارڈ ایک بوڑھے آدمی کے مردہ جسم کو اٹھائے ہوئے تھے جو قیمتی لباس، اور بیش قیمت جواہرات پہنے ہوئے تھا۔ لاش کے سر پر جواہرات کی مالاؤں سے سجی ہوئی قیمتی پگڑی تھی۔ پالکی کے عقب میں فقیروں کا ایک اور غول تھا جو اتنے زور و شور سے بین اور آہ و زاری کر رہا تھا کہ جس کی آواز میں ڈھول تاشوں کی آواز دب کر رہ گئی تھی

سر فرانسیس نے مایوس نگاہوں سے یہ تماشہ دیکھا اور رندھی ہوئی آواز میں مہاوت سے کہا ــــ ستی ــــ؟ جواب میں پارسی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جلوس اس مقام سے گذر کر بتدریج دور ہوتا گیا، آوازوں کا شور مدھم ہوتے ہوئے ڈوب گیا اور آخر میں سارے ماحول پر ایک دل گداز خاموشی چھا گئی۔

مسٹر فوگ نے سر فرانسیس کی زبان سے نکلا ہوا لفظ، ستی سُن لیا تھا۔ لہٰذا انہوں نے جنرل سے دریافت کیا کہ "ستی" کسے کہتے ہیں ــــ "انسانی قربانی کو" ــــ جس خاتون کو آپ ابھی دیکھ چکے ہیں، اسے صبح دن نکلنے سے قبل ہی زندہ جلا دیا جائے گا ــــ یہ کیسے ہو سکتا ہے، پاسے پرٹاوٹ نے تقریباً چیختے ہوئے کہا ــــ اور وہ مردہ لاش کس کی تھی، مسٹر فوگ نے دریافت کیا ــــ یہ اس خاتون کے شوہر کی لاش تھی جو بندھیل کھنڈ کا راجہ تھا۔ اس لاش کے ساتھ ہی اس عورت کو جلایا جائے گا۔ پارسی مہاوت نے مسٹر فوگ کو بتایا۔

کیا ــــ؟ فلیس فوگ نے غصہ اور حیرت سے کہا، کیا یہ وحشیانہ رسم اب تک ہندوستان میں رائج ہے، کیا برطانوی حکومت نے اس کے سلسلے میں کچھ نہیں کیا ــــ کچھ علاقوں میں بے شک اس رسم کا خاتمہ کر دیا گیا ہے لیکن اس علاقے میں اب تک اس پر عمل کیا جاتا ہے۔

بڑی بدنصیبی کی بات ہے۔ پاسے پرٹاوٹ بڑبڑایا ــــ زندہ جل جانا ــــ چہ چہ ــــ لیکن صاحب یہ عورت جل جانے پر آمادہ نہیں ہے، پارسی نے بتایا، سارا بندیل کھنڈ اس حقیقت سے واقف ہے ــــ لیکن یہ تو ذرا بھی مزاحمت نہیں کر رہی تھی ــــ وہ اس لئے جناب کہ غریب کو بھنگ اور افیون پلا دی گئی ہے، وہ اپنے ہوش میں ہی نہیں۔ اب اسے یہاں سے دو میل کے فاصلے پر پلاجی کے مندر پر لے جایا جا رہا ہے جہاں رات بھر قیام کر کے مہورت کے مطابق علی الصباح اسے جلا دیا جائے گا۔ یہ کہہ کر مہاوت نے ہاتھی کو ہانک دیا۔

کیا خیال ہے۔ اگر ہم لوگ اس مظلوم خاتون کو بچانے کی کوشش کریں ــــ مسٹر فوگ نے کہا ــــ کیا فرمایا ــــ عورت کو بچانے کی کوشش کریں، سر فرانسیس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا ــــ بے شک، میرے پاس بارہ گھنٹے فالتو ہیں۔ مسٹر فوگ نے پرسکون انداز میں کہا، اگر یہ کسی انسان کی جان بچانے کی کوشش میں ضائع بھی ہو جائیں تو مجھے کوئی ملال نہ ہوگا ــــ مسٹر فوگ، کیا آپ کے سینے میں بھی ایک انسان کا دل ہے ــــ جنرل

نے حیرانگی سے کہا ۔۔۔۔۔ "

کبھی کبھی، سر فرانسیس، جب میرے پاس اس کے لئے وقت ہو ۔۔۔۔۔ اور پھر جلد ہی ایک پلان بنایا گیا جو نہ صرف مشکلات سے بھرپور تھا بلکہ شاید ناقابل عمل بھی لیکن اسے عمل میں لانے کے لئے فلیس فوگ نے نہ صرف اپنی زندگی سے جوا کھیلا بلکہ اپنے سفر کی کامیابی بھی داؤں پر لگا دی، سر فرانسیس بھی دل و جان سے مسٹر فوگ کا ساتھ دینے پر آمادہ تھا۔ پارسی پرٹائوٹ کی وفاداری، تو تمام شکوک سے بالا تھی ہی۔ اب اس سلسلے میں مہاوت کی رائے معلوم کی گئی، کیونکہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ ممکن ہے وہ ہندوستانی ہونے کے ناطے اپنے ہم وطنوں یعنی ستی کرنے والوں سے ہمدردی رکھتا ہو۔ لیکن پارسی نے بڑے خلوص سے ان لوگوں کو بتا دیا کہ ستی ہونے والی خاتون، اس کی ہم مذہب یعنی پارسی ہی ہے اس لئے اس کی تمام ہمدردیاں مسٹر فوگ کے ساتھ ہیں جو اس کی ہم مذہب کو جبریہ ستی سے بچانے کا کار خیر انجام دینا چاہتے ہیں ۔۔۔۔ مہاوت کا جواب سن کر مسٹر فوگ کو اطمینان ہوا اور انہوں نے اس سے کہا ۔۔۔۔ تمہارا رویہ انسانیت کے اصول کے مطابق اور بالکل صحیح ہے۔۔۔

لیکن ۔۔۔۔ مہاوت بولا ۔۔۔۔ میں آپ کو آگاہ کرتا ہوں کہ اس کام میں نہ صرف جان ہی کا خطرہ ہے بلکہ پکڑے جانے کی صورت میں انتہائی وحشیانہ سزائیں بھی برداشت کرنی پڑیں گی، لہٰذا ہمیں بہت محتاط رہ کر اپنا کام کرنا چاہئے ۔۔۔۔ ٹھیک ہے مسٹر فوگ نے کہا ۔۔۔۔ ہمیں رات ہونے کا انتظار کرنا چاہئے ۔۔۔۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ مہاوت نے کہا۔

اس کے بعد مہاوت نے ان لوگوں کو اس ستی کے متعلق مزید معلومات بہم پہنچائیں۔ جس خاتون کو ستی کیا جا رہا تھا وہ بمبئی کے ایک پارسی بیوپاری کی لڑکی تھی اور بہت خوبصورت تھی، دولت مند ہونے کی وجہ سے اس کے باپ نے اس کی تعلیم و تربیت انگریزی طرز پر کی تھی جس کے سبب وہ ہندوستانی کے بجائے یورپین نظر آتی تھی۔ اس کا نام "ادا" تھا اور چونکہ وہ یتیم ہو گئی تھی۔ اس لئے اس کے عزیزوں نے اسکی مرضی کے خلاف بندیل کھنڈ کے بوڑھے راجہ کے ساتھ اس کی شادی کر دی تھی۔ شادی کے تین ماہ بعد ہی راجہ کا انتقال ہو گیا اور چونکہ اسے معلوم تھا کہ اسے ستی کر دیا جائے گا اس لئے راجہ کے انتقال کی رات ہی وہ محل سے فرار ہو گئی لیکن بد قسمتی سے پکڑ لی گئی، چونکہ راجہ کے رشتہ داروں کو اس کے ستی ہو جانے کی صورت میں لاکھوں روپے کا فائدہ پہنچتا تھا اس لئے وہ مہارانی "ادا" کو جلد از جلد ستی کر دینا چاہتے تھے

مہاوت کی زبانی یہ داستان سن کر فلیس فوگ اور جنرل دونوں کے عزائم اور پختہ ہو گئے اور انہوں نے ہر قیمت پر مظلوم عورت کو ستی ہونے سے بچانے کا تہیہ کر لیا ۔۔۔۔

آدھ گھنٹے بعد مہاوت نے ہاتھی کو پلاجی کے مندر سے پانچ سو قدم اس طرف گھنے درختوں میں باندھ دیا۔ اس مقام سے مندر تو نظر نہیں آ رہا تھا البتہ ستی کے جنونیوں کی دھیمی دھیمی آوازیں ضرور آ رہی تھیں ۔۔۔۔ اب مظلوم عورت تک پہنچنے کے طریقے پر غور کیا گیا، مہاوت مندر کے اس حصے سے بخوبی واقف تھا جہاں راجہ کی نوجوان بیوہ کو رکھا گیا تھا وہاں تک پہنچنے کے دو ہی طریقے تھے یا تو وہاں تک صدر دروازے سے پہنچا جا سکتا تھا بشرطیکہ پہرے دار سو گیا ہو یا پھر مندر کی پچھلی دیوار میں نقب لگا کر، بہرحال یہ کوشش دن نکلنے سے قبل ہی کی جانی تھیں کیونکہ صبح صادق تک تو ستی کی رسم ادا کر دی جائے گی۔

فلیس فوگ اور ان کے ساتھیوں نے رات کے گیارہ

بجے تک انتظار کیا۔ اس وقت تک فقیروں کی آہ و زاری اور ان کے ساتھیوں کے بین کرنے کی آوازیں ڈوب چکی تھیں۔ ماحول پر ایک پراسرار خاموشی طاری ہو گئی تھی شاید بھنگ اور افیون کا نشہ اپنا کام کر گیا تھا جس کے نتیجے میں سارے جنونی سو گئے تھے پارسی کی رہنمائی میں دومنٹ تک ۔۔۔ گھنے درختوں میں گز بہ قدم چلنے کے بعد وہ لوگ ایک دریا کے کنارے پہنچے۔ کچھ فاصلے پر ایک مشعل جل رہی تھی۔ اس کی روشنی میں انہوں نے صندل کی لکڑیوں کا بہت بڑا ڈھیر دیکھا یہی بندیل کھنڈ کے راجہ کی چتا تھی۔ اس چتا میں لکڑیوں کے اندر راجہ کی لاش رکھی نظر آرہی تھی ۔۔۔ اس جگہ سے سو قدم کے فاصلے پر بلاجی کا مندر تھا جس کی چوٹی اونچے درختوں سے بھی بلند تھی اور دور سے نظر آرہی تھی ۔۔۔ چلے آیئے ۔۔۔

پارسی نے دھیمے اور محتاط لہجے میں کہا چنانچہ یہ لوگ بڑی احتیاط سے گھاس میں جھکے جھکے آگے بڑھتے رہے۔ مہاوت جلد ہی ایک جگہ پہنچ کر رک گیا۔ وہیں تھوڑی دور پر بھنگ کے نشے اور نیند میں چور فقیروں کا ایک غول خراٹے لیتا ہوا، پیٹ کے بل سو رہا تھا ۔۔۔ اب مندر بھی ان کی نگاہوں کے سامنے تھا لیکن پارسی یہ دیکھ کر ٹھٹک گیا کہ راجہ کے باڈی گارڈ مندر کے دروازے پر ننگی تلواریں لئے مستعدی سے پہرہ دے رہے تھے۔ نیند ان سے کوسوں دور تھی۔ اندر سے آنے والی آوازوں سے پتہ چلتا تھا کہ مندر میں پجاری بھی جاگ رہے ہیں۔ چنانچہ یہ پارٹی اُلٹے پیروں جھاڑیوں میں واپس لوٹ آئی ۔۔۔ ممکن ہے پہرے دار کچھ دیر بعد سو جائیں ۔۔۔ فلیس فوگ نے کہا ۔۔۔ اس کا امکان تو ہے ۔۔۔ مہاوت نے پرامید لہجے میں کہا اور پھر سب مناسب وقت کا انتظار کرنے لگے لیکن آدھی رات گذر جانے کے بعد بھی پہرے دار جاگتے رہے ۔۔۔ میرا خیال ہے پہرے دار بھنگ کا نشہ نہیں کرتے۔ پاسے پرٹاؤٹ نے بے بسی سے کہا۔

وقت کم رہ گیا تھا اور دن نکلنے سے پہلے کچھ کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ مندر کی عقبی دیوار میں نقب لگانے کی کوشش کی جائے، لیکن ان لوگوں کے پاس ایسا کوئی اوزار نہ تھا جس سے یہ کام کیا جاتا۔ البتہ دو چاقو ضرور تھے۔ ان کی مدد سے دیوار کی ایک اینٹ نکال لینا ممکن نظر آتا تھا۔ اس کے بعد اس سوراخ کو بڑا کر لینا زیادہ دشوار نہ ہوگا۔ چنانچہ ایک چاقو کی مدد سے نہایت آہستگی اور احتیاط سے کام شروع کیا گیا لیکن ابھی دیوار کا تھوڑا سا پلستر ہی ادھیڑا گیا تھا کہ اچانک مندر کے اندر سے ایک آواز بلند ہوئی جس کا جواب فوراً ہی دروازے پر کھڑے ہوئے پہرے دار نے دیا۔ موقع نازک تھا۔ اس لئے چاروں آدمی دوڑ کر جھاڑیوں میں واپس آگئے جہاں سے تھوڑی دیر بعد انہوں نے دیکھا کہ کچھ پہرے دار مندر کی چھت پر چڑھ کر چاروں طرف دیکھ رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد وہ جھانک کر عقبی دیوار کا جائزہ بھی لینے لگے۔ ان حالات کی موجودگی میں دوبارہ مندر کی دیوار میں نقب لگانے کی کوشش کرنا خودکشی کے مترادف ہوتا۔ اس لئے مظلوم عورت کی جان بچانے کے امکانات تاریک تر ہو گئے۔

بریگیڈیر جنرل دانتوں سے اپنی انگلیوں کے ناخن کاٹ رہا تھا۔ پاسے پرٹاؤٹ مٹھیاں بھینچ بھینچ کر مندر کی جانب اشارے کر رہا تھا۔ مہاوت بھی بے چین نظر آرہا تھا لیکن مسٹر فوگ ہمیشہ کی طرح پرسکون تھے۔ اب یہاں سے رخصت ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا ۔۔۔ بریگیڈیر جنرل نے مایوس ہو کر کہا ۔۔۔ ابھی ہمیں اور انتظار کرنا چاہئے مسٹر فوگ نے کہا ۔۔۔ مجھے کل دوپہر تک ہی الٰہ آباد پہنچنا ہے ۔۔۔ کیا اب بھی آپ کو کوئی امید نظر آتی ہے۔

جنرل نے ان سے کہا ـــــ محض چند گھنٹوں بعد ہی دن کی روشنی پھیل جائے گی اور پھر ـــــ کیا معلوم جس موقع کے ہم منتظر ہیں وہ ہمیں بالکل آخری وقت میں ہی مل جائے، مسٹر فوگ نے پرامید لہجے میں جنرل کو جواب دیا۔

بریگیڈیر جنرل سوچنے لگا کہ یہ پرسکون انگریز نہ جانے کیا جوا کھیلنا چاہتا ہے۔ کیا اس کا ارادہ اس عورت کو جلتی ہوئی چتا سے اتار لانے کا ہے۔ یہ تو کھلا ہوا پاگل پن ہو گا۔ کیا فلیس فوگ نے اتنا بڑا خطرہ مول لینے کا ارادہ کرلیا ہے لیکن ان تمام خیالات کے باوجود وہ ہر قسم کے حالات میں فلیس فوگ کا ساتھ دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔

جہاں وہ لوگ کھڑے تھے۔ مہاوت کے کہنے پر اس جگہ سے گھنے درختوں میں جاکھڑے ہوئے۔ کیونکہ یہ مقام نسبتاً زیادہ محفوظ تھا۔ مسٹر فوگ اور بریگیڈیر جنرل بالکل مستعد کھڑے تھے مہاوت ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، پاسے پر ٹاوٹ بھی ایک قریبی درخت کی شاخ پر جا بیٹھا۔ چند لمحوں بعد ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے اس کے دماغ میں آیا اور اس نے فوراً ہی اسے عملی جامہ پہنانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ وہ ایک سانپ کی سی آہستگی سے درخت کی شاخ سے پھسل کر جھاڑیوں کی سمت رینگ گیا۔

کئی گھنٹے انتظار میں گزر گئے۔ صبح صادق کی روشنی نمودار ہونی شروع ہوئی۔ جنگل میں اب بھی رات کا سا ہی اندھیرا تھا ـــــ ستی کی مہورت کا وقت آ پہنچا ہونے والے جماہیاں لیتے ہوئے اٹھنے لگے، بھنگ اور افیوں کے نشے ٹوٹ رہے تھے۔ ڈھول بجنے شروع ہوئے۔ شور اٹھا اور بھجنوں کا آغاز ہوا۔ مندر کے دروازے کھول دیئے گئے، سرفرانسیس اور فلیس فوگ نے پتوں کی اوٹ سے دیکھا کہ مندر کے دو پجاری مظلوم عورت کو کاندھوں سے پکڑے بلکہ لٹکائے ہوئے مندر سے باہر لا رہے ہیں۔ ان کے چہروں سے درندگی عیاں تھی ـــــ سرفرانسیس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے تشنجی انداز میں مسٹر فوگ کا ہاتھ پکڑا اور یہ محسوس کر کے چونک اٹھا کہ ان کے ہاتھ میں لمبے پھل کا ایک کھلا ہوا چاقو تھا۔

تقریب ستی میں شریک ہونے والے سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، بدنصیب عورت ابھی تک افیوں کے نشے کے زیر اثر تھی، وہ نیند کی حالت میں چلنے والے کسی انسان کی مانند، دو رویہ کھڑے ہوئے برہمنوں، فقیروں اور راجہ کے عزیزوں کے درمیان سے گذر رہی تھی فلیس فوگ، مہاوت اور سرفرانسیس آہستگی سے اس جلوس کے پیچھے پیچھے ہو لئے، فقیروں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر عورت کے استقبال میں کچھ کہنا شروع کیا ـــــ چتا سے پچاس قدم کے فاصلے پر فلیس فوگ اور ان کے ساتھی رک گئے۔ چتا پر راجہ کے جسم کے قریب ہی اس کی زندہ بیوہ کو لٹا دیا گیا ـــــ اس کے بعد تیل میں تربتر صندل کی لکڑی کو جلتی ہوئی مشعل دکھائی گئی جس کے ساتھ ہی آگ کے شعلے بلند ہو گئے عین اس وقت مسٹر فوگ نے چتا کی طرف دوڑنے کی کوشش کی لیکن مہاوت اور سرفرانسیس نے زبردستی انہیں روک لیا جس پر انہوں نے اپنی پوری طاقت لگا کر خود کو پارسی اور جنرل کی گرفت سے آزاد کرانا چاہا ـــــ لیکن اچانک ہی منظر بدل گیا پجاری چیخ مارتے ہوئے بدحواس ہو کر بھاگے ـــــ کیا راجہ زندہ تھا ـــــ؟ وہ ایک روح کے انداز میں چتا سے اٹھا اور اپنی نوجوان بیوی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے سہارا دیتا ہوا، آگ کے شعلوں سے گزر کر چتا سے نیچے اتر آیا۔ ستی کے رسیا چیخیں مارنے لگے۔ فقیر، سپاہی، پجاری اور تماش بین، سب خوف سے مفلوج ہو کر رہ گئے تھے وہ سب

اوندھے منہ زمین پر لیٹ گئے، جیسے کسی دیوتا کے قدموں میں گر گئے ہوں۔ انہوں نے خوف سے اس طرح اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں گویا یہ مافوق الفطرت نظارہ دیکھنے کی ان میں تاب نہ ہو۔ جلد ہی راجا اپنی بیوی کے ہمراہ اس جگہ آ پہنچا جہاں فلیس فوگ اور ان کے ساتھی حیران و پریشان کھڑے تھے اور آہستہ سے بولا ——— بھاگئے مالک، جتنی جلدی ہو سکے اس منحوس جگہ سے بھاگ چلئے۔

یہ پاسے پرٹاوٹ تھا جس نے جان ہتھیلی پر رکھ کر اتنے خطرناک اور اتنی بڑی تعداد میں سفاک اور درندہ صفت لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک دی تھی۔ درخت کے تنے سے پھسل کر وہ چھپتا چھپاتا چتا تک جا پہنچا تھا۔ اور چونکہ ستی کرنے والے اس طرف سے بالکل مطمئن اور غافل تھے اس لئے بڑی آسانی اور بہت پھرتی سے راجہ کی لاش سے اس کا چغہ اور پگڑی اتار کر خود پہن لئے تھے اور پھر لاش کو لکڑیوں کی آڑ میں دھکیل کر اس کی جگہ خود چتا پر لیٹ گیا تھا اور پھر چتا میں آگ لگ جانے پر انتہائی بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مظلوم خاتون کو یقینی موت کے منہ سے نکال لایا تھا۔

چند لمحوں بعد چاروں آدمی اپنے حسین بوجھ سمیت جنگل میں غائب ہو گئے۔ ہاتھی بہت تیز رفتار سے چلتا ہوا اپنی سواریوں کو بہت دور لے جا چکا تھا ——— کافی دور نکل جانے کے بعد انہوں نے اپنے پیچھے شور مچانے اور فائرنگ کی آوازیں سنیں اور پھر فوگ کے ہیٹ میں سوراخ کرنے والی بندوق کی گولی نے ثابت کر دیا کہ ان کا راز فاش ہو چکا ہے اور ان کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ چتا کے اوپر کی لکڑیاں جل جانے کے بعد پجاریوں کو راجہ کا مردہ جسم نظر آ گیا تھا جس پر انہیں احساس ہوا کہ کوئی ان کے ساتھ زبردست دھوکہ کر کے ستی کو بچا لے گیا چنانچہ فوراً ہی مسلح دستے نے مسٹر فوگ کی پارٹی کا تعاقب شروع کر دیا۔ انہوں نے نظر نہ آنے والے اغوا کنندگان پر اندھا دھند لاتعداد فائر کئے لیکن ان کا کوئی بھی نشانہ کارگر نہ ہو سکا کیونکہ اس وقت تک وہ لوگ گولیوں اور تیروں کی زد سے باہر پہنچ چکے تھے اور ان کا شجاعانہ چھاپہ کامیاب ہو گیا تھا۔

ایک گھنٹہ گزر جانے کے بعد بھی پاسے پرٹاوٹ اپنے شاندار کارنامے پر قہقہے لگا رہا تھا۔ سر فرانسیس نے اس بہادر سے ہاتھ ملایا لیکن اس کے آقا نے صرف اتنا ہی کہا "تم نے بہت اچھا کام کیا ہے ———" لیکن فلیس فوگ جیسے ٹھنڈے انسان کی زبان سے نکلے ہوئے محض یہ دو الفاظ ہی حد سے زیادہ تعریف کے برابر تھے۔ نوکر نے اس کامیابی کو مسٹر فوگ کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ بتاتے ہوئے کہا کہ ابتدا میں اس کے ذہن میں یہ خیال بہت غیر سنجیدہ طریقے پر آیا تھا لیکن چونکہ وہ کسی زمانے میں سرکس میں اور پیرس کے آگ بجھانے والے عملے میں کام کر چکا تھا اس لئے اسے عملی جامہ پہنانے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

نوجوان ہندوستانی خاتون اب تک ہوش میں نہ آئی تھی۔ اسے ایک گرم کمبل میں لپیٹ کر ہاتھی کی پشت پر لٹا دیا گیا۔ ان لوگوں کو پلاجی کے مندر سے روانہ ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت ہو چکا تھا۔ اس وقت وہ جنگل کے علاقے کو پار کر کے ایک وسیع میدان سے گزر رہے تھے، تیز رفتار ہاتھی کے مہاوت نے بیہوش خاتون کے حلق میں برانڈی کے چند قطرے ٹپکائے لیکن افیون اور بھنگ کے نشے آسانی سے اترنے والے نہیں تھے۔ سر فرانسیس ان ہندوستانی نشوں کی کیفیات سے واقف تھے۔ انہوں نے مسٹر فوگ کو بتایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ نشہ خود بخود اتر جائے گا اور اس کے بعد کے اثرات بھی قطعاً مضر نہ ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی بتایا کہ لیڈی ادا کا جلد از جلد

ہندوستان سے نکل جانا بے حد ضروری ہے کیونکہ راجہ کے وارث اسے ہلاک کرنے کی غرض سے ہندوستان کا کونا کونا چھان ڈالیں گے ـــــــ فلیس فوگ نے جنرل کو بتایا کہ وہ معاملے کی سنجیدگی کو سمجھ چکے ہیں اور اس سلسلے میں ہر ممکن اقدام کرنے کے لئے تیار ہیں۔

دس بجے کے قریب مہاوت نے بتایا کہ وہ الٰہ آباد کے مضافات میں داخل ہو چکے ہیں، الٰہ آباد پہنچنے پر وہ ٹھیک وقت پر کلکتے جانے والی ٹرین پر سوار ہو سکتے ہیں جہاں سے وہ ہانگ کانگ جانے والے اسٹیمر پر بروقت سوار ہو سکتے ہیں ـــــــ الٰہ آباد پہنچنے پر پاسے پر ٹاوٹ لیڈی ادا کے لئے مناسب لباس کی تلاش میں مختلف بازاروں میں دوڑتا پھرا اور بمشکل اسے ایک دوکان دستیاب ہو سکی جہاں سے اس نے جدید تراش کا خوبصورت انگریزی گاؤن، جوتیاں اور دوسرا لباس منہ مانگے داموں خریدا۔ اور پھر ایک فاتح کی طرح ریلوے اسٹیشن لوٹ آیا۔ اس دوران لیڈی ادا ہوش میں آ گئی تھیں اور ان کی آنکھوں میں مخصوص ہندوستانی حیا بھرپور زندگی کے ساتھ ایک بار پھر واپس لوٹ آئی تھی ـــــــ بندیل کھنڈ کے راجہ کی دلکش بیوہ بڑی روانی اور صحیح تلفظ کے ساتھ انگریزی میں گفتگو کر سکتی تھی۔ مہاوت کے اس بیان میں قطعاً مبالغہ آرائی نہ تھی کہ اسے بہت اعلیٰ تعلیم دلائی گئی تھی۔

اب کلکتے جانے والی ٹرین پر سوار ہونے کا وقت آ گیا تھا ـــــــ مسٹر فوگ نے مہاوت کو پوری اجرت کی ادائیگی کر دی، نہ ایک پینی زیادہ نہ ایک پینی کم، جس پر پاسے پر ٹاوٹ کو بہت مایوسی ہوئی۔ کیونکہ وہ پارسی کی خدمات کی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھا۔ پلاجی کے مندر پر اس نے اپنی جان کی بازی لگا کر ان لوگوں کا ساتھ دیا تھا۔ اب اگر آئندہ کبھی راجہ کے وارثین کو یہ علم ہو جائے کہ وہ بھی ستی کے اغوا کی سازش میں شریک تھا تو پھر ان لوگوں کے انتقام سے اسے دنیا کی کوئی طاقت نہ بچا سکے گی۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ فلیس فوگ نے بولنا شروع کیا وہ کہہ رہے تھے ـــــــ مہاوت تم نے انتہائی وفاداری اور تسلی بخش طریقے پر ہماری خدمت کی ہے۔ تم نے اپنی جان تک کی بازی لگا دی۔ میں تمہاری اجرت ادا کر چکا ہوں، لیکن ـــــــ تمہاری وفاداری کا انعام ابھی ہم پر واجب ہے۔ اس لئے کیا تم میری طرف سے اس ہاتھی کو قبول کرو گے ـــــــ اسے لے جاؤ۔ یہ اب تمہاری ملکیت ہے ـــــــ مہاوت کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں۔ اس کو لے جاؤ، مسٹر فوگ نے سنجیدگی سے کہا ـــــــ اور اس کے باوجود ہم ہمیشہ خود کو تمہارا مقروض سمجھتے رہیں گے ـــــــ پاسے پر ٹاوٹ کی مسرت کا ٹھکانا نہ تھا۔ اس نے ٹوکری سے ایک کیلا نکالا اور اچھلتا ہوا ہاتھی کے قریب گیا اور کیلا ہاتھی کی سونڈ میں تھما دیا۔ ہاتھی نے کیلا اپنے منہ میں ڈال کر نہایت نرمی سے فرانسیسی کو اپنی سونڈ میں لپیٹ کر سر سے اونچا اٹھا لیا۔ پاسے پر ٹاوٹ مطلق خائف ہوا۔ اس کے بعد ہاتھی نے اتنی ہی آہستگی سے اسے دوبارہ زمین پر کھڑا کر دیا ـــــــ اس کے تھوڑی دیر بعد پاسے پر ٹاوٹ، بریگیڈیر جنرل اور فلیس فوگ ریل کے سجے ہوئے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں سفر کر رہے تھے۔ اسی میں ایک بہترین سیٹ پر لیڈی ادا آرام سے لیٹی ہوئی تھیں۔ سر فرانسیس نے انہیں سارے واقعات سے آگاہ کر دیا تھا اور وہ اپنی جان بچانے والوں کا شکریہ نہ صرف زبان بلکہ اپنے آنسوؤں سے بھی ادا کر رہی تھیں۔ مسٹر فوگ کو خاتون کی ذہنی کیفیت کا اندازہ تھا۔ انہوں نے اسے اپنے ہمراہ ہانگ کانگ تک لے جانے کی پیش کش کی۔ جسے اس نے جذبۂ احسانمندی کے ساتھ منظور کر لیا۔ انہوں نے مسٹر فوگ کو بتایا کہ ہانگ کانگ میں ان کے ایک رشتہ دار رہتے ہیں جو اس شہر کے سب سے بڑے تاجر ہیں آئندہ وہ ان کے ساتھ ہی رہے گی ـــــــ دو گھنٹے بعد ٹرین بنارس پہنچ گئی۔ اس شہر کو ہندوستان میں مقدس مانا جاتا ہے۔ مسٹر فوگ نے اپنے ڈبے کی کھڑکی

سے اسٹیشن کے قریبی مکانات پر نظر ڈالی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ بنارس کے مکانات نہایت بھدے اور بھونڈے ہیں ——— بنارس میں ہی بریگیڈیر جنرل سر فرانسیس کو مسٹر فوگ سے جدا ہونا تھا۔ اس کا رسالہ شہر سے شمال کی جانب چند میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ اس نے مسٹر فوگ سے مصافحہ کر کے انہیں ان کے سفر کی کامیابی کی دعا دی۔ جواب میں انہوں نے بھی گرم جوشی سے جنرل سے ہاتھ ملایا۔ لیڈی آدا نے نہایت متشکرانہ انداز میں جنرل کو خدا حافظ کہتے ہوئے اپنی جان کی سلامتی میں جنرل کی خدمات کا اعتراف کیا اور کہا کہ وہ انہیں زندگی بھر نہیں بھولے گی ——— اس کے بعد جنرل فرانسیسی سے ہاتھ ملا کر ان لوگوں سے رخصت ہو گیا۔

تیز رفتار سے رات بھر چلنے کے بعد ٹرین صبح کے سات بجے کلکتے پہنچ گئی۔ ہانگ کانگ جانے والا اسٹیمر کلکتے سے دوپہر کو روانہ ہونے والا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ فلیس فوگ کے پاس اس وقت بھی بہت کے پانچ گھنٹے باقی تھے۔ ٹائم دیکھ کر مسٹر فوگ نے اطمینان کا اظہار کیا۔ وہ مقررہ وقت پر کلکتے پہنچ گئے تھے اور حالانکہ عدن سے بمبئی تک کے سفر میں بچائے ہوئے دو روز ضائع ہو گئے تھے لیکن انہیں اس کا مطلق ملال نہ تھا۔

ٹرین کلکتے کے اسٹیشن پر رک گئی، سب سے پہلے پاسے پرٹاؤٹ ڈبے سے باہر نکلا۔ اس کے بعد مسٹر فوگ جنہوں نے سہارا دے کر لیڈی آدا کو ڈبے سے باہر نکالا ان کا ارادہ اسٹیشن سے سیدھے بندرگاہ جا کر اسٹیمر پر سوار ہو جانے کا تھا کیونکہ لیڈی آدا کی سلامتی کے پیش نظر وہ ذرا سا وقت بھی شہر کی حدود میں گزارنا نہ چاہتے تھے ——— لیکن جس وقت وہ اسٹیشن کے بڑے ہال سے باہر نکل رہے تھے اچانک پولیس کا ایک سپاہی ان کی طرف بڑھا اور بولا

مسٹر فلیس فوگ؟

بے شک یہی میرا نام ہے۔

اور آپ کے ساتھ یہ شخص آپ کا ملازم ہے۔ پولیس مین نے پاسے پرٹاؤٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ بھی درست ہے، مسٹر فوگ نے جواب دیا۔

تو براہ مہربانی میرے ساتھ چلئے ——— مسٹر فوگ نے کسی قسم کے تعجب کا اظہار نہ کیا کیونکہ پولیس مین قانون کا محافظ تھا اور ایک انگریز ہونے کی حیثیت سے فلیس فوگ کے لئے قانون کا احترام ضروری تھا ——— فرانسیسی ہونے کی وجہ سے پاسے پرٹاؤٹ نے پولیس مین کے اس رویے کے خلاف احتجاج کرنا شروع کیا جس پر سپاہی نے تنبیہ کرنے کے انداز میں اسے اپنی چھڑی سے چھوا اور مسٹر فوگ نے اسے خاموش رہنے کا حکم دیا۔

کیا یہ خاتون ہمراہ چل سکتی ہیں؟ مسٹر فوگ نے سپاہی سے دریافت کیا۔

کوئی اعتراض نہیں، پولیس مین نے رعب سے کہا ——— اسٹیشن سے باہر نکل کر اس نے مسٹر فوگ، فرانسیسی اور لیڈی آدا کو چار پہیوں والی ایک گھوڑا گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا جو ان کے سوار ہوتے ہی چل کھڑی ہوئی۔ اور بیس منٹ کے سفر کے بعد ایک عمارت کے سامنے رکی، یہاں پولیس مین نے انہیں نیچے اتر آنے کا حکم دیا اور پھر انہیں اس عمارت کے ایک کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے میں ایک ہی دروازہ تھا جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں ——— یہ حوالات تھی۔

ساڑھے آٹھ بجے آپ کو مجسٹریٹ مسٹر اوبادیاہ کے سامنے پیش کیا جائے گا، یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکلا، اور دروازہ مقفل کر کے ایک طرف چل گیا ———

- ان کا جرم کیا تھا ——— عدالت میں ان مسافروں پر کیا بیتی۔
- کیا وہ ہانگ کانگ جانے والے اسٹیمر پر سوار ہو سکے۔
- جاسوس فکس کا ایک کارنامہ۔

(اس کی تفصیلات کیلئے اگلی سنسنی خیز قسط کا انتظار کریں)

"ایک ہی مملکت میں رہنے، ایک ہی جھنڈے کا احترام کرنے اور اس سے مکمل وفاداری رکھنے والے لوگوں میں کتنی ساری باتیں مشترک ہیں.... کہ اُن لوگوں کے لئے جو بھارت کو ایک ملک تسلیم کرتے ہیں، اقلیت یا اکثریت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سب کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ وہ ایک سی مراعات اور ایک سے برتاؤ کے مستحق ہیں.... ہمارے نظریئے کے مطابق مملکت سیکولر اور جمہوری ہونی چاہیئے، اور اس کی مختلف اکائیوں میں مکمل آہنگ لازمی ہے...."

مہاتما گاندھی

تیری آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

نذرِ عظمتِ غالب

(۱)

میرؔ جس دیوار کے سائے میں کرتا تھا بسر
عشق کو تیرے وہی دیوارِ زنداں ہے تو کیا
تیری آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں
تھا ازل سے جنکو حاصل ذوقِ دیدارِ جمال
چاک داماںئ گُل
زخمِ جگر
غم ہی جس کا بخیہ گر
چشمِ روزن سے گزرتا منظرِ تارِ نظر
جلوۂ دار و رسن
قیس کی فریاد اک بے ربطئ شورِ جنوں
"صبح کرنا شام کا"
آزارِ قلب کوہکن
"برقِ خرمن کا ہے میلا"
گرم خوں،
دہقاں کا دل
اور تندِ گیسو کی آرائش
حریفِ آرزو
اور ہجومِ اشک آنکھوں میں لئے تیرا شباب
بے خلل دخش ان مصائب میں رہا نغمہ طراز

(۲)

"جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں"
اور ترے سینے میں آہنگِ دلِ درد آشنا
جس کی لَے پر وجد میں دیر و حرم کی زندگی
"شاہد و مشہود"
محبوب و حبیب
دلفروزی وصل کی
فرقت کی ظلمت گستری
جام و مینا بجھ گئے روشن رہی بزمِ خیال
ہر حقیقت ہے عیاں رنگِ دلِ درد آشنا
ایک ذرہ ایک صحرا
قطرہ دجلہ
جزو میں کل
زندگی کا رمز — اسرارِ نہاں
"رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں"
ٹوٹا ہوا خوابِ ظفر
بے تاج شاہِ تاجور
[illegible] فرنگی فتنہ گر

(۳)

ہر سمت برپا شور و شر
حیران و ششدر شاعری
تہذیب نو کیا چیز ہے
"ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے"
"یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں"
کس لئے مٹ رہی ہے رسمِ کہن
"یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے"
حیران و ششدر شاعری
زد میں ہے "رخشِ عمر" بھی
گائے جاتے ہیں ترے نغمے سرِ دار و رسن
دِلّی دلِ ارضِ وطن
لرزش میں جوں برگِ سمن
شیدائیانِ حریت
باندھے ہوئے سر سے کفن
نذرِ وطن ہے جسم و جاں
کیا اُن کے نام، اُن کے نشاں
"سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں"

چوکی جس کو کہیں وہ مقتل ہے!

۱۸۵۷ کے المیہ پر

مرزا اسد اللہ خاں غالب کے نظم و نثر میں تاثرات

"اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور جانا تو بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پائے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست (یعنی مارشل لا) یازدہم مئی سے آج تک یعنی پنجشنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم"۔

(مکاتیب غالب)
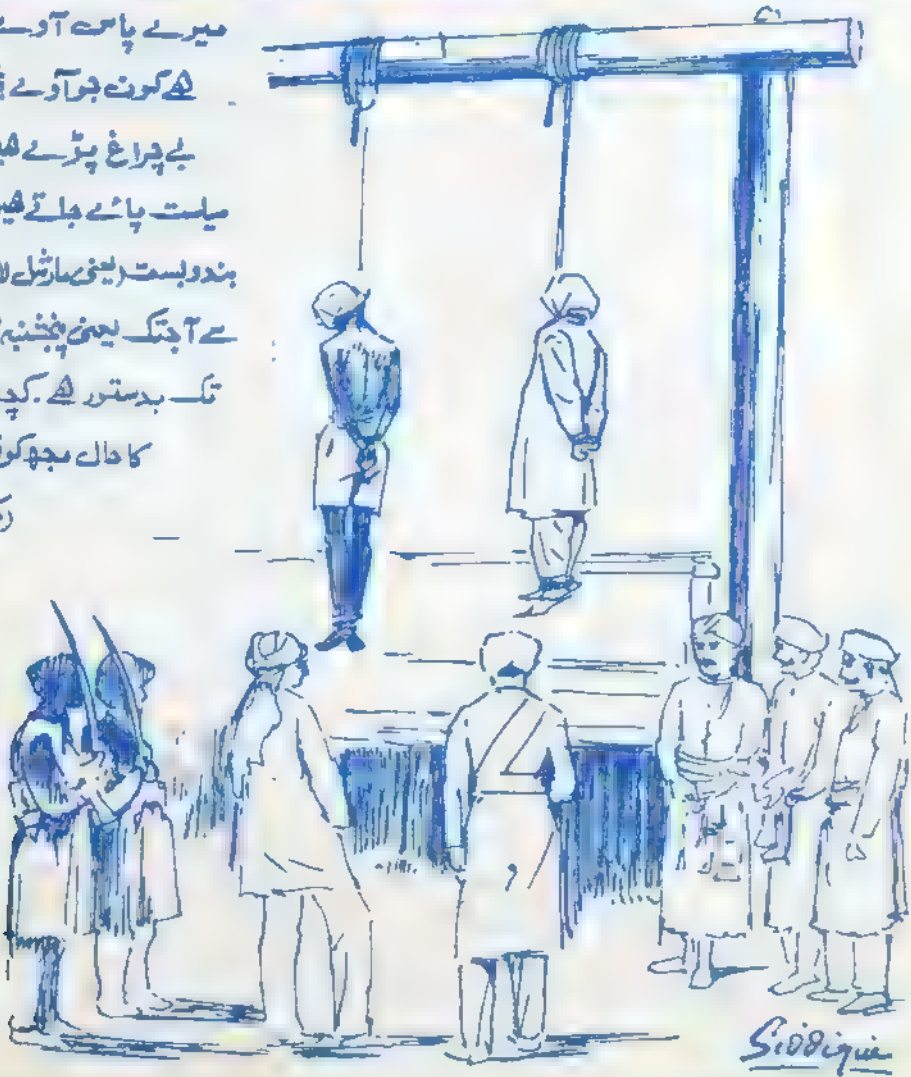
بسکہ فعّال ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرّہ ذرّۂ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ
سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم
ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے غالب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا
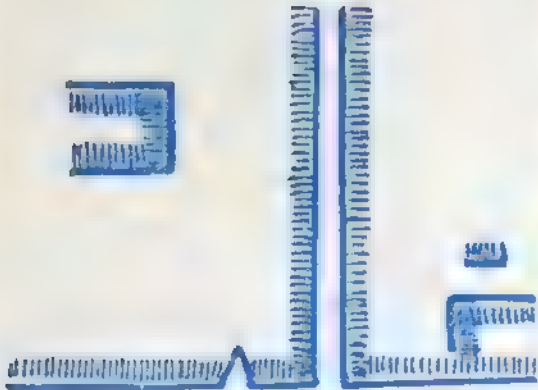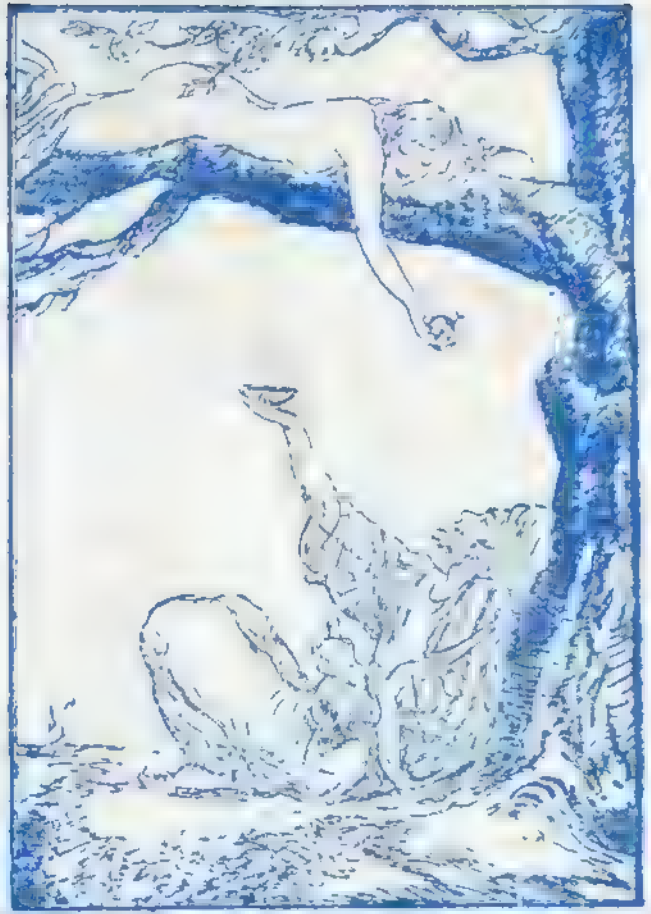
زکوٰۃ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا ⁂ چراغ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

میر تقی میر کے بعد غالباً مرزا غالب اردو کے سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی مخصوص ذہنیت کے متعلق اپنے کلام میں علی الاعلان ذکر کر دیا ہے۔ اس قسم کے کلام کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ غالب کی ذہنیت رشک کی طرف بہت زیادہ مائل تھی وہ رشک کو اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے اور نہ صرف اپنا بلکہ ان کا خیال تھا کہ ہر عاشق مزاج کے لئے رشک لازمی ہے۔ وہ خود اپنے ہی دل و دیدہ کو ایک دوسرے پر رشک کرنے پر مجبور کرتے ہیں وہ ایک پتھر سے بھی رشک کرتے ہیں اور اپنے قاصد سے بھی، ان کا رشک معمولی رقیبوں تک ہی محدود نہیں بلکہ اکثر دفعہ وہ خود اپنے آپ سے رشک کرنے لگتے ہیں۔ یہ جذبہ رشک اتنا ترقی کر جاتا ہے کہ اپنے معشوق سے بھی رشک کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ سے بھی۔

مرزا غالب کی ذہنیت میں رشک کو جو اہمیت حاصل ہوئی اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ان میں سے اصل اسباب وہی ہیں جن کا تعلق شاعر کی زندگی اور اس کی نوعیت سے ہے۔ شاعر کی زندگی اور اس کی شاعری میں چولی دامن کا سا تعلق ہوتا ہے اس کا ماحول اور بیرونی حالات جس قسم کے ہوتے ہیں اس کی شاعری بھی اس کے مطابق تخلیق حاصل کرتی ہے میر تقی میر کی زندگی کے حالات انہیں یاس و حرماں کی دلخراش صداؤں سے اپنے کلام کو بھرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ انشار کی جوانی کی جولانیاں جوانی کے کلام کو بڑھاپے کے درد بھرے کلام سے جدا کرتی ہیں۔ شیخ ابراہیم ذوق کی دربار میں رسائی اگر

قدر و منزلت خطاب، جاگیر، خلعت وغیرہ ان کے کلام پر نمایاں اثر رکھتے ہیں۔

مرزا غالب کی ذہنیت کو رشک کی طرف مائل کرنے والا سب سے پہلا سبب ان کی خاندانی عزت و ثروت ہے وہ ایک عالی مرتبت وذی وقعت خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے نانا، والد اور خسر سب بڑے رئیس تھے لیکن والد، چچا نانا اور خسر کی وفات کے بعد ان کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب آیا۔ گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا چند روز میں ختم ہو گیا۔ ادھر قرض خواہوں کے ہر دم تقاضے اور دوسرے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کو جنون ہو گیا۔ آخر پریشانیوں کی کوئی حد بھی ہے ؎

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ایسی بے کسی کی حالت میں جب غالب دیکھتے ہوں گے کہ بے ہنر اور کم رتبہ لوگ عیش و عشرت میں بسر کر رہے ہیں اور نا اہلوں کی قدر کی جا رہی ہے تو ان کے دل پر کیا گزرتی ہوگی

محبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو　　دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

یہ ہے وہ زبردست رجحان جو غالب کے خاندانی حالات کے باعث ان کی ذہنیت کو متاثر کر رہا تھا اور جس کی وجہ سے وہ ہر جگہ شک و شبہ اور ہر وقت رشک کی طرف مائل ہو ہو جاتے ہیں۔ دوسرا سبب جس نے ان کی ذہنیت کو رشک کی طرف متوجہ کر دیا، یہ ہے کہ ان کی شاعری کی، ان کی زندگی میں اور بالخصوص ان کی عمر کے ابتدائی حصہ میں کماحقہ، قدر نہیں کی گئی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ لوگ میری اصلی اسپرٹ کو سمجھنے سے قاصر ہیں تو بجائے اس کے کہ آسان تر اور صاف زبان میں لکھنے کی کوشش کرتے، انہوں نے دوسروں پر ہی کم فہمی کا الزام رکھا اور اس کو اس طرح نبھایا ؎

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

ان کو خود اپنے کلام کے مشکل ہونے کا اقرار تھا چنانچہ لکھتے ہیں ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل :: سن سن کے اسے سخنوران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش :: گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

تاہم اپنے کو اچھا شاعر سمجھتے ہیں ؎

ہو گا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

مشاعروں میں معمولی شاعروں کو داد ملتی اور غالب پر الٹی طعن و تشنیع کی جاتی تھی لوگ اپنی غزلوں میں ایک دو شعر ان پر بھی لکھ لاتے تھے۔ آخر کار غالب مجبور ہو کر کہتے ہیں ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

تاہم وہ ایک انسان تھے اور اسی لئے طعن و تشنیع سے متاثر ہوئے، خود لکھتے ہیں ؎

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

غرض اکثر جگہ وہ اپنے ہمعصر کا دفتر کھولتے نظر آتے

ہیں اور یہ ان کے رشک کی ابتدا ہے۔

رشک کے رنگ کو پختگی دینے والی شیخ ابراہیم ذوق کی قدر و منزلت تھی۔ ذوق ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے خسر نواب الٰہی بخش خاں کے دست کرم کے ممنون منت تھے اور جن کی شاعری نے انہیں کی صحبت میں نشو و نما پائی تھی اسی ذوق کو غالب اپنے سے زیادہ رتبہ حاصل کرتے ہوئے دیکھتے تھے۔

غالب اپنے خارجی اور بیرونی حالات سے مجبور تھے اور وہ رشک کی طرف بہت تیزی کے ساتھ گامزن ہوتے رہے اور ساتھ ساتھ زمانہ کی کینہ پروری پر افسوس بھی کرتے رہے ؎

بر روئے شش جہت در آئینہ باز ہے
یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

چوتھا اور سب سے بڑا سبب جس کے باعث غالب میں رشک کو مستقل حیثیت حاصل ہو گئی تھی ان کی خودداری عالی ہمتی اور آزادہ روی ہے۔ یہ تینوں رشک کی طرف فطرتاً رہبری کرتے ہیں۔ ان کی خودداری ملاحظہ ہو ؎

دیوار بار منت مزدور سے ہے خم ؛ اے خانماں خراب احساں اٹھائیے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے
سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال
کہ یہ کہے کہ سر رہگزر ہے کیا کہئے
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا
درد منت کش دوا نہ ہوا ؛ میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا
عیادت سے اسد میں بیشتر بیمار رہتا ہوں
سبب ہے ناخن دخل عزیزاں سینہ خستن کا

غالب حد درجہ عالی ہمت اور آزاد تھے اس خیال سے کہ عام لوگ ان کی برابری نہ کر سکیں وہ ہر چیز میں حد سے متجاوز ہو جاتے ہیں اور یہی وہ رجحان ہے جو ترقی کے بعد ان کے پاس رشک کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ نہ صرف

ہنسی خوشی اور مسرت و اطمینان کے معاملات میں دوسروں سے بڑھا ہوا رہنا چاہتے ہیں اور ان کی کسی قسم کی دخل اندازی کو پسند نہیں کرتے بلکہ رنج وغم اور درد و مصیبت میں بھی ان سے تفوق حاصل کرنے کے خواہش مند رہتے ہیں یہی وہ حد ہے جہاں غالب کی ذہنیت عام ذہنیتوں سے ہٹ کر رشک کی وجہ سے ایک خاص امتیاز اور قابل رشک حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔

غالب کی بلند ہمتی اور خود اعتمادی اور دوسروں پر خود کو ترجیح دینے کے جذبہ کا ثبوت ملاحظہ ہو ؎

اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

ہم نے سوز خم جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی
گل ہوا ہے ایک زخم سینہ پر خواہان داد

سو بار بند عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

درخور قہر و غضب جب کوئی ہمسا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہمسا کوئی پیدا نہ ہوا

ان کی خود اعتمادی اور دوسروں پر خود کو ترجیح دینے کا ثبوت مکمل ہے۔

تذکرہ بالا تمام مرحلوں سے گزر جانے کے بعد غالب کی ذہنیت کا منزل رشک میں داخل ہونا ایک یقینی امر تھا چنانچہ اب ان کے دماغ پر رشک کے گھٹا ٹوپ بادل چھا جاتے ہیں اور پھر وہ جس طرف نگاہیں ڈالتے ہیں انکی نظریں رشک کی عینک سے نکل کر جاتی ہیں ان کے وہ کثیر التعداد اشعار جن میں رشک چھپائے نہیں چھپتا، ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے رشک نے ایک خاص طور پر تدریجی ترقی حاصل کی ہے ان کا یہ رشک شاعروں کے عام رقیب روسیاہ کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ اس رقیب کے ساتھ جوان کے معشوق کو ان سے چھین لینے کے لئے ان کی اذیت میں سرگرم ہے، وہ ایک کامل عاشق بن کر اس شخص کی نیند، دماغ اور راتوں پر رشک کرتے ہیں جس کے بازو پر معشوق کی زلفیں پریشان ہو گئی ہوں وغیرہ ؎

نیند اس کی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

خوش حال اس حریف سیہ مست کا کہ جو
رکھتا ہے مثل سایۂ گل سر بپائے گل
بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوار یار میں

فیروز دہلوی اور غالب کی تصویر

فیروز محمد خاں نام آبا و اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا ان کے والد فتح محمد خاں فیروز پور پنجاب سے آکر دہلی میں آباد ہو گئے تھے سنہ ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے ہندوستان کے مشہور و معروف آرٹسٹ ہیں ــــ زیر نظر "غالب نمبر" کی اکثر تصاویر انہیں کے موئے قلم کا نتیجہ ہیں۔ فیروز صاحب کا کہنا ہے کہ میں نے "ھما" کے "غالب نمبر" کے لئے جو تصویر تیار کی ہے وہی صحیح اور قابل اعتماد تصویر ہے یہ تصویر انہوں نے غالب کے ایک ایسے فوٹو کی مدد سے بنائی ہے جو انھیں سنہ ۱۹۴۴ء میں ایک انگریز کیپٹن ڈریک پبلک ریلیشن ڈپارٹمنٹ ڈی آر پی سے حاصل ہوئی تھی اس فوٹو کا اصل نگیٹو فیروز صاحب کے پاس محفوظ ہے۔

فرمانروائے کشورِ ہندوستان سے ہے

گوہر کو عقد گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

قاصد کو اپنے ہات سے گردن نہ ماریے
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

بہ امید نگاہ خاص ہوں محمل کش حسرت
مبادا ہو عناں گیر تغافل لطف عام اس کا

معشوق کے ہجر میں رقیب کی مزاج پرسی پر غالب کا رشک جو گلفشانیاں کرتا ہے اسکا مرقع ملاحظہ ہو ؎

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اس کے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوار دوست

تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے پیام وعدۂ دیدار دوست

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہ ضعفِ دماغ
سر کرے ہے وہ حدیث زلفِ عنبر بار دوست

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیان شوخیِ گفتار دوست

غالب کا ذات خود سے رشک دیکھئے ؎

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

ہمارا خیال تھا کہ غالب کی ذہنیت کو خود غالب سے رشک کرنے کے بعد سیری ہو جائے گی لیکن شدت تشنگی کی کوئی حد بھی ہے کہ وہ اس سلسلہ کو وہیں ختم کر دینا نہیں چاہتی بلکہ غالب کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ خدا سے بھی رشک کرنے لگیں چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

قیامت ہے کہ ہووے ... کا ہم سفر غالب
افر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے